حیاتِ اقبال

طاہر تونسوی

مکتبہ عالیہ ۔ لاہور

حیاتِ اقبال

مرتب

طاہر تونسوی

مکتبۂ عالیہ — ایبک روڈ — لاہور

حقوق تدوین و اشاعت بحق ناشر محفوظ

سالِ اقبال: ۱۹۷۷ء

حیاتِ اقبال

مرتّب : ـــــــــ طاہر تونسوی

ناشر : ـــــــــ الطاف حسین

مطبع : ـــــــــ ندرت پریس لاہور

قیمت

-/۲۱

ـــ یکے از مطبوعات ـــ

مکتبہ عالیہ ـــ ایبک روڈ (انار کلی) لاہور

سعیدہ شیریں

کے نام

مندرجات

تعارف — سلیم اختر

نذرِ اقبال — مرتب

حالات:

۱۔ علامہ اقبال — منشی محمد دین فوق

۲۔ ڈاکٹر اقبال — میاں علی بخش / چراغ حسن حسرت

۳۔ اقبال کا اسلوب زندگی — عبدالمجید سالک

۴۔ علامہ اقبال کا گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلق۔ — ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

۵۔ علامہ اقبال کی معاشرتی زندگی کے خدوخال — مس ڈورالینڈ / رفیق ڈوگر

۶۔ اقبال کی تدفین — خواجہ عبدالرحیم

نفسیات:

۷۔ اقبال — عطیہ بیگم

۸۔ حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور — پروفیسر محمد عثمان

۹ - اقبال کا نفسیاتی مطالعہ — سلیم اختر

۱۰ - بے داغ ہے مانندِ سحر اُسکی جوانی — خالد نظیر صوفی

تاثرات

۱۱ - کیفِ غم — سر عبد القادر

۱۲ - علاّمہ اقبال — رشید احمد صدیقی

۱۳ - دو ملاقاتیں — سید عابد علی عابد

۱۴ - حضرت علاّمہ اقبال — ایم اسلم

۱۵ - ابو الاثر اقبال کے حضور میں — مرزا محمد منوّر

۱۶ - علاّمہ اقبال سے پہلی اور آخری ملاقات — احمد ندیم قاسمی

۱۷ - اقبال ایک باپ کی حیثیت سے — ڈاکٹر جاوید اقبال

۱۸ - علاّمہ اقبال سے تین ادھوری ملاقاتیں — میرزا ادیب

حیاتِ اقبال کا اشاریہ — مرتب

تعارف

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ علامہ اقبال قومی شاعر ہوں۔ حکیم الاُمّت ہوں اور نظریۂ پاکستان کے خالق ہوں۔ لیکن اس کے باوجود اُن کی سوانح عمریوں کے لحاظ سے اقبالیات کا دامن خالی خالی سا نظر آئے۔ جو چند کتابیں ملتی بھی ہیں اُن میں سے بشتر میں اقبال کی زندگی کے کوائف تو جمع کر دیئے گئے لیکن اصل اقبال کیا تھا؟ وہ کیسا انسان تھا؟ بحیثیت ایک مرد اُس کی پسند و ناپسند کیا تھی؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جذبات و احساسات میں کس نہج کا حامل تھا۔ یہ اور اسی نوع کی دیگر نفسیاتی اہمیت کی باتوں سے اقبال کی سوانح عمریوں کا دامن تہی نظر آتا ہے۔ ضرورت ایک ایسی سوانح عمری کی رہی ہے جو اقبال کو ایک عظیم مفکّر کے ساتھ ساتھ ایک انسان کے رُوپ میں بھی پیش کر سکے۔ طاہر تونسوی کی مرتبہ "حیاتِ اقبال" بلاشُبہ اس خلا کو بڑی عمدگی سے پُر کرے گی۔

طاہر تونسوی ایک صاحب نظر ادیب اور بالغ نظر نقاد ہیں۔ اُنہوں نے اپنی محبت، خلوص اور لگن سے ادبی حلقوں کو جس طرح چونکایا۔ وہ خود اپنی جگہ ایک دلچسپ داستان ہے۔ طاہر تونسوی نے "حیاتِ اقبال" مرتب کرتے وقت ایسے معیاری مقالات کا کھوج لگایا جو پُرانے ادبی پرچوں کی فائلوں میں گم تھے۔ اُنہوں نے بڑی محنت سے اس مواد کو ترتیب دے کر حیاتِ اقبالؒ کے ایسے گوشے سامنے لانے کی کوشش کی ہے جن سے اقبال کے عام قارئین بالعموم بے خبر ہیں۔

"حیاتِ اقبال" کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حالات ۔ نفسیات ۔ تأثرات ۔ حالات میں علامہ اقبال کے بارے میں جو مقالات شامل کئے گئے ہیں۔ اُن سے اقبال کی زندگی کے اہم واقعات پر روشنی پڑتی ہے جب کہ تأثرات کی ذیل میں آنے والے مقالات اقبال کے مختلف ملاقاتیوں نے تحریر کئے ہیں جس سے اقبال کی فکر اور بصیرت کے کئی پہلو بہ اندازِ نو اجاگر ہوتے ہیں۔ میری دانست میں اس کتاب کا اہم ترین حصّہ نفسیات پر مبنی مقالات کا ہے کیونکہ یہی وہ مقالات ہیں جن کے مطالعے سے اقبال کی جذباتی زندگی کی اُن کیفیات کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ جن کے پس پردہ لاشعوری عوامل کے طویل سلسلے ملتے ہیں۔

یہ سالِ اقبال ہے۔

مجھے توقع ہے کہ اس سال اقبال پر طبع ہونے والی کتابوں میں "حیاتِ اقبال" ایک گرانقدر اضافہ تصوّر کی جاتے گی۔ اسلئے کہ یہ اقبال کی ایک اچھی سوانح عمری کی کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ طاہر تونسوی نے یہ کتاب مرتّب کر کے اقبال شناسوں کے حلقے میں اپنے لئے ایک مقام بنا لیا ہے۔

سلیم اختر

نذرِ اقبال

علامہ اقبال متنوع اور پہلو دار شخصیت کے حامل تھے۔ اُن کی بھرپور شخصیت کی کئی جہتیں اور پرتیں تھیں۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے "اقبال نامے" کے دیباچے میں تحریر کیا تھا "علامہ اقبالؒ کی زندگی میں اُتار چڑھاؤ بہت کم نظر آتے ہیں۔ نہ وہ کسی ملک کے فرمانروا تھے نہ کوئی اعلیٰ سرکاری عہدیدار۔ سیاسیات سے بھی اُنہیں برائے نام سا تعلق تھا۔ سیاسی ہنگاموں میں حصّہ لینا درکنار وہ کئی کئی دن گھر سے باہر قدم نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اُنہوں نے زندگی کے متعلق ہندوستان کے مسلمانوں کا زاویۂ نگاہ بدلنے میں بڑا حصّہ لیا۔ اور اُن کا یہ کارنامہ عہدِ حاضر کی بڑی بڑی سیاسی اور علمی فتح مندیوں پر بھاری ہے۔ اُن کی شاعری کی طرح اُن کی گفتگو بھی مؤثر ہوا کرتی تھی۔ اُن معلومات کا یہ حال تھا کہ جس موضوع کو چھیڑتے تھے۔ پہروں اُس کے متعلق باتیں کرتے چلے جاتے تھے اور اُن کی گفتگو سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیالات کا ایک سیلاب ہے جو برابر اُمڈا چلا آتا ہے۔ اور کہیں رکنے کا نام نہیں لیتا۔ وہ ہر شخص کی استعداد اور اُس کے خاص مذاق کے مُطابق اُس سے باتیں کرتے تھے۔ فلسفیوں کے ساتھ فلسفہ کے دقیق مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں۔ اربابِ سیاست سے سیاسی مباحث پر گفتگو رہتی تھی۔ کوئی صوفی

یا مُلّا اُن کے ہاں جانکلتا تو قرآن و حدیث، فقہ و تفسیر، علمِ کلام اور تصوّف کے ذکر اذکار چھڑ جاتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر علاّمہ مرحوم کے ملفوظات جمع کر کے شائع کر دیے جائیں تو لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اقبالؒ جسے دُنیا صرف شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ کتنا جامع حیثیات شخص تھا۔"

حیرت کی بات یہ ہے کہ علاّمہ اقبال کی کوئی ایسی سوانح عمری نہیں جس سے اُن کی بھرپور شخصیت اُبھر کر سامنے آسکے۔ یہ کام اُن لوگوں کی ذمّہ داری بنتا ہے جو علاّمہ اقبالؒ کے قریب رہے ہیں۔ اور اُن کی زندگی کے نشیب و فراز سے واقف ہیں۔ مجھ جیسا نوجوان آدمی جو صرف علاّمہ اقبالؒ کا عقیدتمند ہے اُس کا یہ منصب نہیں کہ وہ علاّمہ اقبالؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر قلم اُٹھائے۔ وہ تو صرف یہ کر سکتا ہے کہ ایسے مضامین کو تلاش کرے جن میں علاّمہ اقبالؒ کی شخصیت کا جائزہ لیا گیا ہو اور پھر اُنہیں کتابی شکل میں ترتیب دے تاکہ علاّمہ اقبالؒ کی سوانح عمری کی کمی کو کسی حد تک پُورا کیا جا سکے۔ مَیں نے بھی اسی بات پر عمل کیا ہے۔ پُرانے رسائل، اخبارات اور مختلف کُتب کی ورق گردانی کر کے ایسے نئے اور پُرانے مقالات مُنتخب کئے ہیں جو علاّمہ اقبالؒ کی ایک اچھی بھلی سوانح عمری کے تناظر میں اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس لئے میں نے اس کتاب کا نام "حیاتِ اقبال" رکھا ہے۔ اس کے تین حِصّے ہیں۔ حالات ــــ نفسیات ــــ تاثرات۔

حالات کے حِصّے میں ۶ مضامین شامل ہیں جن میں علاّمہ اقبالؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے۔

مُنشی محمد دین فوقؔ نے "ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال" میں علاّمہ اقبالؒ کی مختصر سوانح حیات تحریر کی ہے جس میں علاّمہ اقبالؒ کی زندگی کے حالات (بچپن سے لے کر آخری ایام تک) لکھے ہیں اور اس سلسلے کے دلچسپ واقعات پہلی بار سامنے آتے ہیں۔ چراغ حسن حسرتؔ نے "ڈاکٹر اقبال" میں علاّمہ اقبالؒ کے خادمِ خاص میاں علی بخش کے خیالات قلمبند کئے ہیں۔ میاں علی بخش کے حوالے سے علاّمہ اقبالؒ کی روزمرّہ زندگی، عادات و خصائل اور نجی رویّوں کے سارے

خدوخال اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ اور بعض نئی کتابیں بھی ہیں جن کا اندازہ عام مُلاقاتی کو نہیں ہو سکتا۔ عبدالمجید سالک نے "اقبال کا اسلوبِ زندگی" میں علاّمہ اقبال کی زندگی کے روزمرہ معمولات کے علاوہ اُن کی مجالس کے تذکروں پر قلم اُٹھایا ہے اور علاّمہ اقبال کی محفل میں بیٹھنے والے حضرات کے حوالے سے تفصیلات بیان کی ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے "علاّمہ اقبال کا گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلق" میں زمانۂ طالب علمی کے اقبال اور پروفیسر اقبال کے گورنمنٹ کالج لاہور سے روابط کے بارے میں لکھا ہے۔ بطور اُستاد اُن کے بُنیادی رویّوں پر بھی اس مضمون میں خاصی روشنی ڈالی گئی ہے۔

مس ڈورالینٹ علاّمہ اقبال کے بچّوں کی اتالیق تھیں۔ اُنہوں نے "علاّمہ اقبال کی معاشرتی زندگی کے خدوخال" میں علاّمہ اقبال کی گھریلو اور معاشرتی زندگی کی تفصیلات سے پردہ اُٹھایا ہے یہ مضمون انٹرویو کی صورت میں ہے جو مس ڈورالینٹ سے رفیق ڈوگر نے لیا تھا۔ اس سے علاّمہ اقبال کی زندگی کے بارے میں نئی باتوں کا علم ہوتا ہے۔

خواجہ عبدالرحیم کا مضمون "اقبال کی تدفین" اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں تدفینِ اقبال کے سلسلے میں جگہ کی فراہمی اور پھر مزار کی تعمیر میں جو مشکلات پیش آئیں اور اس بارے میں جو کوششیں کی گئیں اُن کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔

دُوسرا حصّہ نفسیات پر مشتمل ہے۔ اس حصّے میں چار مقالات شامل ہیں جن میں علاّمہ اقبالؒ کی جذباتی اور رُومانی زندگی کا نفسیاتی حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے اور علاّمہ اقبال کی شخصیت کے بعض پہلو اس نئے حوالے سے پہلی بار سامنے آتے ہیں۔

عطیہ بیگم نے اپنی انگریزی کتاب "اقبال" میں اقبال کی شخصیت کے وہ پہلو پہلی مرتبہ بے نقاب کیے جن سے قیامِ یورپ اور زمانۂ طالب علمی کا اقبال ہمارے سامنے ایک نئے رُوپ میں آتا ہے۔ یہ مضمون اُس زمانے کی زندگی سے پردے اُٹھاتا ہے جب علاّمہ اقبال جرمنی میں تھے۔

پروفیسر محمد عثمان نے "حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور" میں عطیہ بیگم کی محولہ بالا کتاب میں درج خطوط کی روشنی میں اقبال کی شخصیت کا ایک نئے تناظر میں مطالعہ کیا ہے۔

سلیم اختر کا مضمون "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" نیا مضمون ہے۔ اس میں اُنہوں نے اقبال کا بطور ایک مردِ نفسیاتی مطالعہ کیا ہے اور اُن ناآسودگیوں کو تلاش کیا ہے جن کی وجہ سے اقبال کی نجی اور گھریلو زندگی کافی پریشان کُن رہی۔ اس حوالے سے اُنہوں نے اقبال کی جذباتی زندگی کے مختلف ادوار کا بڑی جرأت اور بے باکی سے تجزیہ کیا ہے اور اُن نفسیاتی اُلجھنوں کا کھوج لگایا ہے جو علامہ اقبال کو درپیش تھیں۔

علامہ اقبال کے ایک رشتہ دار خالد نظیر صوفی نے "بے داغ ہے مانندِ سحر اُس کی جوانی" میں اقبال کے بعض معترضین کا جواب دیتے ہوئے اُن کے کردار کی پختگی اور استقامت ثابت کی ہے۔

تیسرا حصّہ تاثرات پر مشتمل ہے۔ اس حصّے میں نو مضامین ہیں۔ جن میں علامہ اقبال کے ملاقاتیوں نے اُن مجالس اور محافل کی کہانیاں بیان کی ہیں جن میں وہ شریک رہے ہیں۔ اس طرح علامہ اقبال کے خارجی رویوں اور نظریوں کے بارے میں پتہ چل جاتا ہے۔

سر عبدالقادر نے "کیفِ غم" میں غم کی کیفیات کے تناظر میں علامہ اقبالؒ کے ذاتی خصائل کا جائزہ لیا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے "سر اقبال مرحوم" میں علامہ اقبالؒ سے اپنی ملاقاتوں کا حسین پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ اس طرح علامہ اقبالؒ کی شخصیت کا بھرپور خاکہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

سیدہ عابدہ علی عابدہ نے "دو ملاقاتیں" میں اور ایم اسلم نے "حضرت علامہ اقبال" میں اُن باتوں اور ملاقاتوں کو یاد کیا ہے جو اب صرف حسین یادیں ہیں۔

احمد ندیم قاسمی "علامہ اقبال سے پہلی اور آخری ملاقات" میں اُن یادوں کو ضبطِ تحریر میں لائے ہیں جو اُن کی زندگی کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے "اقبال ایک باپ کی حیثیت سے" میں علامہ اقبال کے ایک باپ کی حیثیت سے رویوں کو اُجاگر کیا ہے اور اپنے بچپن و جوانی کے واقعات تحریر کئے ہیں۔ اس سے

جہاں بطور ایک باپ کے علامہ اقبالؔ کی شخصیت کا رنگ جھلکتا ہے وہاں یہ بات بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ علامہ اقبالؔ گھریلو زندگی میں کن رویوں کے مالک تھے اور پھر اس حوالے سے اُن کے عادات و خصائل کیا تھے۔

آخر میں حیاتِ اقبال کا اشاریہ بھی دیا گیا ہے جس سے علامہ اقبالؔ کی زندگی کی واضح جھلک سامنے آتی ہے۔

ان تمام مضامین و مقالات کے پس منظر میں "حیاتِ اقبال" ایک اچھی خاصی سوانح عمری بن جاتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ کتاب اُس خلا کو یقینی طور پر پُر کر دے گی جو سوانح عمریوں کے اعتبار سے اقبالیات میں ہے۔ میں اُن مقالہ نگاروں کا شکر گزار ہوں جن کے مقالے مَیں نے اس کتاب میں شامل کئے ہیں۔

میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور پروفیسر سلیم اختر کا ممنون ہوں کہ اُنہوں نے نہ صرف مضامین کے بارے میں مفید مشوروں سے نوازا بلکہ میری اس کاوش اور علامہ اقبال سے عقیدت کے بارے میں فلیپ اور تعارف بھی تحریر کیا۔ میں اپنے چھوٹے بھائی خلیل الرحمان اطہر کا بھی شکر گزار ہوں کہ اُس نے مضامین نقل کرنے میں میری مدد کی۔ مجھے اُمید ہے کہ میری یہ کوشش اقبال شناسوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

طاہر تونسوی

شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لاہور۔

منشی محمد دین فوق

علامہ اقبال

خاندان کا مشرف بہ اسلام ہونا

شیخ صاحب کو کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق ہے۔ جس کی ایک شاخ اب تک کشمیر میں موجود ہے۔ شیخ صاحب کے جدِ اعلیٰ قریباً سوا دو سو سال ہوئے کہ مسلمان ہو گئے تھے۔ گوت ان کی "سپرد" ہے۔ ان کے بزرگوں کا اسلام پر ایمان لانا ایک ولی کے ساتھ عقیدت کی وجہ سے ہوا۔ اور وہ حسنِ عقیدت اس وقت تک اس خاندان میں موجود ہے۔

ولادت اور تعلیمی زندگی

آپ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر پورے ۵۶ سال کی ہے۔ ابتدا میں اکثر مسلمان بچوں کی طرح کچھ دنوں آپ نے بھی مکتب کی ہوا کھائی۔ پھر مدرسے میں داخل ہوئے اور پانچویں جماعت کا امتحان وظیفہ لے کر پاس کیا۔ مڈل کے درجوں میں بھی نہ صرف تعریف کے ساتھ کامیاب ہوتے رہے۔ بلکہ مڈل کے آخری درجے میں بھی وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد باب العلم شروع ہوتا ہے۔ یعنی انٹرنس کلاس جو کالج کا دروازہ ہے۔ دروازے کو کھولنا ہمت و استقلال اور فتح و شکست کے بہترین آثار کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اور خوشی کی بات ہے کہ اقبال جب کالج کا دروازہ کھول کر کالج کے مدارج میں

داخل ہوئے یعنی جب انہوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ تو پرائمری اور مڈل کی طرح یہاں بھی سرکاری وظیفہ لے کر کامیاب ہوئے۔ آپ کی طبیعت ابتداء ہی میں ذکاوت و ذہانت کا ایک نمونہ تھی۔ جب آپ ایف اے اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے تو مولانا سید میر حسن[1] جیسے قابل سخن شناس عالم متبحر اور اُستادِ شفیق کی توجہ خاص اور فیضانِ صحبت و تربیت نے ان جوہروں کو جلا دینے میں جو قدرت نے آپ کی طبیعت میں امانت رکھے تھے۔ کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ سیالکوٹ کالج سے فارغ ہو کر آپ لاہور گورنمنٹ کالج کی بی۔اے کلاس میں داخل ہوئے۔ طبیعت چونکہ فلسفیانہ پائی تھی، اس لئے بی۔ اے کے امتحان میں فلسفہ کا مضمون لے کر نہ صرف پاس ہی ہوئے، بلکہ انگریزی اور عربی میں باتعریف کامیاب رہنے کے لئے دو طلائی تمغے اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔ انہیں دنوں مسٹر ڈبلیو آرنلڈ صاحب علی گڑھ کالج سے گورنمنٹ کالج میں چلے آئے تھے۔ فلسفہ دانی میں آرنلڈ صاحب کی شہرت عالمگیر ہے۔ اس شہرت نے بے اختیار اقبال کو اپنی طرف کھینچا۔ آرنلڈ صاحب بھی اس ہونہار طالب علم کی تیز فہمی اور اُس کے فلسفیانہ دماغ کے معترف ہو گئے۔ اور اقبال کو شاگردی کے مراتب سے گزار کر رفتہ رفتہ دوستی کے اعزاز تک پہنچا دیا۔ آرنلڈ صاحب اقبال کی تحقیقات علمی اور اُس کی فلسفیانہ طبیعت کے متعلق ایک دفعہ فرماتے تھے۔ کہ ایسا شاگرد استاد کو محقق بنا دیتا ہے۔ اور محقق کو محقق تر۔

غرض یونیورسٹی کی آخری تعلیم (امتحان ایم اے) کا مرحلہ بھی طے کیا۔ اور ایک تمغہ بھی حاصل کیا۔

سلسلۂ ملازمت

ایم۔ اے پاس ہونے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ فلسفہ اور سیاست مدن کے مضامین پر آپ لکچر دینے کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ پھر گورنمنٹ کالج میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ افسرانِ کالج اور عہدہ دارانِ تعلیم کی رائے ان کی خدمات اور ان کی لیاقت علمی کے متعلق بہت اچھی تھی۔ علمی مشاغل آپ کی زندگی کا جزو ضروری تھے۔ اکثر طالب علموں کو آپ

---

[1] شمس العلما مولانا میر حسن صاحب ۱۹۲۹ء میں انتقال فرما گئے۔

اپنے مکان پر بھی اوقات کالج کے بعد پڑھایا کرتے تھے۔ جب تک آپ طالب علم رہے۔ نیک سعادتمند اور ذہین و محنتی رہے۔ اور جب استاد کی حیثیت میں آئے تو ایک شفیق اور بے تکلف اور مہربان اُستاد ثابت ہوئے۔ اسی زمانہ میں سیاست مدن پر ایک کتاب اردو زبان میں بنام علم الاقتصاد لکھی۔

سفرِ ولایت

تحقیقات علمی کا شوق جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا علاج یہاں بھی کثرت مطالعہ کے ذریعہ ہوتا رہا۔ لیکن ؎

مریضِ علم پر رحمت خُدا کی　　　　مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آخر فلسفہ قانون اور تحقیقات علم کے لیے ولایت کا سفر اختیار کیا۔ اور محض علم اور صرف علم کی خاطر ہی نہ صرف وطن اور دوست واحباب سے بلکہ والدین۔ بچوں اور دیگر اعزہ سے ہزارہا میل کی مفارقت اختیار کی۔ اور دنوں اور مہینوں کے لیے نہیں بلکہ کامل تین سال تک وہاں رہے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے بذریعہ تحقیقات علمی فلسفہ اخلاق کی ڈگری حاصل کی۔ پھر جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی (پی۔ ایچ۔ ڈی) کی فرسٹ کلاس ڈگری ایک کتاب بنام فلسفۂ ایران لکھنے سے حاصل کی۔ یہ کتاب جو لندن میں شائع ہو چکی ہے، انگریزی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ولایت کے بڑے بڑے اہل الرائے نے انگلستان کے مشہور پرچوں میں اس پر نہایت عمدہ ریویوز لکھے۔ فضلائے یورپ نے اس کتاب کو نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے، افسوس ہے کہ ایسی لاجواب تصنیف ہنوز اردو زبان میں ترجمہ نہیں ہوئی۔ جرمنی سے واپس آنے کے بعد لندن کے سکول آف پولیٹکل سائنس میں داخل ہوئے۔ اور وہاں کے پروفیسروں اور عالموں اور بڑے بڑے سائنسدانوں اور انگلستان کے دیگر فضلاء حکماء، علماء اور مدبرین سے استفادہ حاصل کیا۔ اور بیرسٹری کا امتحان بھی کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔

انگلینڈ میں بطور لکچرار و پروفیسر

بہت کم لوگ ایسے ہیں جو تحریر و تقریر اور نظم و نثر میں یکساں روانی اور یکساں قابلیت رکھتے ہیں۔ اور ایسے صاحب کمال لوگوں میں جو دونوں اوصاف سے متصف ہوں۔ ہمارے اقبالؔ بھی امتیاز خاص رکھتے ہیں۔ دوران قیام انگلینڈ میں باوجود کثرت مشاغل "اسلام" پر چھ پبلک لکچر دیئے۔ جو نہایت مقبول ہوئے۔ اور جس سے آپ کی مذہبی تحقیقات کی بھی دھوم مچ گئی۔ چھ ماہ تک لندن یونیورسٹی میں پروفیسر ارنلڈ صاحب کے قائم مقام کی حیثیت سے آپ عربی کے پروفیسر بھی رہے۔

ولایت سے واپسی

صرف ۳۲ - ۳۳ سال کی عمر میں اتنے علمی اعزاز اس قدر ڈگریاں اور فارسی. عربی. سنسکرت کے علاوہ یورپ کی کئی زبانوں میں ماہر ہونا اور مقبولیت اور شہرت حاصل کرنا معمولی دماغ اور تربیت کا کام نہیں ہے۔ اقبالؔ کی عزت جو عالم متبحر ہونے کی حیثیت سے آج کل ہندوستان اور یورپ میں ہے۔ وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہے۔ آخر آپ ولایت سے واپس وطن کو روانہ ہوئے اور بمبئی دہلی۔ انبالہ میں ٹھہرتے اور اپنے دوستوں سے ملتے ہوئے ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز پیر شام کی گاڑی میں لاہور تشریف لائے۔ جہاں اُن کے احباب اور دیگر بزرگان لاہور بلاتخصیص مذہب اُن کے خیر مقدم کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔ شام کو اُن کے اعزاز میں ایک پارٹی منعقد ہوئی جہاں اکثر احباب نے نظمیں بھی پڑھیں۔ ایک دن کے قیام کے بعد آپ سیالکوٹ تشریف لے گئے۔

اہل اللہ سے ارادت

انگریزی تعلیم نے نوجوان ملک و قوم کے عام (بالخصوص مذہبی) خیالات کو نقصان عظیم پہنچایا

ہے۔ یہ ایک حد تک بالکل درست ہے۔ لیکن جب غور کیا جائے گا۔ تو معلوم ہو گا ؎

مے کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است		بلکہ مے میشود از صحبت ناداں بدنام

درحقیقت یہ ہمارا اپنا قصور ہے۔ ہماری تعلیم و تربیت اگر اچھے پیمانہ پر ہو صحبت نیک ہو مذہبی تعلیم سے اچھی واقفیت ہو۔ تو کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی کسی کو صراط مستقیم سے گمراہ نہیں کر سکتا۔ آج کل مشایخ اور علمائے کرام کی طرف سے جو بدگمانی بلکہ نفرت سی تعلیم یافتہ گروہ میں پھیل رہی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن اقبالؔ اور اُس کا خاندان اس کا زندہ نمونہ موجود ہے کہ تعلیم کے ساتھ اگر تربیت بھی اور واقفیت بھی ہو تو مشایخ و اولیا کے حسن عقیدت کے اثر کو انگریزی اعلیٰ تعلیم سائنس اور فلسفہ اور ممالک یورپ کی سیر و سیاحت اور نئی روشنی اور تہذیب بھی زائل نہیں کر سکتی۔ چنانچہ آپ ولایت جاتے ہوئے بھی بمقام دہلی آستانہ حضرت محبوب الٰہی پر حاضر ہوئے۔ وہاں ایک خالص صوفیانہ نظم بھی پڑھی۔ اور واپسی کے وقت بھی جبکہ علاوہ علمی قابلیتوں کے اضافہ کے آزادیئے یورپ کی ہوا بھی کھا چکے تھے۔ درگاہ حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی پر بقصد عجز۔ سر تسلیم و نیاز خم کیا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ بزرگ صحیح معنوں میں صوفی ہو۔ دکان دار نہ ہو ؎

علم و عمل کا وصف کسی پیر میں بھی ہو		زر کیا ہے سر بھی دیدیں مریدانِ باصفا

اعجاز بیان شاعر کب پیدا ہوتے ہیں

مغرب[۱] کے نقادانِ سخن کہتے ہیں کہ زمانہ اپنی رفتار کے مطابق شاعر پیدا کرتا رہتا ہے اور ہر شاعر اپنے زمانہ کے حالات کا ایک مجسمہ ہوتا ہے۔ شاعری کی تاریخ اس دعوےٰ کا ایک بین ثبوت پیش کرتی ہے۔ اور اقوام عالم کے مختلف زمانوں کی حالت اس کی صداقت کی ایک مکمل دلیل ہے جب کسی قوم میں شجاعت اور جوانمردی کا جوہر کمال پر ہوتا ہے۔ اس کے افراد میدانِ کارزار کو

---

[۱] از مضمون فلسفہ اقبالؔ اکرام الحق صاحب سلیم۔ بی اے

عیش و نشاط کا ایوان خیال کرتے ہیں۔ شمشیر کی عریانی ہلال عید کی تابانی کا لطف پیدا کرتی ہے۔ تو شاعر نعرۂ جنگ بلند کرتا ہے۔ اور قتل و غارت کا طبل بجاتا ہوا اٹھتا ہے۔ وہ گوہر افشاں نہیں، شرر ریز ہوتا ہے۔ اس کے منہ سے پھول نہیں جھڑتے۔ انگارے برستے ہیں۔ اس کے اشعار خنجر بُرّاں سے تیز تر ہوتے ہیں۔ ان کی شعلہ بیانی میں ایک داستانِ شجاعت پنہاں ہوتی ہے جو ملکوں اور قوموں کو زیر و زبر کر دیتی ہے۔ اس نوع کے شاعر ازمنۂ تاریک میں سینکڑوں کی تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔ سپارٹا کی فتوحات کا باعث ایک نحیف الجثہ شاعر تھا۔ جسے یونانیوں نے فوجی خدمت کے ناقابل سمجھ رکھا تھا۔ عرب کا نابینا شاعر قیس اعشیٰ قبیلوں کی فتوحات کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اس کا ایک شعر ہنگامۂ قتال کی آتش فروزی کے لیے کافی تھا۔

قوم کی ہستی میں ایک اور دور آتا ہے۔ جب قوم حکمران ہوتی ہے۔ اُس وقت جدوجہد زندگانی اور مقابلہ کا فقدان نوائے حیات میں اضمحلال اور سکون پیدا کر دیتا ہے اور ابتدائی ذوق نشو و نما مسلک قناعت سے متبدل ہو جاتا ہے۔ شاعر ایک باقاعدہ ہستی ہوتی ہے۔ جو اربابِ دولت اور ثروت کی چوکھٹ پر جبیں سائی کرتی رہتی ہے۔ صنفِ شاعری میں قصائد اور غزل کو فروغ ہوتا ہے۔ مگر اوّل الذکر کسی صاحبِ اقبال کی تعریف اور توصیف اور موخر الذکر حسن و عشق کے چرچے کی قدر ہوتی ہے۔ حقیقتاً شاعری میں ایک تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ جس کی ابتدا قوم کے آفتاب ترقی کے زوال کے ساتھ ہونے لگتی ہے۔

اس حالت سے گرنے پر ایک تیسرا دَور آتا ہے۔ جب قوم کی حالت ایک عبرت انگیز انجام کو پہنچ چکتی ہے۔ اسے اپنی پستی اور تنزل کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ غیر ٹھوکریں مارتے ہیں ظلم کرتے ہیں۔ ان کا حق دبا بیٹھتے ہیں۔ مگر افرادِ قوم کچھ ایسے قعرِ مذلّت میں گرے ہوتے ہیں کہ چپکے سے بے شرمی کی باتیں سہے جاتے ہیں۔ اور اپنے انحطاط کو انتہائی تہذیب اور اپنی بے غیرتی کو قناعت اور صبر کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ اس وقت نظام طبعی کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے قدرت کروٹ بدلتی ہے اور اس زمین شعر سے ایسے ایسے پیغمبرانِ سخن اُٹھاتی ہے۔ جو اپنی اعجاز بیانیوں

سے نیم مردہ قوم کے یخ بستہ جذبات کو سخن کی آگ سے گرما دیتے ہیں۔ اور ملت کی مردہ رگوں میں خونِ زندگی کی ایک لہر دوڑا دیتے ہیں۔ قوم کو اسلاف کے کارناموں کی خبر دے کر یقین دلاتے ہیں کہ اس قوم میں ابھی تک ترقی کے اجزا موجود ہیں ؎

تو از دمیدِ گل و لالہ نا اُمید مشو ۔۔۔ کہ شاخِ زندگیِ ما ہنوز نمناک است

اقبال کی ابتدائی شاعری

اقبال نے ایف اے کا امتحان مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کیا تھا۔ اور شاعری کی ابتدا بھی وہیں سے ہوئی تھی۔ لیکن طبع خداداد کے شاعرانہ جوہر گورنمنٹ کالج لاہور میں آکر ظاہر ہوئے۔ علم کی روشنی اور لاہور کی سوسائٹی نے طبیعت کو وہ جلا دی کہ ذرہ آفتاب بن کر چمکا اور ایسا چمکا کہ ایک عالم کو طرزِ جدید کی شاعری سے منور کیا۔ آپ کی شاعری کا چرچا ابتدا میں ہم جماعت طلبا تک ہی محدود تھا۔ فروری ۱۸۹۶ء میں جبکہ آپ بی۔اے میں پڑھا کرتے تھے۔ آپ کی شاعری کی دھوم طلبا اور خاص خاص احباب کے حلقہ سے نکل کر اپنی برادری یعنی اہلِ خطہ کی مجلس میں پہنچی۔ جس کے دو ایک جلسوں میں آپ نے چند نظمیں اور رباعیاں پڑھیں۔ ایک رباعی ذیل میں درج کی جاتی ہے ؎

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر ۔۔۔ چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں ۔۔۔ مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

اسی زمانہ میں لاہور کے مشاعروں میں بھی شامل ہوتے رہے۔ مرزا داغ مرحوم سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ ایک طویل غزل میں جو رسالہ شورشِ محشر میں چھپی تھی۔ آپ تلامذۂ داغ کا ثبوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں ۔۔۔ مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں کا

ابتدائی کلام میں زیادہ تر غزلیں ہی ملتی ہیں اور چونکہ آپ نے اپنے مجموعۂ کلام "بانگِ درا" میں پُرانا کلام اور خصوصاً غزلوں کو بہت کم جگہ دی ہے۔ اس لئے وہ بھی نایاب ہیں۔ سب سے پہلے

مشاعرہ میں آپ نے جو غزل پڑھی اس کا مقطع یہ ہے ؎

اقبالؔ لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

حق یہ ہے کہ آپ نے دلّی و لکھنو کی قید سے آزاد ہو کر اپنے لیے ایک الگ دنیائے شاعری پیدا کی ہے۔ اور آج تمام ہندوستان میں ہر شاعر اپنی شاعری کو آپ ہی کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوششوں میں نظر آتا ہے۔ بیس بائیس سال کی عمر تھی۔ جب آپ نے یہ غزل پڑھی تھی۔ اس شعر پہ جب پہنچے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو مرزا ارشد گورگانی مرحوم بے اختیار واہ واہ اور سبحان اللہ کہہ اُٹھے اور بولے۔ "میاں اقبال اس عمر میں اور یہ شعر" یہ پہلا موقع تھا کہ لاہور کے باذاق اور سخن فہم لوگوں کو اس نوجوان اور ہونہار شاعر سے شناسائی ہوئی۔

جو شاعر ملکوں اور قوموں کو بیدار اور حیات نفس و حیات کا اعادہ کرنے کے لیے آتے ہیں وہ زیادہ دیر تک غزلوں اور محض عشقیہ غزلوں کے دلدل میں نہیں رہ سکتے۔ آخر اقبال بھی قوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں آپ نے نالۂ یتیم کے نام سے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں جو نظم نہایت سوز و گداز سے پڑھی اُس نے آپ کی شاعرانہ و علمی شہرت کو ہندوستان و پنجاب کی ہر علمی سوسائٹی تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد انجمن کے ہر سالانہ جلسہ میں نظم اقبال ایک ضروری جزو ہو گئی۔

اس معجز نما شاعر نے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر ملّت کی پُر درد اور عبرت انگیز تباہی کو دیکھا اور قوم کے جمود و سکون کو دور کرنے کے لیے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ کا پلیٹ فارم پسند کیا۔ جہاں اس کے پُر درد نغمے اور دلگداز نعرے خون کے آنسو رُلاتے تھے۔ اور ملک کی حالت پر نوحہ خوانی کرنے کے لئے مخزن کے صفحات پر کلیجہ نکال کے رکھ دیا۔ اور "ہندوستان ہمارا" اور "ہمالہ" اور "نیا شوالہ" کے نام سے وہ نظمیں لکھیں کہ ہر اہلِ دل۔ ہر اہلِ علم اور بلا تخصیص مذہب و ملّت

ہر شخص کی زبان پر اقبال ہی اقبال تھا۔

اقبال کی وطن پرور شاعری

علامہ اقبال نے وطنیت کے جذبات سے لبریز نظم "ہمالہ" کے نام سے دنیا میں پیش کی۔ یہ پہلا ہی شعر ہے۔ اور کس محبت اور جوش و جذبہ کا اظہار کرتا ہے ؎

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستان — زیب دیتا ہے تجھے کہیئے اگر سارا جہاں

یہ نظم ایک وطن پرست انسان کے مردہ حسیات کو زندہ کرنے کے لئے برقی رَو کا کام دیتی ہے اسی نظم میں ہمارا شاعر کس بے تکلفانہ انداز میں ہمالہ سے خطاب کرتا ہے ؎

اے ہمالہ داستاں اسوقت کی کوئی سنا — مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا

کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا — داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا

اقبال نے وطنی اتحاد اور قومی مواخاۃ پیدا کرنے کے لئے کئی نظمیں لکھیں۔ خصوصاً قیام یورپ کے ایام میں وطن کی زبوں حالی سے بہت متاثر تھے۔ فرماتے ہیں ؎

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے — میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

پھر "ہندوستان ہمارا" میں لکھتے ہیں ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اقبال کی شاعری اسلامی رنگ میں

سنہ ۱۹۱۱ء کی تاریخ نے مسلمانان عالم کے لیے کربلائے جدید کا ایک نیا باب کھولا۔ بلقان کی جنگ اور طرابلس الغرب کی لڑائیاں مسلمانوں کا خون نچوڑ رہی تھیں۔ خلافت اسلامیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھنے کو اور اسلام کا سیاسی اقتدار مٹنے کو تھا۔ ہمارے قومی شاعر کے دل میں بھی جذبات موجزن

تھے۔ اس عام مصیبت پر کونسا مسلمان نہ تڑپ اُٹھا ہوگا۔ پھر ہمارا شاعر اس تیر کی زد سے کس طرح بچ سکتا تھا۔ نظمیں لکھیں اور پڑھیں۔ محفلوں میں شور و شین برپا کر دیا۔ مجلسیں صفِ ماتم بن گئیں۔ خصوصاً ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو بادشاہی مسجد لاہور میں "خونِ شہدا کی نذر" کے عنوان سے جو نظم آپ نے پڑھی۔ اُس نے ایک قیامت بپا کر دی۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی۔ جو آنسوؤں سے لبریز نہ تھی۔ اور کوئی دل ایسا نہ تھا۔ جو تڑپ نہ اُٹھا ہو۔

مسلمان اسلام اور اسلامی ممالک کو خطرہ میں دیکھ کر سہمے ہوئے تھے۔ اقبالؔ بھی اُنہیں میں تھے۔ اور شاعر چونکہ فطرتاً ذکی الحس ہوتا ہے۔ اس لیئے انہوں نے اس عالمگیر اسلامی مصیبت کو سب سے زیادہ محسوس کیا۔ اب وہ وطن کو ایک "بت" کہتے تھے۔ اور ان کے نزدیک "فرد" کا وجود ایک عالمگیر "ملت" میں مدغم ہونے کے لیے تھا۔ اب وہ "ترانہ ہندی" کی بجائے "ترانہ ملی" لکھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اور وطنیت کو اسلام کے منافی قرار دیتے ہیں، اور فرماتے ہیں ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

پھر ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؏

مسلم ہے اگر تُو تو "وطن" سے کیا کام؟

کچھ شک نہیں کہ اقبالؔ کی شعلہ نوائی سے یہ آگ دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ تک پہنچ گئی۔ لیکن وطن پرستوں کو ان سے شکوہ پیدا ہوا۔ اور اس کا اظہار جس نظم[1] میں کیا گیا۔ اُس کے چند شعر ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

ہندی ہونے پہ ناز جسے کل تک تھا حجازی بن بیٹھا
اپنی محفل کا رند پرانا آج نمازی بن بیٹھا

---

[1] مصنف پنڈت انند نرائن صاحب ملا ایم اے ایل ایل بی۔

محمل میں چھپا ہے قیس حزیں دیوانہ کوئی صحرا میں نہیں
پیغامِ جنوں جو لایا تھا اقبالؔ وہ اب دنیا میں نہیں
اے مطرب تیرے ترانوں میں اگلی سی اب وہ بات نہیں
وہ تاز گئے تخیل نہیں بے ساختگئ جذبات نہیں

علامہ اقبال کے کلام کی شہرت اور اُس پر تضمین!

علامہ ممدوح کا کلام اپنی سحر طرازی اور سوز و گداز کی وجہ سے شہرت کے پَر لگا کر اُڑ رہا تھا اور ہمالہ کی فلک پیما چوٹیوں کو عبور کر کے ہندوستان سے باہر بھی اپنی قبولیت کی فضا پیدا کر رہا تھا۔ مئی ۱۹۲۴ء میں جبکہ شاہ امان اللہ خاں اپنی حکومت کے انتہائی عروج کی منزلیں طے کر رہے تھے، ڈاکٹر اقبال کا کلام کابل کی ایک عظیم الشان مجلس میں پڑھا گیا جس میں شاہ ممدوح سفرائے دول خارجہ۔ عمائدین شہر اور وزیر تعلیم اور دوسرے وزراء بھی شامل تھے۔ یہ جلسہ طلباء کے تقسیم انعامات کا تھا۔ اس میں ہمارے ملک الشعراء ہند کا مشہور قومی ترانہ "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" بچوں نے اپنے پیارے اور سادے لہجہ میں سُنایا۔ پھر جب فوجی باجہ نے اُسے دُہرایا تو حاضرین پر رقت طاری ہوگئی۔ جس طرح ہندوستان کی ہر قومی و ملکی محفل میں "ہندوستاں کے ہم ہیں۔ ہندوستاں ہمارا" کا ترانہ پڑھا جاتا ہے اسی طرح ہندوستان کی ہر اسلامی مجلس میں "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" ایک جزو لاینفک ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کے یہ دونوں ترانے بے حد مقبول ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کی کئی اور اُردو فارسی نظموں پر بھی شاعروں نے تضمین لکھی ہیں۔ بلکہ اسلامی ترانہ کا ترجمہ عربی کی نظم میں بھی ہو گیا ہے۔

آغا شاعر قزلباش دہلی کے ایک نامور شاعر ہیں۔ وہ مہاراجہ جھالرا پٹن (آنجہانی) کے مصاحب بھی اور درباری شاعر بھی تھے۔ ۲۶-۱۹۲۷ء میں وہ کلکتہ کے گرانڈ ہوٹل میں مقیم تھے۔ جہاں امریکن سیاحوں کی ایک پارٹی بھی قیام پذیر تھی۔ ان میں اور ایک سیاح میں کچھ بات چیت ہوتی ہے۔

امریکن سیاح ان سے پوچھتا ہے۔ آپ کون ہیں اور کیا کام کرتے ہیں۔ آغا شاعر جواب دیتے ہیں۔ میں ایک مہاراجہ کا مصاحب اور اس کا ایک مشہور شاعر ہوں۔ امریکن سیاح کہتا ہے "تو کیا آپ اقبال ہیں۔ مسٹر اقبال؟" آغا صاحب لکھتے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں متحیر ہو گیا اور مجھے ڈاکٹر اقبال کی اس عظیم الشان مقبولیت اور لافانی شخصیت کا دل سے اعتراف کرنا پڑا۔

کوئی دن اور کوئی ہفتہ ایسا نہیں جاتا۔ جب ہمارے اس مشہور عالم مگر گوشہ نشین شاعر کے پاس اقطاع ہند کے سیاحوں کے علاوہ جرمن۔ ٹرکی۔ انگلینڈ۔ بخارا افغانستان۔ ایران۔ امریکہ اور دیگر ممالک کے اہل علم ملاقات کے لئے نہ آتے ہوں۔

اقبال شعرائے ہند کی نظروں میں

اقبال کی الہامیہ شاعری کی قبولیت عامہ کا یہ عالم ہے کہ اس کی زندگی ہی میں اس کے سوانح حیات انگریزی اور اردو میں لکھے گئے۔ اس کے کلام پر بڑے بڑے اہلِ علم واہل دماغ اصحاب نے تبصرے کیئے۔ اس کی حیات افروز نظموں کی وجہ سے اس کی شان میں اس کے ہم عصر شعراء نے قصائد لکھے اور واقعات وحقائق کا پہلو لئے ہوئے لکھے۔ مولانا غلام قادر گرامی نے جو عہد حاضرہ کے نامور فارسی شاعر گذرے ہیں۔ اقبال کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ایک شعر میں تو کمال ہی کر دیا ہے فرماتے ہیں ؎

در دیدۂ معنیٔ نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبریٔ کرد و پیغمبرِ نتواں گفت

ان کے ایک ہم وطن فگار صاحب سیالکوٹی لکھتے ہیں ؎

از خمستانِ کہن جامِ شرابِ آوردۂ — نغمۂ داؤد از تارِ رباب آوردۂ
اے حکیم روحِ ملت از دوائے فلسفہ — دین ابراہیمؑ را عہد شباب آوردۂ
از "رموزِ بیخودی" سرِ خودی کردی عیاں — از سراب اے ابوالحکم دریائے آب آوردۂ

مولانا گرامی کی معنی رس نظروں میں اقبال کی جو وقعت ہے۔ وہ ان اشعار سے بھی معلوم ہو سکتی ہے ؎

از نوایش بزم یورپ در خروش | حکمت امریکہ او را سفتہ گوش
نالہ ہائے آتشینِ آں حکیم | سوخت رختِ فتنۂ امید و بیم
ساخت باد لہا و بود ش ہیچ نیست | سوخت دلہا را و دودش ہیچ نیست

سید بشیر احمد صاحب اخگر جالندھری "اقبال" کے عنوان سے ایک نظم میں لکھتے ہیں ؎

تیری ہستی کیا ہے پیغام بقا میرے لئے | تیرے "اسرار خودی" ہمت فزا میرے لئے
یاں "رموزِ بیخودی" عقدہ کشا میرے لئے | راہبری بن گئی "بانگِ درا" میرے لئے

روح غالب در د میر ا اقبال تیرے دل میں ہے
حُسن لیلائے سخن پنہاں اسی محمل میں ہے

فارسی کا ایک قطعہ مشہور ہے ؎

در شعر سہ تن پیمبر انند | ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را | فردوسی و انوری و سعدی

یہ تو اصناف شاعری کی تحسین کا انداز تھا۔ مولانا حامد حسن قادری نے خصائص و محاسن شاعری میں جن تین اُردو شاعروں کا انتخاب کیا ہے اس کا اندازِ مدح و بیان بھی قابلِ تعریف ہے۔ میر و غالب کے کمالات شعر کو کس خوبی سے اقبال کی ذات میں دکھاتے ہیں ؎

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے | جن کی فیض طبع نے اردو کو گنج زر دیا
ایک اثر میں بڑھ گیا اک رفعتِ تخئیل میں | تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائنات شاعری میں ہیں بس یہی دونوں کمال | تیسرے میں اس لئے دونوں کو یکجا کر دیا

خان اصغر حسین خاں صاحب نظیر لدھیانوی فارسی اور اردو، دونوں زبانوں کی شاعری پر عبور کامل رکھتے ہیں۔ بلکہ فارسی میں ان کا درجہ اردو سے بھی زیادہ بلند ہے۔ وہ اقبال کے متعلق

اپنی ایک نظم میں لکھتے ہیں :۔

جان و دل را از نوائے خود گداز | آشیاں در گلشن اقبال ساز
آں چمن آرائے اسرار و رموز | آستاں پیرائے اسرار و رموز
خیمہ زن در وادیٔ طورش کلیم | شعر او تفسیر قرآن حکیم
حاصل خم خانہ ہا زیر برش | مے بہ تاک اندر نہاں در ساغرش
در تنِ ما گر رواں بینی از واست | آنچہ در ہندوستاں بینی از واست

گرامی مرحوم اپنے مرض الموت میں بھی (۲۶ رمئی ۱۹۲۷ء) کو علامہ اقبال کو اکثر یاد کرتے رہے۔ آخری لمحوں میں یہ شعر ان کی زبان پر تھا ؎

صبا بہ حضرتِ اقبال ایں پیام دہ | کہ رفت جان گرامی و تو ہنوز خموش

ہمارے قومی شاعر کو سر کا خطاب

۱۹۰۱ء میں جبکہ ملکہ وکٹوریہ کے انتقال پر ڈاکٹر اقبال نے ایک درد انگیز ترکیب بند لکھا۔ تو سرکاری حلقوں میں اقبال کی شاعری نے ایک دھوم مچا دی۔ پھر انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسہ میں جب سر ... جنٹ اس زمانہ کے لاٹ صاحب تشریف لائے تو اقبال نے ان کی شان اور علم کی تعریف میں ایک قطعہ لکھا یہ غالباً ۱۹۰۳ء کا ذکر ہے۔ یورپ کی جنگ عظیم میں آپ نے ایک نظم لکھی۔ یہ نظم گورنمنٹ پنجاب کے سرکاری اخبار "حق" میں چھپی۔ اور اپنی طرزِ خاص کے لحاظ سے سرکاری و غیر سرکاری حلقوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ لیکن گورنمنٹ زیادہ تر اقبال کے علم و فضل اور اس کی قدر و قیمت سے اس وقت واقف ہوئی جب ان کی فارسی تصانیف (اسرار بیخودی۔ رموز بیخودی) نے یورپ کے اخبارات اور اہلِ علم طبقہ میں جگہ پیدا کر لی۔ ان دونوں مثنویوں کے ترجمے یورپ کی کئی زبانوں میں شائع ہوئے۔ اور جب اہل مغرب نے مشرق کے ایک شاعر کا فلسفہ حیات ایک نئی زبان اور

نئے انداز میں دیکھا، تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکل گیا ؎

آتشے از سینۂ اہل عجم افروختی

در فضائے عزب سیل اضطراب آوردۂ

کبھی خطابات اور ہوس جاہ کی خواہش نہ کی تھی۔ بلکہ جو ہمیشہ آزادی و حریت کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ اس لیے اس پر اخبارات اور شعرا نے بہت کچھ طبع آزمائیاں کیں۔ ایک نظم کے تین شعر یہاں بھی درج کئے جاتے ہیں ؎

لو مدرسۂ علم ہوا قصر حکومت　　　افسوس کہ علامہ سے سر ہو گئے اقبال

پہلے تو سر ملت بیضا کے تھے وہ تاج　　　اب اور سنو تاج کے سر ہو گئے اقبال

کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ　　　سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال

لیکن آپ کی اس عزت افزائی پر جو عظیم الشان پارٹی مقبرۂ جہانگیر میں لاہور کے سکھوں، مسلمانوں اور ہندوؤں کی طرف سے آپ کو دی گئی۔ اور جس میں نہ صرف لاہور کے معززین بلکہ پنجاب کے مختلف شہروں کے اکابر اور اہل علم شریک تھے۔ اور اکثر انگریز حکام و لیڈیوں کے علاوہ خود گورنر پنجاب بھی مدعو تھے۔ وہ ظاہر کرتی ہے کہ ملک نے ایک شاعر کی عزت کو کس وقعت و فخر کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس پارٹی میں ڈاکٹر صاحب نے انگریزی زبان میں ایک دلچسپ تقریر کی۔ اور اسی تقریر سے پہلی مرتبہ لوگوں کے کان آپ کی مشہور تصنیف "پیام مشرق" سے آشنا ہوئے جو آپ جرمن شاعر گوئٹے کے جواب میں تصنیف کر رہے تھے۔

علامہ اقبال کا سفر میسور، مدراس وحیدر آباد دکن:

دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخری ایام میں چند لکچر دینے کے لیے سر اقبال کو مدراس میں مدعو کیا گیا تین دن آپ وہاں رہے۔ مختلف افراد اور انجمنوں نے ایڈریس اور دعوتیں دیں۔ مدراس، بنگلور میسور کے قریباً ہر انگریزی و ورنیکلر اخبار نے آپ کے فوٹو شائع کئے۔ اخبارات کے نمائندوں

اور مذہب و فلسفہ کے بڑے بڑے عالموں نے آپ سے مذہب و فلسفہ اور سیاسیات پر گفتگو کی۔

مدراس میں انجمن ترقی اُردو کے علاوہ ہندی پرچار سبھا اور جنوبی ہند کے برہمن عالموں نے آپ کو سپاسنامے پیش کیے۔

جنوری ۱۹۲۹ء کو جب ڈاکٹر صاحب بنگلور کے سٹیشن پر پہنچے، تو ہزارہا آدمی شمالی ہند کے اس نامور عالم کو دیکھنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔ یہاں آپ کو مسلم لائبریری کی طرف سے جس جلسہ میں ایڈریس دیا گیا۔ اُس کے صدر امین الملک دیوان مرزا اسمٰعیل چیف منسٹر میسور تھے۔ طالب علموں اور تعلیم یافتہ لوگوں نے آپ کے خیالات سے مستفیض ہونے کے لیے جس جلسہ کا اہتمام کیا اُس کے صدر ڈاکٹر سبرائن ڈاکٹر محکمہ تعلیمات میسور تھے۔ مہاراجہ میسور کا دعوت نامہ آپ کو بنگلور ہی میں مل چکا تھا۔ اس لیے ۱۰ جنوری کو آپ گورنمنٹ کے مہمان خانہ میں فروکش ہونے کے لیے میسور روانہ ہوئے۔ خاص شہر میسور میں میسور یونیورسٹی نے آپ کے لیکچر کا انتظام کیا۔ دوسرے دن ٹاؤن ہال میں مسلمانانِ میسور نے اپنا ایڈریس پیش کیا۔ جہاں ہندو بھی مدعو کیے گئے تھے۔ میسور یونیورسٹی کے فلسفہ کے پروفیسر نے جو غیر مسلم تھے اپنی تقریر میں کہا، ڈاکٹر اقبال کو مسلمان لاکھ اپنا کہیں۔ مگر وہ ہم سب کے ہیں۔ کسی ایک مذہب یا جماعت کی ملکیت نہیں۔ اگر مسلمانوں کو یہ ناز ہے کہ اقبال ان کا ہم مذہب ہے تو ہم ہندوستانیوں کو یہ فخر کم نہیں ہے کہ اقبال ہندوستانی ہے!

میسور۔ بنگلور۔ سری رنگ پٹن اور دوسرے مقامات دیکھنے کے بعد آپ ۱۴ جنوری کو حیدر آباد پہنچے۔ جہاں اسٹیشن پر ہی مسلمان بچے ایک قطار میں کھڑے ہو کر "چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا" کی نظم خوش الحانی کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ سٹیشن پر عوام کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی کے تمام ارکان موجود تھے۔ یہیں آپ کو اطلاع دی گئی کہ آپ نظام گورنمنٹ کے مہمان ہیں۔ اس لیے سیدھے گورنمنٹ مہمان خانہ میں جانا ہوگا ۱۸ جنوری کی صبح کو ۱۱ بجے آپ اعلیٰحضرت حضور نظام سے ملے۔ حیدر آباد دکن۔ میسور اور مدراس کے

اخباروں نے آپ کی علمی فضیلت پر مضامین شائع کئے۔ آپ کی تصویریں چھاپیں اور میسور کے اخبار الکلام نے اقبال نمبر چھاپا۔

مذہب اور سیاست کے متعلق علامہ اقبال کے خیالات

مدراس کے سفر میں ۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو مدراس کے مشہور روزانہ اخبار سوراجیہ کے ایک نمائندہ نے مذہب اور سیاست کی یکجائی کے متعلق علامہ اقبال سے ایک سوال کیا۔ آپ نے اس کا جواب بڑی تفصیل سے دیا۔ ہم یہاں اُس کا خلاصہ درج کرتے ہیں :

"میں اس امر کی ضرورت بڑی شدّت سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہماری درسگاہوں میں مذہبی تعلیم بھی ہونی چاہیئے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ میں بحیثیت ایک ہندوستانی کے مذہب کو سوراج پر مقدّم خیال کرتا ہوں۔ ذاتی طور پر مجھے ایسے سوراج سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ جو مذہب سے بے نیاز ہو یورپ میں تعلیم کا خالصتہً دنیوی طریق بڑے تباہی آمیز نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا ملک بھی ان تلخ تجربات سے دو چار ہو۔ یہ امر صاف ظاہر ہے کہ باشندگان ایشیا یورپ کے خالص مادّی رویّہ کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ رُوحانی اور مادّی امور کو کس طرح یک جا جمع کیا جائے۔

سب سے پہلی ایشیائی قوم جسے اس مسئلہ کو حل کرنے سے واسطہ پڑتا تھا۔ ٹرک تھی۔ میں کہتا ہوں کہ ترک رُوحانیت و مادیت کے مطلوبہ اجتماع کو حاصل کرنے میں ناکامیاب رہے۔ تاہم میں ترکوں کی طرف سے مایوس نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تاتاری نسل اس تیزی فہم و ادراک اور اس عمق ضمیر سے محروم ہے۔ جو اس مسئلہ کے حل کے لئے ضروری تھی۔ میں

فی الحال اس مسئلہ کے متعلق ایران، عرب اور افغانستان کی آئندہ روش پر بھی اظہارِ خیال نہیں کر سکتا۔ جو اقوامِ ایشیا کے سامنے پیش ہو رہا ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ باشندگانِ ہند اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے اہل ثابت ہوں گے۔ کیونکہ ان کی مذہبی روایات، ان کے ادراک کی تیزی اور ان کے جذبات کی شدت اس کام کی اہلیت کا ثبوت دے رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نوعِ انسان کی عام بھلائی کے لیے میں یہاں کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی مفاہمت کا متمنی رہتا ہوں اور اسے اشد ضروری خیال کرتا ہوں۔ صرف باشندگانِ ہند ہی پرانی دنیا کے کھنڈروں پر نئے آدم کے لئے نئی دنیا تعمیر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کی باتیں کہ مذہب کو بالائے طاق رکھ کر تمام تر توجہ سیاسیات پر دینی چاہیئے۔ یورپ کی غلامانہ تقلید کے سوا اور کچھ نہیں جس کی مادہ پرستی یورپ کی روحانیت اور دوسری اقوام کی مادیت کے لئے پیامِ موت ثابت ہو چکی ہے۔"

علامہ اقبالؔ کی تصنیفات

علامہ ممدوح نے سب سے پہلے اردو میں علم الاقتصاد کے نام سے ایک کتاب لکھی جو آجکل نایاب ہے۔ انگلستان میں "فلسفۂ ایران" پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی۔ جس پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ انگلستان سے واپس آکر اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے نام سے دو مثنویاں شائع کیں۔ جن پر ملک کے ہر گوشہ سے احسنت و مرحبا کی صدا بلند ہوئی پھر "بانگِ درا" کے نام سے اپنے اردو کلام کا مجموعہ شائع کیا۔ اس کے بعد پیامِ مشرق اور زبورِ عجم نے آپ کی شہرت و عظمت کو اور بھی چار چاند لگا دیئے۔ آپ نے ۱۹۲۹ء میں جو چھ لکچر انگریزی میں مدراس میں دیئے تھے۔ وہ بھی کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ کون

جانتا تھا کہ سیالکوٹ کا وہ لڑکا جس کی ابتدا نہایت معمولی تھی۔ بڑھتے بڑھتے شہرت کے اس فلک الافلاک تک جا پہنچے گا۔ جہاں ان سے پہلے کوئی ہندوستانی نہ جا سکا تھا کس کو علم تھا کہ خاموش وضع کا یہ تنہائی پسند لڑکا اپنے دماغ میں کیا کیا فیضان وہبی چھپائے ہوئے ہے۔ یہ وہ ہستی ہے جس پر خطۂ کشمیر کو ناز ہے۔ یہ وہ نادر وجود ہے۔ جس پر سیالکوٹ جو اس کا جنم بھوم ہے فخر کرتا ہے۔ یہ وہ لاثانی شخصیت ہے جس کا نام لے کر پنجاب بلکہ تمام ہندوستان پھولا نہیں سماتا

علامہ اقبال اور بیرونی ممالک کے ارباب علم[1]

(۱) حسین دانش ترکی فاضل نے ترکی میں علامہ اقبال کی بہت سی نظموں کا ترجمہ کیا اور "پیامِ مشرق" پر تبصرہ لکھا۔ ہمیں یہ معلومات ڈاکٹر توفیق بے رکن وفد ہلال احمر سے ملیں۔ ڈاکٹر توفیق بے نے یہ بھی فرمایا کہ اقبال کے نظریات کو شاید ہی کسی نے اس وضاحت سے لکھا ہو جس وضاحت سے حسین دانش نے لکھا ہے۔ ایک روز ڈاکٹر توفیق بے نے دورانِ گفتگو میں کہا کہ اگر اقبال کبھی قسطنطنیہ تشریف لائیں تو اُن کا شاہانہ استقبال کیا جائے۔

(۲) امان افغان (کابل) جناب آغا ہادی حسن صاحب وزیر تجارت نے جو پہلے انگلستان میں افغانستان کے سفیر تھے۔ ایک سلسلۂ مضامین پیامِ مشرق پر بطور تبصرہ لکھا تھا جو کئی نمبروں میں چھپا۔

(۳) مصر کے مشہور و معروف سیاح جناب احمد رفعت بھی ہیں جنہوں نے پچھلے دِنوں ممالک اسلامیہ کی سیاحت ختم کی۔ اس سیاحت کے دوران میں وہ شملہ و لاہور میں بھی رونق افروز ہوئے۔ جناب احمد رفعت نے اقبال کی بہت سی نظموں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اور یہ تراجم مصر کے مشہور جریدہ الاہرام میں شائع ہوتے۔

---

[1] انقلاب ۲۴ جولائی ۱۹۲۷ء مضمون مرتبہ پروفیسر محمد عبداللہ صاحب

(۴) مولوی عبدالحق صاحب حقی بغدادی مرحوم سابق پروفیسر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے علامہ کی مشہور نظم ترانہ کا ترجمہ عربی میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ بھی مصر وغیرہ کے عربی اخبارات میں چھپ چکا ہے۔

یورپ و امریکہ

(۱) ڈاکٹر نکلسن پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی نے اسرارِ خودی کو انگریزی لباس پہنایا۔ پھر پیامِ مشرق پر رسالہ اسلامیکا (جرمنی) میں تبصرہ لکھا۔ اس تبصرہ کا اردو ترجمہ نیرنگِ خیال کے عید نمبر ۱۹۲۵ء شائع ہو چکا ہے۔ سُنا جاتا ہے کہ آجکل ڈاکٹر موصوف پیامِ مشرق کے انگریزی ترجمہ میں مصروف ہیں۔

(۲) ڈاکٹر براؤن آنجہانی نے اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمہ پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلہ ۱۹۲۱ء میں تبصرہ لکھا۔ نیز اپنی تازہ ترین تالیف تاریخ ادبیات فارسی کی آخری جلد یعنی جلد چہارم میں شہاب الدین سہروردی کے سلسلہ میں ذکر فرمایا۔

(۳) ڈاکٹر شورو سونے پیامِ مشرق کے مقدمہ کو جرمنی زبان کے لباس کا جامہ پہنا کر پیامِ مشرق کی غرض و غایت کو واضح کر دیا ہے۔

(۴) ڈاکٹر فشر پروفیسر لیپزگ یونیورسٹی (ایڈیٹر) اسلامیکا نے جرمنی زبان میں پیامِ مشرق پر تبصرہ لکھا۔ اور ڈاکٹر نکلسن سے بھی زیادہ بہتر طریق پر علامہ اقبال کا گوئٹے سے مقابلہ کیا۔

(۵) جرمنی کے مستشرق ڈاکٹر ہانس ماٹنکے نے جو وہاں کا ایک مشہور فلسفی شاعر ہے نہایت حسنِ عقیدت اور فرطِ محبت سے پیامِ مشرق کا استقبال کیا۔ یعنی اس کے ایک خاص حصہ کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا۔ پھر اسے چمڑے کے کاغذ پہ جس میں عموماً انجیل وغیرہ مقدس کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھ کر اور مشرقی انداز میں نقش و نگار کر کے علامہ اقبال کی خدمت میں بطور تہدیہ ارسال کیا۔ احقر کو یہ ہدیۂ نادرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے خیال کیا

جاتا ہے کہ واقعی ایسی نایاب چیز کبھی قدیم زمانہ میں تیار کی جاتی تھی ۔

(۶) خان بہادر عبد العزیز ڈپٹی کمشنر بندوبست جب انگلستان تشریف لے گئے تو وہاں آپ نے لندن یونیورسٹی اور کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال کی شاعری کے نصب العین پر لیکچر دیئے جو بعض یورپی رسائل میں شائع بھی ہوئے ۔

(۷) جرمنی میں ڈاکٹر اقبال کے نام سے ایک سوسائٹی قائم ہوئی ہے ۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ علامہ موصوف کی تعلیمات اور آپ کے کلام کی اشاعت کرے ۔

(۸) ڈاکٹر سکاریہ اٹلی کے مشہور فاضل ہیں ۔ جو پچھلے دنوں افغانستان میں بھی تشریف لے گئے تھے ۔ آپ نے اٹلی کے ایک ادبی مجلّہ میں اقبال کے متعلق ایک نہایت محققانہ مضمون لکھا ۔

(۹) حال ہی جرمنی میں ایک بیاض ہندوستانی علم ادب کے متعلق شائع ہوئی ہے جس میں مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب بصورت تراجم جمع ہے ۔ اس مجموعہ میں علامہ اقبال کی پانچ نظمیں ہیں اور ٹیگور کی محض ایک نظم ہے ۔

(۱۰) ایک روسی نے جو ہندوستان کا سفر کر چکا ہے اور لاہور محض علامہ اقبال ہی سے ملنے کی غرض سے آیا تھا ۔ اسرارِ خودی کے نظریات کو روسی زبان میں قلمبند کیا ۔

(۱۱) ڈاکٹر کزن جو مدراسی تھیوسوفیکل سوسائٹی کے رُوحِ رواں ہیں ۔ اپنی تازہ کتاب ساما دارسن میں تبصرہ لکھا اور ٹیگور و اقبال کا مقابلہ بھی کیا ۔ وہ فرماتے ہیں بنگالی شاعر نے دُنیا پر قبضہ کر لیا ہے ۔ مگر اقبال اُس کا برادرِ کلاں ہے ۔

(۱۲) ڈاکٹر سپوزا آنجہانی نے شکوہ کا ترجمہ انگریزی میں کیا ۔ جو انڈین ریویو میں شائع ہو چکا ہے ۔ آپ پیامِ مشرق کا بھی انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتے تھے ۔

(۱۳) اتھینیم ۱۹۲۱ء میں مسٹر فارسٹر نے اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمہ پر تبصرہ لکھا اور علامہ اقبال کے کلام پر ایک مصلح قوم کی تعلیمات کی حیثیت سے نظر ڈالی ۔ اس تبصرہ کا

ترجمہ بھی غالباً معارف میں شائع ہو چکا ہے۔

(۱۴) مسٹر الیسن سابق مدیر مسلم آؤٹ لُک نے بارہا ٹیگور اور اقبال کا مقابلہ کیا اور اقبال کو ٹیگور سے بہمہ وجوہ بہتر ثابت کیا ہے۔

(۱۵) کتاب ہندوستان کی بیداری، مصنفہ میکنزی میں ایک باب جدید علم ادب کا طلوع کے نام سے بھی ہے جس میں سردار جوگندر سنگھ کی تحریر کی رو سے اقبال کا بھی نہایت وضاحت سے ذکر کیا گیا ہے۔ (صفحہ ۱۵۹) یہ کتاب امریکہ میں ۱۹۲۷ء میں چھپی اسکا مصنف تمام امریکہ کا نمائندہ بن کر ہندوستان آیا تھا۔

(۱۶) ۱۹۲۵ء میں کے انڈین ریویو میں ایک مضمون پیام اقبال کے عنوان سے مسٹر مینن کے قلم سے شائع ہوا۔ مصنف نے دراصل اسرارِ خودی پر اپنے خیالات قلمبند کئے ہیں۔ وہ اسرارِ خودی کو اخوت اسلامی کے موضوع پر ایک الہامی کتاب قرار دیتا ہے۔

(۱۷) علامہ اقبال جب کونسل کے انتخابات میں مصروف تھے۔ تو ایک مقرر نے علامہ ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے مارننگ پوسٹ کی ایک تحریر کا بھی حوالہ دیا تھا جسمیں لکھا تھا کہ اقبال بہت بڑی طاقت ہے۔

سر اقبال اور پنجاب کونسل

علامہ اقبال ذہنی طور پر ہمیشہ احرار کے طبقہ میں شامل رہے ہیں مگر عملی طور پر ان کو میدانِ سیاست میں آنے کا کوئی موقع نہ مِلا تھا۔ وہ خود ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں ؎

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مُبارک ہوں
کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

پھر ایک اور نظم میں اپنی خاموشی زندگی کا اس طرح ثبوت دیتے ہیں ؎

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

لیکن باوجود یہ سب کچھ جاننے کے ان کے دوستوں اور عقیدتمندوں نے بڑے اصرار کے ساتھ ان کو کونسل کی انتخابی جدوجہد کے لئے تیار کیا۔ اور اہلِ لاہور واقف ہیں کہ ۱۹۲۶ء میں لاہور کے ہر محلّے اور کوچے میں حمایت اقبال کے لئے اُن کے دوستوں نے کس قدر جلسے کئے کونسلوں کے انتخابات کے موقع پر اُمیدواروں کی طرف سے ہزار ہا روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ اور ووٹروں کی خوشامدیں اور اُن کی خاطر داریاں علیحدہ ہوتی ہیں لیکن اہلِ لاہور خوب جانتے ہیں۔ کہ اقبال ہی پہلا ممبر کونسل ہے۔ جس کے لئے نہ صرف دو جلیل القدر اُمیدواروں نے اپنے نام واپس لے لئے بلکہ تمام مسلمان برادریوں نے اقبال کی حمایت میں علیحدہ اشتہارات شائع کئے اور اقبال ایک پیسہ خرچ کئے بغیر ۲۳ نومبر ۱۹۲۶ء کے پولنگ میں اپنے مدِمقابل پر اتنے کثیر ووٹوں کے ساتھ کامیاب ہو گیا۔ جو اس بات کا مظہر ہے کہ جمہورِ اسلام۔ طبقہ اعلیٰ اور تعلیمیافتہ نوجوان آپ کی قابلیت پر اور آپ پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔

اخبارات نے علامہ اقبال کی کامیابی پر تعریفی مضامین لکھے۔ زمیندار نے جو آج بعض سیاسی وجوہ کے اختلاف پر آپ کی تمام خوبیوں اور قابلیتوں اور شہرتوں کو "منم کردہ ام رستم داستاں" کا سبب بتا رہا ہے۔ آپ کے کامیاب ہو جانے پر ایک مقالہ افتتاحیہ میں آپ کے متعلق اپنی ۵ دسمبر ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں لکھا:

"ساری دُنیا جانتی ہے کہ علاّمہ ممدوح ایسی نادر الوجود شخصیتیں صدیوں کے بعد پیدا ہوا کرتی ہیں۔ موجودہ مسلمانانِ ہند میں سے شاید علاّمہ ممدوح ہی وہ ممتاز ترین ہستی ہیں جن کے علم و فضل کے رُوبرو یورپ و امریکہ کی کلاہ افتخار کو بھی مضطربانہ جُھکنا پڑا ہے۔ ایک ایسے وجود کا کونسل کی رُکنیت کے لئے اُمیدوار بننا

مسلمانان لاہور کے لئے علی الخصوص اور مسلمانانِ پنجاب کے لئے علی العموم بڑی ہی خوش قسمتی اور سعد بختی کا موجب ہے۔"

سر اقبال کی مُلکی و قومی خدمات کونسل میں

سر اقبال کونسل میں مسلمانوں کے نمائندہ بن کر گئے تھے۔ اُنہوں نے کونسل کے مختلف اجلاس میں کئی سوالات و استفسارات مسلمانوں کی ترقی و فلاح کے لئے کئے۔ لیکن اُنکا دل چونکہ ملکی درد سے لبریز ہے۔ خصوصاً غریب طبقہ (مزدور اور کاشتکار) کے ساتھ ان کو فطری اُنس و ہمدردی ہے۔ اس لئے اُنہوں نے زمینداران کے سود و بہبود اور اُن کے مالیہ کو کم کرانے اور انکم ٹیکس اور معاملہ اراضی میں فرق بتانے کے لئے کونسل کے قریباً ہر اجلاس میں نہ تو کوئی تحریک خود پیش کی ہے اور نہ کبھی اور محرک کی کسی تحریک کی تائید کی ہے اور تحریک و تائید کے وقت اپنی مدلل اور زبردست تقریروں سے بہت سے ممبروں کو اپنا ہم خیال بنالیا ہے۔

مُلک میں ایک طبقہ ایسا ہے جو حکومت کو مشکلات میں ڈالنے اور قوموں میں تفرقہ اور مُلک میں بدامنی پیدا کرنے کے لئے مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں پر کمینے حملے کرتا رہتا ہے آپ نے اس کے متعلق تحریک پیش کی۔ کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل سے سفارش کی جائے کہ بانیانِ مذاہب پر توہین آمیز، شرانگیز اور کمینہ حملوں کی اشاعت کا سدِّ باب کرنے کے لئے ایک ریگولیشن نافذ کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء ہی سے یہ قانون نافذ چلا آتا ہے۔ تلوار کو قانون اسلحہ ہند سے مستثنیٰ کرانے کی بھی آپ نے تحریک پیش کی۔ شراب کی لعنت کو دُور کرنے کے لئے یہ قرار داد پیش کی کہ شراب نوشی کے انسداد کی حکمت عملی کا منتہائے نظر امتناع تسلیم کیا جائے اور اس کی میعاد پندرہ سال سے متجاوز نہ ہو۔ نیلی بار۔ منٹگمری کے ضلع میں سوا تین لاکھ ایکڑ رقبہ سرکار نے فروخت کیا ہے۔ اس کا زیادہ حصّہ سرمایہ داروں

نے ہی خریدا ہے۔ اس کے متعلق علّامہ اقبال نے یہ تحریک پیش کی کہ اسکا نصف مزارعین یعنی کسانوں کے لئے جو اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں مخصوص کیا جائے۔

شہروں میں جب کوئی وبا پھیلتی ہے تو اُس کے سدِباب کے لئے سرکاری و غیر سرکاری ارکان کی ایک مجلس مقرر کی جائے جو دیہات میں حفظانِ صحت کے طریقوں کی ترقی کی رپورٹ پر غور کرے۔

زمینیں حکومت کی ملکیت نہیں بلکہ قوموں کی ملکیت ہوتی ہیں

۲۸ فروری ۱۹۳۲ء کے اجلاس کونسل میں وزیر مالیات نے جو میزانیہ پیش کیا۔ اُس پر علّامہ اقبال نے ایک زبردست تبصرہ کرتے ہوئے نظامِ محاصل کی بے ضابطگیوں کی نقاب کشائی کی اور تخفیف محاصل پر بحث کرتے ہوئے فرمایا۔ بے ضابطگی یہ ہے کہ زمین کے معاملہ میں یہ نظریہ قائم کر لیا جاتا ہے کہ ساری زمین ملکیّت حکومت ہے۔ اس ملکیّت عامہ کا دعویٰ نہ عہد قدیم میں کسی نے کیا اور نہ سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں ایسا مطالبہ پیش کیا گیا۔ یہ اس مسئلہ کا تاریخی پہلو ہے۔ جسے مجلس تحقیقات محاصل بھی تسلیم کر چکی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس ملک میں حکمران جماعت نے کبھی اس قسم کے حقوق کا مطالبہ نہیں کیا (نعرہ ہائے تحسین) ہمیں بتایا جاتا ہے کہ مغلوں نے ایسا دعویٰ کیا تھا لیکن پنجاب کے باشندے اس ملک کی زمین کے اُس وقت سے مالک چلے آتے ہیں جبکہ بابر کی نسل نے تاریخ کے ایوان میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔ اس سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ بادشاہتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں اور صرف قوم زندہ و سلامت رہتی ہے (نعرہ ہائے تحسین) اور اگر کسی وقت کسی ملک کے اندر یہ نظریہ رائج بھی تھا تو اس بیسویں صدی میں اُسے جائز نہیں مانا جا سکتا۔ اس وقت زمین کے ہر چھوٹے بڑے قطعہ کے لئے معاملہ لیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس انکم ٹیکس کے باب میں صلاحیت واستطاعت کے اصول یا مدارج

کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک تدریجی پیمانہ قائم ہے۔ بعض لوگوں سے قطعاً کوئی انکم ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ میری گذارش یہ ہے کہ کونسل کو اس اصول کی روشنی میں تخفیف محاصل کے مسئلہ پر نظر ڈالنی چاہیئے"۔ (نعرہ ہائے تحسین)

۱۹۲۸ء میں سرکاری ملکیت کا نظریہ پھر زیر بحث آیا۔ اس پر علامہ اقبال نے پھر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اس نظریہ پر سب سے پہلے جس یورپین مصنف نے تبصرہ کیا وہ پیرن تھا۔ ۱۸۸۷ء میں اس نے پوری تحقیق و تفتیش کے بعد اس نظریہ کو بالکل مسترد کر دیا۔ ۱۸۳۰ء میں بریگز نے ہندوستان کے اس ملکیت کے قانون و رواج کی پوری تحقیقات کی۔ یہ مصنف اپنی کتاب میں منوجی کے قوانین۔ اسلامی شریعت اور ہندوستان کے مختلف حصص بنگال، مالوہ پنجاب وغیرہ کے متعلق رواجی پابندیوں کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ تاریخ ہند کے کسی دور میں بھی سلطنت زمین کی ملکیت کی مدعی نہیں ہوئی"۔

پنجاب کے وزیر مالیات سے علامہ اقبال کی پُر لطف بحث

زمین کا لگان معاف یا کم کرانے اور انکم ٹیکس اور معاملہ اراضی کا فرق بتانے اور زمین کو سرکاری ملکیت سے مستثنیٰ قرار دینے پر علامہ اقبال کی تقریر بڑی زوردار اور بڑی طویل تھی۔ تقریر کے دوران میں فاضل رکن مالیہ آنریبل سر فضل حسین سے خطاب ہوتا تھا۔ ہم اس تقریر کے چند پُر لطف ٹکڑے ناظرین میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ رکن مالیہ نے اپنے دلائل میں دو باتوں پر زور دیا (۱) صوبہ کی ترقی کے لئے روپیہ کی اشد ضرورت ہے۔ (۲) حکومت کیمیا گری نہیں جانتی۔ اس کا جواب علامہ اقبال نے

اپنی تقریر کے دوران میں دیا اُس کا کوئی جواب نہیں ہو سکا۔ آپ نے فرمایا:۔

"میری رائے میں حکومت کو اس وقت تک کیمیا گری سیکھنے کی ضرورت نہیں جب تک کہ ملک کے تمام محنت کش کسان جن کا پسینہ مٹی کو سونا بنا دیتا ہے اُس کے قبضہ میں ہیں"۔

وزیر مال نے علامہ اقبالؔ کے دلائل سُن کر جب کہا کہ مالگذاری کا یہی طریق جاری رکھا جائیگا یا اسے بالکل چھوڑ دیا جائے گا۔ اس کے سوا تیسرا راستہ کوئی نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر اقبالؔ نے کہا اگر آپ اس امر کو تسلیم کر لیں کہ مالگذاری عاید کرنے کا یہ طریق غیر منصفانہ ہے تو اس بے انصافی کو دُور کرنے کے لئے کچھ علاج شروع کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کا علاج آپ نے یہ بتایا کہ ایک ایسے شخص کو جس کے پاس پانچ بیگہ سے زیادہ زمین نہیں بشرطیکہ زمین ایسے رقبہ میں نہ ہو جہاں آب پاشی نہیں کی جا سکتی اور اس کی پیداوار کی تعداد بھی معیّن ہو لگان معاف کر دینا چاہیئے۔ جب وزیر مال نے یہ خوف اور احتمال پیش کیا کہ یہ قرارداد مسوّدہ قانون مالگذاری کے شیر خوار بچّہ کی موت کا باعث بن جائیگی اور ارکان کونسل بچہ کشی کے جُرم کے مُرتکب ہونگے۔ تو آپ نے فرمایا، آجکل جیسا کہ منع حمل کی تدابیر پر عمل کیا جاتا ہے۔ کسی ایسے بچّہ کا قتل کر دینا جس کے متعلق ہمیں علم ہو کہ یہ بڑا ہو کر شریر ہو گا۔ نہایت معمولی بات ہے۔ میری رائے میں یہ مطالبہ کہ پانچ بیگہ تک کی زمین کا مالیہ معاف کر دیا جائے۔ کچھ بہت زیادہ نہیں ہے۔ ۲½ ایکڑ زمین والے شخص کا لگان معاف کرنے پر وزیر مالیات نے کہا کہ گناہ بے لذّت ہو گا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، اگر آپ گناہ بے لذّت کا ارتکاب کریں گے تو اتنا تو ثابت کر دینگے کہ آپ میں انصاف کا کچھ نہ کچھ احساس ہے۔

اخیر میں آپ نے کہا کہ حکومت کو چاہیئے کہ ان بے چاروں کے لئے کچھ کرے، جو اپنی زمین سے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کیلئے بھی پیداوار حاصل نہیں کر سکتے۔

سر اقبال اور خطۂ جنّت نظیر کشمیر

سر اقبال کو آج سارے جہان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ سارے جہان میں کشمیر کا چھوٹا سا ملک جو بارہ، تیرہ لاکھ فاقہ کشوں کا وطن ہے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم آپ نے اپنے وطن قدیم کے لحاظ سے اس غریب ملک اور اس غریب قوم کے لئے بھی اپنے قلب میں جو سمندر سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ تھوڑی بہت جگہ ضرور دی ہے۔ جو نظمیں آپ کی سب سے پہلے کسی اخبار یا رسالہ کی زینت ہوئیں۔ وہ کشمیر اور کشمیریوں کے متعلق ہی تھیں۔ انگلستان سے واپس آکر آپ پہلے کشمیری انجمن کے اور بعد ازاں آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کے سیکرٹری قرار پائے اسی زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ ظفروال کے ایک تحصیلدار نے ایک مقدمہ میں کشمیریوں کے متعلق مفسد اور بہادر کے لفظ لکھے واقعہ یہ تھا۔ کہ دس بارہ آدمیوں نے تین کشمیریوں پر مار پیٹ کا دعویٰ کیا۔ تحصیلدار نے فیصلہ میں لکھا کہ بظاہر یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ دس بارہ آدمی تین آدمیوں سے کس طرح مار کھا سکتے ہیں۔ لیکن عام طور پر چونکہ کشمیری مفسد اور بہادر پائے جاتے ہیں اس لئے میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ ان تین کشمیریوں نے اپنے سے چوگنی تعداد کے حریفوں کو زخمی نہ کر دیا ہو۔ ایک منچلے کشمیری نے اس فیصلہ کی مصدقہ نقل لے کر کانفرنس کے دفتر میں بھیجی کہ اس تحصیلدار نے ہم کو مفسد قرار دیا ہے۔ اس پر ہتک اور توہین کا مقدمہ قائم ہونا چاہیئے۔ سر اقبال سیکرٹری تھے۔ آپ نے فرمایا تحصیلدار نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ صحیح ہے، جو قوم بہادر ہے وہ ضرور مفسد ہے۔ اور جو مفسد ہے وہ بہادر اور دلیر ہے۔ اس فیصلہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا کشمیریوں کی طرف سے نہیں تھی۔ اس لئے وہ لا تفسدو فی الارض کی ذیل میں نہیں آسکتے۔ بلکہ انہوں نے قومی غیرت سے کام لے کر اپنی مدافعت کی ہے اس فیصلہ پر مقدمہ کی تجویز پاس نہ ہو سکی۔

نواب سرسلیم اللہ خاں جی۔سی۔آئی۔ای نواب آف ڈھاکہ جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں امرت سر تشریف لائے تھے تو کشمیریانِ پنجاب کی طرف سے سر اقبال نے ہی آپ کی خدمت میں خیر مقدم کا ایڈریس فارسی زبان میں پڑھا تھا۔

راقم الحروف نے کشمیر کے متعلق جس قدر کتابیں لکھی ہیں۔ان کو سر اقبال نے ہمیشہ پسند کیا اور اپنی زریں راؤں سے کتابوں کی وقعت کو دوچند کر دیا ہے۔میری اخباری خدمات اور تصنیفات متعلقہ کشمیر کی وجہ سے آپ نے مجھے بارہا مجدد الکشامرہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خطۂ کشمیر کے بارہ تیرہ لاکھ انسانوں کی تعلیمی و اخلاقی پستی کو دُور کرانے اور اُن لوگوں کو خوابِ غفلت سے جگانے والوں کی خدمات کو پسند فرماتے ہیں۔

مہاراجہ سر پرتاب سنگھ آنجہانی سے بھی ایک دو دفعہ مُلاقات کر چکے ہیں۔مہاراجہ نے کشمیر آنے اور سرکاری مہمان بننے کی دعوت بھی دی تھی۔ایک دفعہ کشمیر تشریف بھی لے گئے تھے۔وہاں اپنی آنکھوں سے کشمیر کی جو حالت دیکھی اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ نشاط باغ کی سیر میں جہاں سر اقبال ہر اہلِ دل کے دل کی ترجمانی کرتے ہُوئے فرماتے ہیں ؎

مشو لبے کتابے رُبابے نگارے

وہاں نشاط کی سیر کے دَوران میں بدنصیب کشمیریوں کی المناک حالت کے متعلق اسی نظم میں لکھتے ہیں ؎

کشیہری[1] کہ با بندگی خُو گرفتہ | بتے مے تراشد زسنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے | خودی نا شناسے زخود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنت او | نصیبِ تنش جامۂ تار تارے

---

[1] کشمیری کشمیر کو کشیر بھی کہتے ہیں۔ جیسے کشیر اندر رسٹھا تُور۔ کشمیر میں سخت سردی ہے۔ اسی لحاظ سے آپ نے کشمیری کو کشیری لکھا ہے۔

نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے / نہ در سینۂ او دلِ بے قرارے

ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری / کہ خاکسترش آفریند شرارے

غنیؔ شاہجہان کے زمانہ میں کشمیر کا نامور شاعر گذرا ہے جس کا سکّہ ہندوستان و ایران تک بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بادشاہ کے بُلانے پر بھی اس کے دربار میں نہیں گیا۔ اس کا قاعدہ تھا کہ جب اپنے مکان پر ہوتا تھا۔ تو دروازہ بند کر دیتا تھا۔ اور جب باہر جاتا تو دروازہ کھُلا چھوڑ دیتا تھا۔ کسی نے وجہ پُوچھی۔ تو کہا، متاعِ گراں تو مَیں ہی ہُوں۔ جب مَیں گھر میں نہیں، تو حفاظت کس کی۔ اس واقعہ کو سر اقبالؔ نے ذیل کی نظم میں کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

غنی آں سخن گوئے بُلبل صفیر / نوا سنجِ کشمیر مینو نظیر

چو اندر سرا بود در بستہ داشت / چو رفت از سرا تختہ را واگذاشت

یکے گفتش اے شاعرے دل رسے / عجب دارد از کارِ تو ہر کسے

بہ پاسخ چہ خوش گفت مردِ فقیر / فقیرو بہ اقلیمِ معنے امیر

زمن آنچہ دیدند یاراں رواست / دریں خانہ جز من متاعے کجاست

غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش / متاعِ گرانے است در خانہ اش

چو آں محفل افروز در خانہ نیست / تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست

سر اقبالؔ نے سیاحت کشمیر کے دوران میں ایک اور نظم بھی لکھی۔ وہ بھی اپنی روانی اور منظر آفرینی کی وجہ سے مشہور ہے ؎

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر / سبزہ جہاں جہاں بہ بیں لالہ چمن چمن نگر

باد بہار موج موج مرغِ بہار فوج فوج / صلصل و سار زوج زوج بر سرِ نارون نگر

تا نہ فتد بہ زینتش چشمِ سپہر فتنہ باز / بستہ بہ چہرۂ زمین برقعِ نسترن نگر

لالہ ز خاک بر دمید موج بہ آبِ جو تپید / خاک شرر شرر بہ بیں آب شکن شکن نگر

زخمہ بہ تار ساز زن بادہ بہ ساتگیں بریز / قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر

دخترکے برہمنے لالہ رُخے سمن برے   چشم بروے او کشا باز بہ خویشتن نگر

سر اقبال نے اہلِ کشمیر اور کشمیر کے متعلق اپنی طالب علمی (بی۔ اے) کے زمانہ میں جو رباعیات کہی ہیں وہ اُن کے مطبوعہ کلام میں نہیں ہیں۔ ہم یہاں چند درج کرتے ہیں۔

کہکشاں میں آکے اختر رِل گئے   اِک لڑی میں آکے گوہر رِل گئے
واہ وا کیا محفلِ احباب ہے   ہم وطن غربت میں آکر رِل گئے

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور   یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر   بُلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

سامنے ایسی گلستاں کے کبھی گر نکلے   جیبِ خجلت سے سرِ طور نہ باہر نکلے
ہے جو ہر لحظہ تجلی گہ مولائے جلیل   عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے

پنجۂ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا   بن کے مقراض ہمیں بے پر و بال کیا
توڑ اُس دستِ جفاکیش کو یارب جس نے   رُوحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

میاں علی بخش / چراغ حسن حسرت

ڈاکٹر اقبال

میں علی بخش موضع اٹل گڑھ ضلع ہوشیار پور کا رہنے والا ڈاکٹر صاحب کا قدیمی خادم ہوں۔ میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ اس لئے ٹھیک ٹھاک نہیں بتا سکتا کہ میں کب اُن کے پاس نوکر ہوا۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ جب میں اُن کے پاس آیا تو میری عمر چودہ سال کی تھی۔ اب میں پچاس یا پچپن سال کا ہوں گا۔ یا شاید اس سے ایک دو سال کم یا زیادہ۔ اس حساب سے میں کوئی اڑتیس یا چالیس سال اُن کے پاس رہا۔

کانگڑہ کا زلزلہ آپ کو یاد ہو گا۔ بس اُن دنوں مجھے ڈاکٹر صاحب کی نوکری میں پانچواں یا چھٹا سال تھا۔ اب آپ خود حساب کر لیجئے کہ مجھے اُن کی خدمت میں کے سال ہوئے۔ میں جب اٹل گڑھ سے لاہور آیا تو اسلامیہ کالج کے پرنسپل مولوی حاکم علی کو نوکر کی ضرورت تھی۔ مجھے ایک آدمی اُن کے پاس لے گیا اور چار روپے اور روٹی کپڑے پر مجھے اُن کے پاس نوکر کرا دیا۔ مولوی حاکم علی بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ اُن کے مکان کے سامنے ایک بالاخانہ تھا۔ جس میں اورینٹل کالج کے ایک پروفیسر صاحب رہتے تھے یہ بڑے گورے چٹے کسرتی بدن کے نوجوان تھے اور اُن کا نام شیخ محمد اقبال تھا۔ یہی شیخ اقبال آگے چل کر ڈاکٹر اقبال اور سر اقبال بنے اور اللہ نے اُن کو بڑا رتبہ دیا۔ مولوی حاکم علی سے اُن کا بڑا میل جول تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے۔

میری عمر اُس وقت تیرہ چودہ سال کی تھی۔ گاؤں سے نیا نیا آیا تھا اس لئے شہر کے طور طریقے نہیں جانتا تھا۔ شہر والوں کی بعض باتیں بھی میری سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ ایک دفعہ مولوی صاحب نے کہا، آج سالن میں انار دانہ ڈالنا۔ میں سمجھا بہی دانہ ڈالنے کو کہہ رہے ہیں کہیں پنساری کے ہاں سے ایک پیسے کا بہی دانہ لے آیا اور سالن میں ڈال دیا۔ اس بات کی بڑی شہرت ہوئی۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب نے بھی یہ قصّہ سُنا اور بہت ہنسے۔ پھر تو مجھے سب چھیڑنے لگے۔ ایک دن مولوی حاکم علی صاحب کہنے لگے کہ آج بتاشوں کا مُربّہ لے آنا میں سارا شہر پھر آیا۔ لیکن بتاشوں کا مُربّہ کہیں نہ ملا۔ جس دکاندار سے مانگتا تھا وہ بے اختیار ہنس پڑتا تھا۔

ایک دن میں کسی کام سے ڈاکٹر صاحب کے ہاں گیا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے علی بخش تُم میرے پاس کیوں نہیں چلے آتے۔ اگر تمہیں میری نوکری کرنا منظور ہو تو میں مولوی صاحب سے کہہ دوں۔ پہلے تو میں ہچر مچر کرتا رہا پھر حامی بھر لی۔ کہنے لگے اب تو جون کا مہینہ ختم ہونے کو ہے کچھ دنوں تک کالجوں میں تعطیلیں ہو جائیں گی۔ تعطیلیں ختم ہونے پر آنا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے اس معاملہ کی نسبت کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ تعطیلیں شروع ہوئیں تو میں گھر چلا گیا۔ اکتوبر میں واپس آ کر ڈاکٹر صاحب سے ملا تو وہ بولے بھئی علی بخش! تم نے مجھ سے چلتے وقت کوئی بات نہ کہی تھی۔ اس لئے مجھے یقین نہیں تھا کہ تم واپس آؤ گے۔ اب تو میں سیالکوٹ سے نوکر لے آیا۔ جب تک تمہیں نوکری نہیں ملتی یہیں رہو۔ میں تمہارا کوئی نہ کوئی انتظام کر دونگا۔ میں نے کہا، میرے کچھ ہم وطن لاہور میں رہتے ہیں میں اُنہیں کے پاس جا ٹھہروں گا۔ یہ کہہ کر میں چلا گیا۔ تھوڑے دن گذرے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے اُستاد مولوی میر حسن صاحب سیالکوٹی کے فرزند سید تقی شاہ صاحب پتہ پُوچھتے پُوچھتے میرے پاس آ پہنچے اور کہنے لگے کہ تمہیں شیخ صاحب نے بلایا ہے۔ بات یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب سیالکوٹ سے جو نوکر لائے تھے وہ بد دیانت نکلا، ڈاکٹر صاحب پہلے

تو طرح دیتے رہے کہ شاید سدھر جائے لیکن جب اُس کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا تو اُسے علیحدہ کر دیا اور پھر مجھے بلوا بھیجا۔

ڈاکٹر صاحب کی پہلی شادی جوانی میں ہی ہو گئی تھی۔ لیکن جس زمانے کا ذکر میں کر رہا ہُوں وہ اہل و عیال کو سیالکوٹ میں چھوڑ کر لاہور میں اکیلے رہتے تھے اور اُن کا کھانا میں ہی پکاتا تھا۔ پھر جب پکا ریندھ کر سامنے لا رکھتا۔ ڈاکٹر صاحب صبر و شکر کے ساتھ کھا لیتے تھے۔ یہ بات نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو اچھے کھانے کا شوق نہیں تھا۔

وہ ہمیشہ سے خوش خوراک تھے۔ دستر خوان پر ہمیشہ دو تین قسم کا سالن ضرور ہوا کرتا تھا۔ البتہ وہ کھاتے بہت تھوڑا تھے۔ عام طور پہ صرف ایک وقت کھانا کھاتے تھے بہت ہوا تو رات کو نمکین چائے پی لی۔ صبح کو چائے بھی نہیں پیتے تھے۔ اکثر اوقات کچھ کھائے پیئے بغیر کالج چلے جاتے تھے اور دوپہر کو آکے کھانا کھاتے تھے۔ خشکہ اُن کی طبیعت کو راس نہیں آتا تھا اسلئے عام طور پہ وہ روٹی ہی کھاتے تھے۔ آخر آخر میں صبح کو چائے بھی پینے لگے تھے اور پلاؤ بھی بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے۔ صبح کی نماز اور قرآن خوانی مدت سے اُن کا معمول تھا۔ قرآن بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ آواز ایسی شیریں تھی کہ اُن کی زبان سے قرآن سُن کر پتھروں کے دل پانی ہو جاتے تھے۔ بیماری کے زمانے میں قرآن پڑھنا چھوٹ گیا تھا۔ نماز بھی کم پڑھتے تھے۔ موت سے کچھ عرصہ پیشتر مجھ سے کہنے لگے، علی بخش میرا جی چاہتا ہے کہ آج نماز پڑھوں۔ میں نے کہا، آپ پلنگ پر بیٹھ جائیے میں آپکو وہیں بیٹھے بیٹھے وضو کرا دیتا ہوں۔ وضو کر چکے تو میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب میں نے کبھی حضور صاحب کو بیٹھے بیٹھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ خدا جانے کیا بات ہے۔ کہنے لگے ہاں مجبوری کی حالت میں یہ بھی جائز ہے۔

جن دنوں ہم بھاٹی دروازے میں رہتے تھے ایک دفعہ پورے دو مہینے بڑی باقاعدگی سے تہجد کی نماز پڑھتے رہے۔ اُن دنوں اُن کا عجب حال تھا۔ قرآن اس خوش آوازی کے

سانتہ پڑھتے تھے کہ جی چاہتا تھا بس سارے کام کاج چھوڑ چھاڑ کر اُنہیں کے پاس بیٹھا رہوں۔ اس زمانے میں کھانا پینا بھی چھوٹ گیا تھا۔ صرف شام کو تھوڑا سا دودھ پی لیتے تھے۔ خدا جانے اس میں کیا رمز تھی۔ جوانی میں ورزش بھی کرتے تھے۔ بھاٹی دروازے والے مکان میں تو صبح سویرے اُٹھ کر ڈنٹر پیلنا بھی شروع کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی مُگدر بھی ہلاتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اورینٹل کالج میں تھوڑے ہی دن رہے۔ وہاں سے گورنمنٹ کالج میں چلے گئے۔ اس زمانے میں سید تقی شاہ، بابو میر بخش، فقیر افتخار الدین اور شیخ عبدالقادر سے اُن کا بڑا میل جول تھا۔ مولوی حاکم علی سے بھی مُلاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن اُن کے وقت کا زیادہ حِصّہ لِکھنے پڑھنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ لکھتے کم تھے۔ پڑھتے زیادہ تھے۔ جس کمرہ میں وہ سوتے تھے اُس میں ایک بڑی میز پر کتابیں پڑی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی میں ان کتابوں کو ترتیب سے الماری میں رکھ دینے کا ارادہ کرتا تھا تو کہتے تھے انہیں پڑا رہنے دو۔ کانگڑے کے زلزلہ میں لاہور پر بھی بڑی آفت آئی۔ شہر میں بہت سے مکان گرے۔ ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا۔ میرا یہ حال تھا کہ کبھی گھبرا کر کوٹھے پر چڑھ جاتا۔ کبھی نیچے آ جاتا۔ جب زلزلہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹے کتاب پڑھ رہے تھے۔ لیکن جس طرح لیٹے تھے اُسی طرح لیٹے رہے۔ ذرا ہِلے جُلے تک نہیں، ہاں میری بے تابی دیکھ کر ایک دفعہ کتاب پڑھتے پڑھتے سر اُٹھایا اور کہنے لگے "علی بخش یوں بھاگے بھاگے نہ پھرو، سیڑھیوں میں کھڑے ہو جاؤ" یہ کہہ کر پھر اُسی اطمینان سے کتاب پڑھنے لگے۔

زلزلہ کے بعد مَیں گھر سے نکلا تو معلوم ہُوا کہ ڈاکٹر صاحب کے دوست شیخ عبدالقادر کا مکان گر پڑا۔ شیخ صاحب اُس وقت ولایت میں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ خبر سُن کر بہت افسوس ہُوا اور اُسی وقت اُنہیں یہاں کے سارے حالات لکھ بھیجے۔

ایک دفعہ میں نے دیکھا، ڈاکٹر صاحب پلنگ پر بیٹھے ہیں۔ سامنے کاغذ اور پنسل ہے کبھی کچھ سوچنے لگتے ہیں۔ کبھی کاغذ پر پنسل سے کچھ لکھ لیتے ہیں۔ کبھی پیشانی پر بَل پڑے ہوتے ہیں اور سر جُھکا ہوتا ہے، کبھی ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ اور آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہے ہیں۔ اس وقت تو

میری سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب شاعر ہیں اور اُن کے شعر کہنے کا یہی انداز ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ شعر، شاعر اور شاعری کا مطلب بہت دیر کے بعد میری سمجھ میں آیا۔ شعر کہتے وقت ڈاکٹر صاحب کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے لیٹ جاتے بار بار پہلو بدلتے۔ پھر اُٹھ بیٹھتے، کبھی چہرہ پر اضطراب ہوتا تھا، کبھی لبشاشت، اُن کے پلنگ کے پاس ایک میز ہوتی تھی۔ اُس پر ایک کاپی پڑی رہتی تھی۔ جب شعر کہنے کو طبیعت چاہتی، لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ملنے کو آجاتا تھا تو اُسے شعر لکھوا دیتے تھے۔ ایک دفعہ شیخ عبدالقادر کو شعر لکھوانے شروع کئے۔ اور دونوں ساری رات بیٹھے لکھتے لکھاتے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے نظم ختم ہوگئی۔ یہ نظم انجمن کے جلسے میں پڑھی گئی۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ کون سی نظم تھی؟ شکوہ؟ نہیں شکوہ نہیں تھا ——— شکوہ جس جلسے میں پڑھا گیا۔ اُس میں میں بھی موجود تھا۔ ابھی ڈاکٹر صاحب نے چند شعر ہی پڑھے تھے کہ ایک بوڑھے آدمی نے جس کے بال رُوئی کی طرح سفید تھے، اِلّا اللّٰہ کہا اور جلسہ گاہ کے درمیان آگیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر لوگوں پر بہت اثر ہوا کوئی شخص الیسا نہ تھا جس کی آنکھوں میں آنسو نہ ہوں۔

میں پڑھا لکھا نہیں ہُوں اور نہ ڈاکٹر صاحب کے شعروں کا مطلب سمجھ سکتا ہوں، اُن کی باتوں میں ایسی رمزیں ہیں کہ اللہ والے ہی انہیں سمجھ سکتے ہیں، مگر "شکوہ" کے کچھ شعر مجھے بھی یاد ہیں اور اسی زمانے سے یاد ہیں۔

علی بخش نے یہاں پہنچ کر شکوہ سُنانا شروع کر دیا۔ اس وقت رات کی تاریکی پُوری طرح جاوید منزل پر چھا چکی تھی۔ یہ سپید پایوں والی عمارت تاریک فضا میں سر اُٹھائے کچھ سوچتی اور غور کرتی معلوم ہوتی تھی۔ میں اور علی بخش آمنے سامنے چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ اُس کے پہلو میں ڈاکٹر صاحب کا دُوسرا ملازم رحمان بیٹھا تھا۔ میں نے کہا، میاں علی بخش" اُس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کا لباس کیا تھا؟

وہ کہنے لگا: ان دنوں ڈاکٹر صاحب عام پنجابیوں کی طرح شلوار اور قمیض پہنتے

تھے۔ قمیض پر کوٹ۔ نہیں فراک نہیں۔ یہی عام کوٹ جو آپ اور ہم پہنتے ہیں، لیکن اتنا چھوٹا نہیں البتہ جاڑے میں وہ بند گلے کا فراق پہنتے تھے۔ سر پر سپید ململ کی پگڑی ہوتی تھی۔ موتیے رنگ کی پگڑی ہوتی تھی۔ موتیے رنگ کی پگڑی کا بھی شوق تھا۔ بعد میں ترکی ٹوپی بھی اوڑھنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب نے ولایت جانے سے پہلے سوٹ کبھی نہ پہنا۔ اور سوٹ بھی کبھی کبھار ہی پہنتے تھے۔ ورنہ انہیں دل سے دیسی لباس ہی پسند تھا۔ ان دنوں گوجر سنگھ کے قلعہ میں نظام الدین نام کا ایک بڈھا درزی تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کپڑے اُسی سے سلواتے تھے۔ ویسے بھی ڈاکٹر صاحب سے بڑی محبت تھی اور اُن کے کپڑے بڑی محنت سے سیا کرتا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا۔ علی بخش میں شیخ صاحب سے بہت ڈرتا ہوں۔ بھئی آخر شاعر ہیں۔ کہیں غصّہ میں آکر میرے خلاف ایک آدھ شعر لکھ دیں۔ تو میں کہیں کا نہ رہوں۔

سچ پوچھئے تو ڈاکٹر صاحب کو اچھے لباس کا شوق نہیں تھا۔ جیسا کپڑا کسی نے لا دیا پہن لیا۔ کپڑے پسند کرنے کا کام یا منشی طاہر الدین کے سپرد تھا۔ یا میرے۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ کپڑا اچھا نہیں، اس کا رنگ خراب ہے۔ اصل میں انہیں ان چیزوں کی پروا ہی نہیں تھی۔ بیماری کے زمانے میں کچھ انگریز سوداگر قالین لے کے آئے۔ ظاہر اُن کے رنگ بہت شوخ اور خوبصورت تھے۔ اُس وقت جتنے لوگ پاس بیٹھے تھے۔ سب نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب انہیں خرید لیجئے۔ غرض بارہ سو روپیہ کے قالین خریدے گئے لیکن کوئی مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد معلوم ہوا۔ کہ یہ کمبخت دُگنی تگنی قیمت لے گئے ورنہ قالین بہت گھٹیا ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب نہایت باقاعدگی سے رکھتے تھے۔ منشی طاہر الدین کے پاس آج بھی تیس پینتیس سال کا سارا حساب لکھا ہوا موجود ہے۔ کیا مجال ہے کہ اُس میں ایک پائی کا فرق ہو۔ منشی طاہر الدین کو آپ جانتے ہوں گے۔ وہ مُدّت تک ڈاکٹر صاحب کے پاس رہے ہیں۔ جب ڈاکٹر صاحب وکالت کرتے تھے تو سارا کام کاج منشی جی کے سپرد تھا لیکن اُنہوں نے وکالت چھوڑ دی تو منشی جی نے اپنا علیحدہ کاروبار شروع کر دیا۔ لیکن آخری

وقت تک حساب (کتاب) انہی کے سپرد رہا۔ پریکٹس چھوڑ دی تو منشی جی کو جو تنخواہ ملتی تھی وہ بھی بند ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب تو انہیں اس حالت میں تنخواہ دینا چاہتے تھے مگر انہوں نے یہ بات منظور نہ کی۔

ڈاکٹر صاحب کے ولایت جانے سے کچھ عرصہ پہلے اُن کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب پر جو اُن دنوں فورٹ سنڈیمن میں انجنیئر تھے۔ ایک مقدمہ بن گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو اس سلسلہ میں بلوچستان جانا پڑا۔ میں بھی اُن کے ساتھ تھا۔ "بلبل کی فریاد" جو اُن کی مشہور نظم ہے۔ انہوں نے راستہ میں ہی لکھی تھی۔ مقدمہ بہت دیر چلا۔ آخر شیخ عطا محمد بری ہو گئے۔ شاید اسی مقدمہ کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو قانون کی طرف توجہ ہوئی اور انہوں نے بیرسٹری کی تعلیم کے لئے ولایت جانے کا ارادہ کیا، کچھ روپیہ انہوں نے خود جمع کر رکھا تھا۔ کچھ شیخ عطا محمد سے لیا۔ اور ولایت روانہ ہو گئے۔ کانگڑہ کا زلزلہ کس سال آیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں۔ تو زلزلہ سے کوئی سال بھر بعد یعنی ۱۹۰۶ء میں وہ ولایت گئے ہوں گے۔

اصل میں ڈاکٹر صاحب دُنیا دار آدمی نہیں تھے۔ اور دُنیا والوں کے اینچ پینچ اور اُلٹ پھیر انہیں نہیں آتے تھے۔ وہ کبھی اپنے پاس روپیہ پیسہ نہیں رکھتے تھے۔ منشی طاہر الدین اُن کے خزانچی تھے اور اُن کے ہاتھوں روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ مجھے کئی دفعہ اُن کے ساتھ سفر کا اتفاق ہوا۔ سفر میں روپیہ پیسہ بلکہ ریلوے کا ٹکٹ تک میرے پاس رہتا تھا۔ اپنے پاس وہ پھوٹی کوڑی تک نہیں رکھتے تھے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ انہوں نے جو نظمیں کہی ہیں۔ انہیں چھاپ کر فروخت کیا جا سکتا ہے۔ کچھ نظمیں شیخ عبدالقادر چھاپنے کو لے جاتے تھے۔ کچھ مولانا ظفر علی خان کے اخبار میں چھپ جاتی تھیں۔ اُن دنوں منشی فضل الٰہی مرغوب رقم ایک خوشنویس ہوا کرتے تھے انہوں نے بھی ڈاکٹر صاحب کی بہت سی نظمیں کتاب کی صورت میں چھاپیں اور ہزاروں روپے کمائے۔ اور شاید انہیں کبھی کتابیں چھاپنے کا خیال ہی نہ آتا۔ بھلا ہو

چودھری محمد حسین صاحب کا جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو یہ بات سمجھائی۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاں چودھری صاحب کا آنا جانا مدّت سے ہے جب وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں بھی اکثر آیا کرتے تھے۔ لیکن جب وہ کالج چھوڑ کر ملازم ہوئے تو روزانہ آنے لگے۔ شاید ہی کبھی ایسا اتّفاق ہوا ہو کہ چودھری صاحب نہ آئے ہوں ورنہ مینہہ آئے یا آندھی چودھری صاحب ضرور شام کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پہنچ جاتے تھے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی پہلی کتابیں ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے خود چھاپیں۔ ان کے بعد تو سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ "بانگِ درا" چھاپنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کو بڑی محنت کرنی پڑی۔ "بانگِ درا" کی ساری نظمیں مختلف اخباروں اور رسالوں میں چھپ چکی تھیں اور اِن میں سے اکثر ایسی تھیں جن کی نقل بھی ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود نہیں تھی۔ البتہ بہت سے لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کا کلام جمع کر رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے یہ ساری نظمیں جمع کی گئیں اور بہت سی کانٹ چھانٹ کے بعد اُنہیں چھاپا گیا تھا۔

مجھے ڈاکٹر صاحب سے کچھ ایسا لگاؤ ہو گیا تھا کہ اُن کے جانے کے بعد کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن پیٹ بُری بلا ہے۔ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر چارہ بھی نہیں۔ میں اسلامیہ کالج کے ہوسٹل میں نوکر ہو گیا۔ یہاں کی زندگی بڑی روکھی پھیکی تھی۔ میرا جی کسی کام میں نہیں لگتا تھا۔ پھر بھی لستم پستم گزر ہوتی رہی۔ اُسی زمانے میں میرے ہاں چوری ہو گئی۔ میرے پاس رکھا ہی کیا تھا لیکن جو تھوڑی بہت نقدی اور چند کپڑے تھے۔ وہ میرے لئے ہزاروں لاکھوں روپے کے برابر تھے۔ بڑا دکھ ہوا۔ مگر اپنی بپتا کسے سناتا۔ لے دے کے ایک شیخ صاحب کا سہارا تھا سو وہ بھی یہاں نہیں تھے۔ ایک دن خیال آیا کہ ڈاکٹر صاحب کو خط لکھنا چاہیئے اور کچھ نہیں تو دل کی بھڑاس نکل جائے گی۔ حوصلہ بندھے گا۔ چنانچہ ان کا پتہ پوچھ کے خط لکھوایا میں جس طرح لکھواتا گیا۔ خط لکھنے والا لکھتا گیا۔ خط ڈاک میں ڈالا تو جی کی بے کلی آدھی رہ گئی کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹر صاحب کا جواب آیا۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ مجھے بڑا افسوس ہے

لیکن میں یہاں سات سمندر پار بیٹھا ہوں، تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ خیر فکر نہ کرو۔ کچھ دن گذر گئے۔ باقی جو ہیں وہ بھی گذر جائیں گے۔ خدا نے چاہا تو میں تھوڑے عرصے میں لاہور پہنچ رہونگا۔ یہ خط پڑھ کر دل کو بڑی تسلی ہوئی اور میں نے اسے بہت سنبھال کر رکھ دیا۔ میں پڑھنا تو نہیں جانتا۔ اُردو ہو یا انگریزی میرے لئے آڑی ترچھی لکیریں ہیں۔ لیکن کبھی کبھی میں یہ خط نکال کر دیکھا کرتا تھا۔ اب بھی یہ خط میرے سامان میں کہیں نہ کہیں پڑا ہو گا۔ کسی دن فرصت ملی تو اُسے ڈھونڈوں گا۔

ڈاکٹر صاحب ولایت سے آئے تو آتے ہی سیالکوٹ چلے گئے۔ میں اُس زمانے میں اسلامیہ کالج چھوڑ کے ایک اور جگہ نوکر ہو گیا تھا۔ اس لئے مجھے اُن کے آنے کی خبر نہ ملی۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی لوگوں سے میرے متعلق پچھوایا۔ مگر انہیں بھی کوئی پتہ نہ لگا۔ آخر سیالکوٹ سے اُنہوں نے اپنے ایک دوست کے نام خط لکھا کہ جب میں ولایت گیا تھا تو میرے پاس علی بخش نام کا ایک لڑکا ہوشیار پور کے علاقے کا رہنے والا نوکر تھا۔ اُس کا کوئی اتا پتا معلوم ہو تو مجھے لکھو۔ اُنہوں نے تلاش کرتے کرتے ایک دن میرا اتا پتا معلوم کر لیا اور مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں اور تمہیں بلاتے ہیں۔ میں گھر پہ گیا تو وہاں نہیں تھے۔ معلوم ہوا کچہری چلے گئے ہیں۔ میں پہنچا تو دُور سے ڈاکٹر صاحب دروازے سے باہر نکلتے دکھائی دیئے۔ میں دوڑ کر قریب پہنچا تو بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ پھر خیریت پوچھی اور کہنے لگے کہ تم آج ہی اپنا بوریا بدھنا اُٹھا کے چلے آؤ۔

ڈاکٹر صاحب پہلے بھاٹی دروازے حکیم شہاب الدین کے مکان میں رہتے تھے۔ ولایت سے آنے کے بعد یہ مکان چھوڑ دیا۔ پہلے گلاب سنگھ کے چھاپہ خانے کے پاس کوئی تین مہینے رہے پھر انار کلی اُٹھ آئے۔ ولایت سے آنے کے بعد اُن کو گورنمنٹ کالج سے پانچ سو روپے ماہوار ملنے لگے۔ اس کے علاوہ انہیں پریکٹس کی بھی اجازت تھی۔ انہیں کالج سے جو ملتا تھا۔ وہ گھر بھیج دیتے تھے اور وکالت کی آمدنی پر گذارا کرتے تھے۔

آپ بار بار ڈاکٹر صاحب کے پُرانے دوستوں اور ملنے والوں کے حالات پوچھتے ہیں

کچھ لوگوں کے نام تو میں بتا چکا ہوں۔ لیکن مولوی احمد دین اور مولانا گرامی کو بھول گیا۔ مولوی احمد دین مشہور وکیل اور ڈاکٹر صاحب کے پڑوسی تھے۔ وہ بڑے پڑھے لکھے آدمی تھے اور پہروں ڈاکٹر صاحب کے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ گرامی میرے ہم وطن یعنی ہوشیار پور کے رہنے والے دکن والے نظام کے درباری شاعر، ڈاکٹر صاحب کو اُن سے اور اُن کو ڈاکٹر صاحب سے بڑی محبت تھی۔ خدا بخشے گرامی بڑے مزے کے آدمی تھے۔ ان کی صورت شکل سے بالکل معلوم نہیں ہوتا تھا کہ انہیں اپنا نام لکھنا بھی آتا ہے، بالکل جاٹ معلوم ہوتے تھے۔ وہی جاٹوں کا پگڑ، وہی تہ بند۔ اُن کی طبیعت بھی دُنیا سے نرالی تھی۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ خوش ہیں تو خوش ہیں۔ بگڑ گئے تو بگڑ گئے۔ جہاں صبح بیٹھے ہیں بیٹھے بیٹھے شام کر دی اور چل نکلے تو مجال کہ رُکیں۔ جب کبھی ہوشیار پور سے آتے ڈاکٹر صاحب کے ہاں ہی ٹھہرتے۔ اور کئی کئی ہفتے رہتے۔ ڈاکٹر صاحب ان کی طبیعت سے واقف تھے اسلئے اس بات کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ کہیں انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اُن سے پوچھ لیا جاتا کہ مولانا رات کو کیا پیجئے گا؟ دُودھ یا چائے! مولانا فرماتے ہیں، تو بھئی دُودھ پیوں گا۔ ڈاکٹر صاحب اُن کے لئے دُودھ رکھوا دیتے، لیکن ساتھ ہی مجھ سے کہہ دیتے کہ بھئی علی بخش چائے کا انتظام بھی کر رکھو، اِن کا کیا ہے؟ خُدا جانے کب چائے مانگ بیٹھیں! یہ خیال دُرست ثابت ہوتا، یعنی رات کو جب میں اُن سے پوچھتا کہ مولانا دُودھ لاؤں؟ تو وہ فرماتے: دُودھ نہیں! میں دُودھ نہیں پیوں گا، بلوانا ہو تو چائے پلواؤ۔ کبھی کبھی آدھی رات کو چائے کی طلب اُنکو پریشان کر دیتی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میں رات کے دو تین بجے بازار گیا۔ حلوائی کی دکان کھلوائی دُودھ لایا اور چائے بنا کر مولانا کو پلائی۔

گرامی صاحب کو سنگترے بہت مرغوب تھے۔ میں بازار جاتا تو کہتے تھے۔ میرے لئے ناگپوری سنگترے لانا۔ میں سنگترے لاتا تو کہتے ارے میاں یہ سنگترے تو بہت چھوٹے چھوٹے ہیں اور کھٹے بھی تو میں آئندہ ایسے سنگترے نہ لانا۔ میں دُوسری دفعہ جاتا تو دیسی سنگترے

لے آتا انہیں دیکھ کر کہتے یہ بڑے بڑے سنگترے کیا اُٹھا لائے۔ یہ تو کسی کام کے نہیں! ناگپوری سنگترے لایا کرو۔ میں پُوچھتا مولانا آج کیا کھایئے گا۔ فرماتے آج دسترخوان پر شلغم ضرور ہوں۔ جب دسترخوان بچھتا تو کہتے میاں تمہیں بازار میں کوئی اور سبزی نہیں ملتی۔ دِن کو شلغم، رات کو شلغم، تم تو شلغم کھِلا کھِلا کے بیچارے گرامی کو مار ڈالو گے۔ گرامی کو اچھے اچھے کھانوں کا شوق تو تھا لیکن بہت تھوڑا کھاتے تھے۔ دسترخوان پر تین چار سالن موجود ہوتے تھے۔ روٹی کا ایک ایک ٹکڑا سب میں ڈبو ڈبو کر کھاتے اور ہاتھ دھو کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

اُن دنوں ہوشیار پُور تک ریل نہیں بنی تھی۔ لوگ تانگوں اور ٹمٹموں پر ہوشیار پُور سے جالندھر تک آیا جایا کرتے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ مولانا گرامی لاہور یا دکن کا ارادہ کر کے گھر سے نکلے ہوشیار پُور سے جالندھر تک تانگے میں آئے لیکن جالندھر پہنچے تو ریل گاڑی کو دیکھ کر یکایک نیّت بدل گئی اور انہیں قدموں واپس لوٹ گئے۔

ڈاکٹر صاحب کو ولایت سے آئے کوئی ڈھائی تین سال ہوئے تھے کہ اُنہوں نے یکایک ملازمت چھوڑ دی۔ اُن کے سب ملنے والوں کا خیال تھا کہ نوکری چھوڑنے میں اُنہوں نے غلطی کی ہے کیونکہ اس طرح انہیں ہر مہینے ایک بندھی رقم مِل جاتی تھی اور پھر آگے چل کر ترقی کے بھی بہت مواقع تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو نوکری چھوڑنا ہی اچھا معلوم ہوا۔ جس دِن وہ استعفےٰ دے کر آئے۔

میں نے پوچھا: کہ شیخ صاحب آپ نے نوکری کیوں چھوڑ دی۔ کہنے لگے: علی بخش! انگریز کی ملازمت میں بڑی مشکلیں ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ میرے دل میں کچھ باتیں ہیں جنہیں میں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ مگر انگریز کا نوکر رہ کر انہیں کھُلم کھُلا نہیں کہہ سکتا۔ اب میں بالکل آزاد ہوں، جو چاہوں کروں اور جو چاہوں کہوں۔

شاید یہ پھانس جو مدّت سے میرے دل میں کھٹکتی ہے، اب نکل جائے، ہمارے علاقہ میں بچپن کی شادیوں کا بہت رواج ہے۔ میری شادی بھی بچپن میں ہو گئی تھی۔ جب تک میری

عمر چھوٹی تھی۔ سسرال والے چپکے بیٹھے رہے۔ مگر جب میں بڑا ہوا تو انہوں نے کہا کہ بیوی کو لے جاؤ۔ غرض گونے کی رسم ادا کی گئی اور میں بیوی کو جا کے لے آیا۔ کچھ دن میں گھر پہ رہا پھر بیوی کو اٹل گڑھ چھوڑ کر لاہور چلا آیا۔

میرے رشتہ داروں کو میرا لاہور رہنا پسند نہیں تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ تم اب گرہستی دار ٹھہرے۔ لاہور کو چھوڑ دو، اور یہیں آکے رہو۔ نوکری میں ہزار آرام سہی، مگر گھر سا آرام کہاں؟ کئی دفعہ میرا جی بھی نوکری چھوڑ گھر چلے جانے کو چاہا، لیکن ڈاکٹر صاحب سے یہ بات کہنے کا حوصلہ نہ پڑا۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب دن بھر کے کاموں سے فرصت پاکر گھر آئے اور کھانا کھاکر حقہ پینے لگے۔ میں نے جی کڑا کر کے کہا: شیخ صاحب، میں گھر چلا جانا چاہتا ہوں۔

وہ حقہ پیتے پیتے رک گئے اور کہنے لگے: کیوں خیر ہے؟

میں نے کہا: اب میرا جی لاہور میں نہیں لگتا۔ جی چاہتا ہے۔ گھر چلا جاؤں اور باقی عمر اپنے کنبہ میں گزار دوں۔

ڈاکٹر صاحب بولے: کیا تم نے سچ مچ ارادہ کر لیا ہے؟

میں نے کہا: جی ہاں!

انہوں نے تین بار یہی بات پوچھی اور میں نے ہر بار جواب میں یہی کہا کہ میں اب لاہور میں نہیں رہ سکتا۔

وہ کہنے لگے: اچھا، کب جاؤ گے؟

میں نے کہا: اجازت ہو تو ابھی چلا جاؤں۔

فرمایا: تمہاری مرضی۔

میں نے بوریا بندھنا اٹھایا اور اجازت چاہی تو کہنے لگے: علی بخش میرا جی چاہتا ہے کہ تم میرے پاس ہی رہو۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پھر کہنے لگے "میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ تمہیں نہ جانے دوں ہاں اگر تم چھٹی لے کر جانا چاہو تو اور بات ہے۔ جب جی چاہے گھر ہو آؤ۔ کوئی روکتا تھوڑے ہی ہے۔ بلکہ اچھا تو یہ ہے کہ سال میں کچھ عرصہ چھٹی کا مقرر کر لو اور یہ دن اپنے گھر گذارا کرو۔" میں نے ارادہ تو بڑا پکا کیا تھا کہ اب لاہور میں نہیں رہونگا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی باتیں سُن کر ارادہ ٹوٹ گیا اور جب اُنہوں نے پوچھا، کیوں یہ بات منظور ہے تو میری زبان سے صرف اتنا نکلا، جی ہاں شیخ صاحب! وہ پھر کہنے لگے، کیوں اب مجھے چھوڑ کے نہیں جاؤ گے؟

کئی سال تو یونہی ہوتا رہا کہ میں کچھ دِنوں کے لئے گھر چلا جاتا تھا۔ پھر یکایک میری بیوی کا انتقال ہو گیا۔ لوگوں نے کہا، تم ابھی جوان ہو۔ دُوسرا بیاہ کر لو۔ ایک دو جگہ سے ناطہ کی بات بھی آئی۔ مگر میں نے پھر شادی نہیں کی اور ڈاکٹر صاحب کے قدموں میں عمر گذار دی۔ ڈاکٹر صاحب نے کبھی مجھے بُرا بھلا نہیں کہا۔ ایک دفعہ اُن کے بھانجے نے مجھے گالی دی تو اس پر سخت ناراض ہوئے، بلکہ اُسے پیٹا بھی۔ البتہ دو تین دفعہ مجھ پہ خفا ضرور ہوئے اور یہ خفگی بھی تھوڑی دیر میں جاتی رہی۔ کوئی سال بھر ہوتا کہ ایک سکھ ڈاکٹر صاحب کے ہاں آیا۔ اُن کے ہاں ہر قسم کے لوگ آتے تھے۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اُس نے آتے ہی گلاس مانگا اور بغل سے بوتل نکال گلاس میں شراب اُنڈیل غٹاغٹ چڑھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو تاب کہاں۔ سخت خفا ہوئے اور کہنے لگے تم نے اس کم بخت کو گلاس کیوں لا دیا اور جب وہ شراب پینے لگا تھا تو اُسے روکا کیوں نہیں؟ اس واقعہ کے سوا ڈاکٹر صاحب عمر بھر میں کبھی مجھ سے ناراض نہیں ہوئے۔

عبدالمجید سالک

اقبال کا اسلوبِ زندگی

علامہ اقبال علومِ مغربیہ کے فاضلِ اجل، انگریزی زبان کے بہترین انشاپرداز اور یورپ کی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہونے کے باوجود مغربی زندگی سے حیرت انگیز طور پر محفوظ تھے ان کی زندگی نہایت سادہ تھی، ان کا ذہن کاملاً مشرقی اور فکر قطعی طور پہ اسلامی تھا۔ آجکل کے معمولی معمولی "ولایت پلٹ" لوگ جن کو علم و ثقافت سے دُور کا لگاؤ بھی نہیں ہوتا نہ صرف مغربی اسلوب زندگی اختیار کر لیتے ہیں، بلکہ اُس کالے آدمی سے بات کرنا بھی ہتک سمجھتے ہیں جو گوروں کے ملک میں کبھی نہیں گیا۔ لیکن اقبال اس اثر سے بالکل آزاد تھا۔ مغربی تعلیم اور جدید فلسفے کے سمندر کا شناور ہونے کے باوجود اس کی مشرقی سادگی اور اسلامی ذہنیت وہی رہی جو اکابر مشرق کی کتابوں اور بزرگان اسلام کی نگاہوں نے اس میں پیدا کر دی تھی۔ اقبال کی خوراک نہایت سادہ تھی۔ نوجوانی کے زمانے میں بھی چٹوراپن سے انہیں کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ایک دفعہ کہنے لگے کہ جب میں پہلے پہل لاہور آیا تو علی بخش میرے ساتھ تھا، لیکن تھا بالکل جانگلو۔ اتّفاق سے اس نے کسی سے آلو گوشت پکانا سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ صرف آلو گوشت ہی پکا کر میرے آگے رکھ دیتا تھا۔ صبح آلو گوشت، شام آلو گوشت، یہاں تک کہ چار پانچ مہینے گذر گئے۔ اس دوران میں احباب کی دعوتوں کے سوا ہم نے مسلسل آلو گوشت ہی پہ گذران کی اور علی بخش نے بھی کوئی اور سالن

پکانا نہ سیکھا۔ بعد میں علی بخش بعض کھانے اچھی طرح پکانے لگا۔ لیکن اقبال اس کے آلو گوشت کو عمر بھر نہ بھول سکے۔ زندگی کے آخری سالوں میں علالت طبع کی وجہ سے اقبال کی خوراک بہت برائے نام رہ گئی تھی لیکن اس سے قبل بھی صبح کلچہ یا باقرخانی حلوے کے ساتھ کھا کر کشمیری چائے پی لیا کرتے تھے اور گرمی کے موسم میں چائے کی جگہ دہی کی لسی نوش فرماتے تھے، دوپہر کو سبزی گوشت اور ایک دو چپاتیاں، تیسرے پہر کچھ نہیں، رات کو پھر وہی سالن اور چپاتیاں، پلاؤ اور کباب بہت پسند تھے۔ لیکن کبھی کبھی کھاتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ Pan - Islamic dishes ہیں۔ چین سے مراکش تک کہیں چلے جاؤ، پلاؤ اور کباب ہر جگہ ملیں گے۔ دہی بھی بہت پسند تھا۔ دلیا دودھ ڈال کر اکثر کھا لیتے تھے۔ کبھی کبھی تیسرے پہر ایک چھوٹا سا چوزہ مسلّم پکوا لیتے اور ایک چپاتی کے ساتھ دو تین گوشت کے ٹکڑے کھا کر دسترخوان بڑھوا دیتے۔ کھانا کھانے کا عام انداز یہ تھا کہ علی بخش ایک سینی میں سالن کی ایک رکابی اور دو تین ہلکی سی چپاتیاں رکھ کر لے آیا۔ اقبال بستر پر سیدھے ہو بیٹھے۔ علی بخش نے بستر ہی پر ایک رومال بچھا کر اس پر سینی رکھ دی۔ علامہ نے پاس بیٹھے ہوئے دوستوں کو صلا دی اور کھانا شروع کیا۔ علی بخش پانی لئے بیٹھا رہا۔ ایک آدھ چپاتی کھا کر علامہ نے فرمایا "اٹھاؤ"۔ علی بخش نے سینی اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔ چلمچی آفتابہ آگے کر دیا اور علامہ کے ہاتھ دھلوا دیتے۔ رات کو نمکین کشمیری چائے بہت پابندی سے پیتے تھے۔ آخری سالوں میں رات کا کھانا موقوف ہو گیا تھا۔ لیکن کشمیری چائے کا دور ضرور چلتا تھا۔ جس میں ان کے نیاز مند بھی اکثر شامل ہو جایا کرتے تھے۔

پھلوں میں آم بے حد پسند تھے۔ موسم آنے پہ بازار سے بھی منگاتے، دوست احباب بھی بھیجتے۔ چنانچہ ایک دفعہ اکبر الہ آبادی کے پارسل کی رسید دیتے وقت یہ شعر لکھ بھیجا تھا:

نرے فیضِ مسیحائی کا ہے یہ سب اثر اکبر
الٰہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

سال بھر میں ایک آدھ دفعہ میاں نظام الدین مرحوم کے باغ میں آموں کی دعوت ہوتی، جس کی "صدارت" علامہ فرماتے اور ہم لوگ صبح سے جو آم کھانا شروع کرتے تو ایک بجے کی خبر لاتے۔ بہترین دانے علامہ کی خدمت میں پیش کئے جاتے اور آموں کے متعلق وہ وہ معنی آفرینیاں ہوتیں کہ باغ قہقہہ زار بن جاتا۔

آخری علالت کے دوران جب دہلی کے حکیم نابینا صاحب مرحوم کا علاج جاری تھا حکیم صاحب نے آموں سے پرہیز کا حکم دیا۔ آخر علامہ کے اصرار پر صرف ایک آم روزانہ کھا لینے کی اجازت دیدی۔ ایک دن میں تیسرے پہر حاضر ہوا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت علامہ بدستور تکیہ لگائے چارپائی پر لیٹے ہیں اور پاس ہی ایک تپائی پہ کوئی سیر بھر کا "بمبئی آم" پلیٹ میں رکھا تھا۔ میں نے کہا حضرت یہ کیا؟ حکیم صاحب نے پرہیز بتایا ہے۔ کہنے لگے ہاں، لیکن ایک آم کھانے کی تو اجازت ہے۔ اور بہرحال یہ آم ایک ہی ہے، دو تو نہیں ہیں۔ جن دنوں جاوید اور منیرہ کے لئے ایک جرمن گورنس مقرر ہوئی، تو علامہ نے گھر بھر کا انتظام اُسی کے سپرد کر دیا۔ وہ بچوں کو خوش کرنے کے لئے کبھی کوئی پڈنگ پکا لیتی، کبھی آئس کریم بنا لیتی اور بڑے اصرار سے علامہ کو بھی کھلاتی، بلکہ دو دفعہ علامہ نے ہمیں بھی "میم صاحب کی آئس کریم" کھانے کی دعوت دی۔ ڈاکٹری دواؤں کی تلخی اور ناگواری سے ہمیشہ بیزاری ظاہر کرتے اور جب خمیرہ مروارید، بورق نقرہ پیچیدہ ایک چھوٹی سی پڑیا میں پیش کیا جاتا تو بہت خوش ہوتے اور کہتے کہ ہاں یہ ہے نادوا، جس کو دیکھتے ہی مرض آدھا رہ جاتے مریض تو پہلے ہی تلخ کام ہوتا ہے اُس کو مزید تلخ کام کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

مرض الموت میں غذا کے متعلق حسِ ذائقہ میں زیادہ لطافت پیدا ہو گئی تھی۔ حکیم محمد حسن صاحب قرشی سے ایک گفتگو کا خاکہ ملاحظہ ہو:

"اگر پلاؤ کی اجازت نہیں تو کھچڑی میں کیا حرج ہے، یہ تو سادہ غذا ہے" "آپ ایک دو روز کھچڑی کھا لیجئے"۔ "ہاں تو کھچڑی پھکنی ہوئی ہونی چاہیئے، جس میں گھی کافی ہو" "گھی کم ہونا چاہیئے، کیونکہ جگر بڑھا ہوا ہے"۔ "تو پھر کھچڑی میں کیا لذت ہو گی؟۔ اچھا کم از کم اس میں دہی تو ملا لیا جائے"۔ "مگر آپ کو کھانسی اور تولید بلغم کی شکایت ہے جس میں دہی مضر ہے"۔ "تو پھر ایسی کھچڑی کھانے سے نہ کھانا اچھا ہے"۔

علامہ اپنی بیرسٹری کے سلسلے میں جب عدالتوں میں جاتے تو انگریزی سوٹ پہن لیتے۔ ہیٹ شاید کبھی طالب علمی کے زمانے میں اور وہ بھی انگلستان میں پہنی ہو گی۔ یہاں ہم نے انہیں ہیٹ لگاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ انگریزی سوٹ کے ساتھ نکٹائی کی جگہ عام طور پر کالی بو کلپ سے لگا لیتے، لیکن جتنی دیر سوٹ پہنے رہتے، کچھ گھبرائے ہوئے سے نظر آتے اور گھر واپس آتے ہی علی بخش کو آواز دیتے کہ سب سے پہلے یہ چار جامہ اتروا دو اور انسانوں کے سے کپڑے پہناؤ۔ پرائیویٹ لباس یہ تھا۔ سر پر ترکی یا کلپاک ٹوپی، سردیوں میں پشاوری پٹکا، قمیض، شلوار، چھوٹا کوٹ، پاؤں میں دیسی جوتا، چند بار شیروانی بھی پہنی ہے۔ اسی لباس میں تقریبات میں جاتے۔ اور دوستوں کی مجلسوں میں شریک ہوتے گھر پر گرمیوں کے موسم میں صرف بنیان اور تہمد۔ سردیوں میں ان دونوں کپڑوں پر صرف ایک قمیض کا اضافہ ہو جاتا۔ البتہ پشمینے کا ایک دھسّہ اوڑھے رہتے، سر کشن پرشاد نے دوران قیام حیدر آباد میں ایک نہایت اعلیٰ درجے کی جامہ وار کا پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسکی شیروانی سلوائی اور دو چار دفعہ شوق سے پہنی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ ان کے جسم پر بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ اسی لباس میں ایک عقیدتمند نے عکسی تصویر بھی لی تھی، جو بعض رسالوں میں شائع ہو گئی تھی۔

دوران وکالت میں یہ معمول تھا کہ عدالت سے واپس آ کر اپنا گھریلو لباس زیب تن کرتے اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتے۔ ساتھ ہی حقہ لگا ہوتا تھا، حقہ پیتے، کتابیں پڑھتے،

مقدمات تیار کرتے، ملنے والوں سے باتیں کرتے۔ جب وکالت کا شغلہ علالت کی وجہ سے ختم ہوگیا، تو زیادہ وقت بستر پہ گزرتا تھا۔ تکیہ لگا ہے، معمولی سی توشک پر دری اور چادر بچھی ہے۔ اور اس پر یہ پیکر علم و فضل جلوہ گر ہے۔ علی بخش حُقّے کے معاملے میں بڑا باقاعدہ اور پابند تھا۔ تمباکو علی العموم میاں نظام الدین مرحوم کے کھیتوں سے آتا، علی بخش بڑے اہتمام سے اس کو تیار کرتا اور دن بھر چلمیں بھرتا، کیونکہ اس کے سوا اُسے کوئی اور کام ہی نہ تھا۔

۱۹۲۱ء تک تو علامہ انارکلی بازار کے ایک بالاخانے میں رہتے تھے۔ بازار کی جانب کمرے میں کتب خانہ قانونی، درمیانی کمرہ خالی، عقبی کمرے میں علامہ کی کرسی اور بستر، اللہ اللہ خیر سلا، زنانہ حصہ دوسری منزل پر۔ جب میکلوڈ روڈ کی کوٹھی میں پہنچے، جب بھی کمروں کی ترتیب انگریزی نہ تھی۔ ایک چھوٹے سے بغلی کمرے میں وہی بستر اور کرسی، بڑے کمرے میں ایک بڑا قالین اور صرف ایک سوفا، ایک کرسی خود علامہ کے لئے، چند کرسیاں آنے جانے والوں کے لئے، اللہ بس، باقی ہوس، لیکن زیادہ تر برآمدے میں بیٹھتے تھے۔ ڈرائنگ روم، بیڈروم، ڈائننگ روم وغیرہ کے بکھیڑوں سے نفرت تھی، اوّل تو دعوت اور مہمانداری کا اتفاق شاذ ہی ہوتا تھا، لیکن جب کبھی پانچ چھ دوستوں کو کھانے کی دعوت دیتے، بڑے کمرے میں قالین پر دسترخوان بچھ جاتا اور وہیں بیٹھ کر کھانا کھا لیتے۔ ہم نے علامہ کے ہاں مہمان شاذونادر ہی دیکھے۔ البتہ مولانا گرامی جب کبھی آتے، مہینہ مہینہ، دو دو مہینے قیام فرماتے اور اُن کی مہمانداری کا اہتمام بطور خاص کیا جاتا۔ اور یہ اہتمام بھی کیا تھا! وہ بھی علامہ کی طرح سیدھے سادے بزرگ تھے۔ دن میں ایک وقت کھانا کھاتے، باقی اوقات میں چائے پیتے۔ لہٰذا علامہ کے ساتھ اُنکی خاصی نبھ جاتی تھی۔ علامہ میں ایک بات عجیب تھی۔ کہ شدید گرمی میں بھی پنکھا نہ لگاتے تھے۔ ایک چھوٹی سی دستی پنکھیا پاس پڑی رہتی تھی۔ کبھی کبھی اُٹھا کر ذرا سا جھل لیتے اور بس۔ جب کبھی ہم اصرار کرتے کہ پنکھا منگائیے۔

ہم سے تو اس گرمی میں بیٹھا نہیں جاتا، تو علی بخش سے کہہ کر ٹیبل فین لگوا دیتے، لیکن اس کا رُخ اپنی طرف نہ ہونے دیتے۔ پسینہ چوٹی سے ایڑی تک پڑا بہتا لیکن وہ اللہ کا بندہ ٹس سے مَس نہ ہوتا۔ اس کے مقابلے میں جب جاڑا پڑتا تو علامہ اپنی کرسی سے اُتر کر مع دُھسے کے قالین پر آ بیٹھتے اور ایک بڑی انگیٹھی آگ تاپنے کے لئے آگے رکھوا لیتے۔

میں نے ایک دفعہ پہلے بھی ایک تقریر میں بیان کیا تھا کہ علامہ اقبالؒ کے علم و فضل کا شہرہ اُنکی شاعری اور اُنکی تصانیف سے نہیں ہوا۔ بلکہ اس کا ذمہ دار اُن کا تکلم ہے۔ وہ دورِ حاضر کے بہت بڑے متکلم تھے۔ جس کو انگریزی میں Conversationalist کہتے ہیں۔ صبح سے رات تک یہ مردِ قلندر اپنے سادہ کپڑوں میں سیدھی سادی چارپائی یا آرام کرسی پر بیٹھا رہتا اور آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ صوبے کے سیاسی اکابر، وکلاء، علماء، کالجوں کے پروفیسر، اخباروں کے ایڈیٹر، شعرا و اُدباء، طالب علم، ان پڑھ، عقیدتمند، فقیر اور درویش ــــ غرض ہر قسم اور ہر طبقے کا انسان ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، معمولی معمولی جھگڑوں سے لے کر قانون، فلسفہ، سیاست، دین اور سائنس کے بلند ترین مسائل زیرِ بحث آتے، اقبال اُن سب پر اپنی وسیع معلومات سے روشنی ڈالتے اور ہر شخص آپ کے علم و فضل سے مرعوب ہو کر جاتا۔ صوبے بھر کے تعلیم یافتہ حضرات اپنی ذہنی اور فکری اُلجھنیں علامہ کی خدمت میں پیش کرتے اور وہ انہیں سُلجھا دیتے۔ اُن کی مجلس میں بڑے اور چھوٹے کا امتیاز نہ تھا۔ معمولی سے معمولی آدمی بھی سیدھا اُن کے گھر میں داخل ہو کر اُن کے پاس بیٹھ جاتا اور جس وقت تک جی چاہتا بیٹھا رہتا۔ علامہ صاف صاف کہنا تو درکنار اپنی کسی حرکت سے بھی اُکتاہٹ کا اظہار نہ ہونے دیتے تھے۔ علم و فکر کے اس دربار میں سر فضل حسین، سکندر حیات خان، جواہر لال نہرو، قائدِ اعظم محمد علی جناح، لارڈ لوتھیان، ڈاکٹر سکارپا اور بے شمار دوسرے اکابر علم و سیاست حاضر ہوتے اور مستفیض ہو کر جاتے، علامہ کو بعض سے سیاسی اختلافات تھے، لیکن چونکہ خلوص و بے غرضی کا معاملہ

تھا اس لئے کسی سے ناگواری پیدا نہ ہوتی۔

علامہ کے جلیس و ندیم

علامہ کی خدمت میں اکثر حاضر ہونے والے اشخاص کی فہرست تو بے حد طویل ہے لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آغاز میں اُن کے ہمنشیں مرزا جلال الدینؒ مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، فقیر سید نجم الدین، سر عبد القادر، سر محمد شفیع، سر فضل حسین، سر جگندر ناتھ سردار امراؤ سنگھ، نواب ذوالفقار علی خان اور راجا نریندر ناتھ تھے۔ دوسرے دور میں مولانا ظفر علی خان اکثر آکر ملتے تھے۔ اور گھنٹوں صحبتیں رہتی تھیں۔ خلیفہ شجاع الدین، خلیفہ عبد الحکیم، شیخ اکبر علی ارسطو، خان غلام رسول خان اکثر آتے۔ سالک اور مہر سالہا سال تک، ہر دوسرے تیسرے دن حاضر ہوتے اور شام سے آدھی رات تک مجلس جمی رہتی۔ مرتضٰی احمد خان میکش بھی کبھی کبھی حاضر ہوتے۔ چودھری محمد حسین سے تو کئی سال سے انتہائی مخلصانہ تعلقات تھے اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ علامہ کی طبیعت میں جس قدر درخور چودھری صاحب کو حاصل تھا اس کا مقابلہ کوئی دوست یا جلیس نہ کر سکتا تھا۔ آخری ایام میں حکیم محمد حسن قرشی، راجہ حسن اختر، سید نذیر نیازی، میاں محمد شفیع (م۔ش) شب و روز حضرت علامہ کی خدمت میں رہتے۔ اور دوا و غذا اور دوسرے معمولات کی نگرانی بوجہ احسن کرتے۔

ملک لال دین قیصر ایک زمانے میں دن رات علامہ ہی کے پاس بیٹھے رہتے تھے چونکہ وہ قوم کے مجاہد خادم تھے، اسلئے اکثر قید ہو جایا کرتے تھے۔ اسلئے ایک دن ان کی والدہ ضعیفہ یہ سُن کر کہ قیصر علامہ اقبال کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا، عین دوپہر کے وقت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یہ بیٹا میرے لئے وبالِ جان ہو رہا ہے۔ اور ہمیشہ کسی نہ کسی قضیے میں قید ہو جاتا ہے، آپ اسکو منع کیجئے۔ علامہ نے حُسنِ تدبیر سے قیصر کو بعض خطرناک جلسوں اور تحریکوں سے باز رکھا۔ جب قیصر کی شادی ہوئی اور اسکے ہاں بچہ پیدا ہوا تو والدہ قیصر اس بچے کو لے کر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ آپ اس کے لئے دُعا کیجئے۔ علامہ نے اس کو

درازیٔ عمر، ترقی درجات اور سلامتی ایمان کی دعا دی اور والدہ سے پوچھا کہ اس بچّے کا نام کیا رکھا ہے۔ ضعیفہ محترمہ نے کہا کہ میں اس کا نام اقبال رکھوں گی۔ (اقبال قیصر آجکل کاروبار میں مصروف ہیں اور ان کی دادی کا انتقال ہو چکا ہے)

علامہ اقبال کی گفتگو کبھی پنجابی میں اور کبھی سیدھی سادی اردو میں ہوتی۔ مسائل کی سنگینی کی وجہ سے بعض اوقات اس گفتگو میں بے شمار انگریزی الفاظ بھی داخل ہو جاتے۔ لیکن علاّمہ کا اسلوب بیان ہمیشہ سلجھا ہوا ہوتا۔ اردو بالکل پنجابی لہجے میں بولتے تھے۔ اکثر اہلِ زبان حضرات کو ان کی ملاقات سے ایک گونہ تنفّر پیدا ہوتا تھا۔ وہ شعر کی داد موقع بے موقع نہ دیتے تھے۔ آداب تسلیمات نہ کرتے تھے۔ آسانی سے کسی کو کلام نہ سناتے تھے۔ ہم نے بھی کبھی اُن سے فرمائش کی جرأت نہیں کی۔ لیکن جب کبھی رات کے وقت موج میں آتے تو گیارہ بجے تک اپنا غیر مطبوعہ کلام سناتے رہتے۔ لیکن جو لوگ اہلِ زبان سے اہلِ علم زیادہ ہوتے تھے۔ وہ انتہائی احترام سے علامہ کے ارشادات سنتے اور سر دھنتے ہوئے واپس جاتے۔ مرزا جلال الدین صاحب کا بیان ہے کہ ایک دفعہ انجمن حمایتِ اسلام کے سلسلے میں یہاں یوپی کے رئیس راجا نوشاد علی خان کو دعوت دی گئی وہ سر محمد شفیع کے ہاں ٹھہرے۔ ایک دن چائے پیتے ہوئے کہا کہ سرسیّد نے پنجابیوں کی زندہ دلی کی تعریف کی ہے۔ یہاں آکر تو ہمیں کوئی زندہ دلی نظر نہیں آئی۔ مرزا جلال الدین نے کہا! آپ کانفرنس کے بعد مزید ایک دن قیام فرمائیے۔ پھر آپ کو زندہ دلی کا اندازہ ہوگا۔ اس دعوت کے موقع پر کھانا تو نواب ذوالفقار علی خان کے ہاں "زرافشاں" میں ہوا۔ اس کے بعد احباب جلسہ رقص و سرود کے لئے مرزا جلال الدین کے ہاں چلے گئے۔

مرزا جلال الدین صاحب نے اس زمانے کی نامور طوائف بہار و کو بلا کر راجا نوشاد علی خان کو اُس کا گانا سنوایا۔ وہ بے حد مسرور و محظوظ ہوئے۔ جب وہ رخصت ہو گئی تو نوشاد علی خان نے علاّمہ سے کہا! حضرت! آپ کی زبان سے آپ کا کلام سنے مدت گزر گئی۔ کچھ ارشاد فرمائیے ــــ علاّمہ نے کہا مجھے کچھ یاد نہیں۔ ہر شخص نے

تقاضا کیا، لیکن علامہ نے ایسی ناک پکڑی کہ پوری محفل منغص ہو گئی۔ جب راجا نوشاد علیخان چلے گئے اور دوستوں نے علامہ سے پوچھا کہ یہ کیا طریقہ ہے۔ آپ نے جواب دیا! "یہ شخص وجاہت کی بنا پر مجھ سے شعر سننا چاہتا تھا، میں وجاہت کی بنا پر کسی کو شعر نہیں سنایا کرتا"۔

فرمائش پر کلام سنانا علامہ کی عادت کے قطعاً خلاف تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ یو۔ پی سے کوئی شاعر ملنے آئے اور آج کل کے شعرا کے رواج کے مطابق انہوں نے چاہا کہ کچھ علامہ سے سنیں اور کچھ اپنا کلام سنائیں۔ لیکن علامہ نے ان کو ہمیشہ مایوس ہی کیا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اسی سلسلے میں دو واقعات سنائے۔ جن کو مختصراً بیان کرنا ضروری ہے۔ جب علامہ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تو ایک دن جوش ملیح آبادی نے اپنے چند دوستوں کو دعوت دی اور علامہ کو مدعو کیا۔ علامہ نے اس دعوت کا ذکر خلیفہ صاحب سے کیا تو معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب مدعو نہیں ہیں۔ بہرحال علامہ چونکہ دعوت قبول کر چکے تھے، لہٰذا چلے گئے۔ جوش کا مقصد اس محفل سے یہی تھا کہ کچھ اپنا کلام سنائیں اور کچھ علامہ سے سنیں۔ انہوں نے فرمائش کی۔ علامہ نے کہہ دیا کہ "مجھے یاد نہیں" بہتیرا تقاضا کیا۔ منت سماجت کی۔ لیکن علامہ نے ایک شعر بھی نہ سنایا۔ پھر جوش اپنا کلام کیا سناتے۔ چنانچہ یہ مجلس "مشاعرے" کے بغیر ہی ختم ہو گئی۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت علامہ اور مہاراجہ سرکشن پرشاد کے تعلقات مدت سے دوستانہ چلے آرہے تھے۔ چنانچہ ان کی طویل خط و کتابت بھی "شادِ اقبال" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ مہاراجہ صاحب نے علامہ کے اعزاز میں ایک نہایت شاندار دعوت طعام کا اہتمام کیا۔ جب علامہ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ دعوت ایک شرط پر قبول کرتا ہوں کہ مجھ سے اس مجمع میں شعر سنانے کی فرمائش نہ کی جائے مہاراجہ

بے حد پریشان ہوئے کیونکہ ان کا مقصد تو یہی تھا کہ اکابر حیدر آباد کو علامہ کے کلام سنوائیں لیکن چونکہ علامہ کی شرکت اس پابندی سے مشروط تھی۔ لہٰذا ناچار مہاراجہ صاحب نے قبول کیا۔ علامہ شریکِ محفل ہوئے۔ وہاں بعض شعرا و امرائنے اپنا کلام سنایا۔ اور ایک دوسرے کو خوب فرمائشی داد دی۔ علامہ خاموش بیٹھے رہے۔ آخر میں اُن سے کلام سنانے کی استدعا کی گئی تو اُنہوں نے نہایت تنغض سے جواب دیا "یاد نہیں"۔

بڑے بڑے امرا و حکام نے مہاراجہ صاحب سے گذارش کی کہ وہ حضرت علامہ کو آمادہ کریں۔ لیکن وہ پابندی عہد سے مجبور رہتے۔ آخر بہت ہی ناچار ہو کر اُنہوں نے گذارش کی کہ حضرت یہ سب لوگ آپ سے عقیدت کی وجہ سے کلام کے طالب ہیں۔ ان کو محروم رکھنا قرینِ مروّت نہیں معلوم ہوتا بہت سی حیص بیص کے بعد علامہ نے مجبوراً فارسی کے صرف دو شعر سنائے۔

بگذر از خاور و افسونیِ افرنگ مشو
کہ نیرزد بہ جوے ایں ہمہ دیرینہ و نو
آں نگینے کہ تو با اہرمناں باختۂ
ہم بہ جبریلِ امینے نتواں کرد گرو

لیکن مہاراجہ صاحب دیکھ رہے تھے کہ علامہ نہایت منغض ہو کر شعر سنا رہے ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے مزید فرمائش نہ کی۔

علامہ کا زیادہ تر وقت ملاقاتوں اور مذاکروں ہی میں گذرتا تھا۔ پھر تعجب ہے کہ وہ مطالعہ کس وقت کرتے تھے اور مطالعہ کا یہ حال تھا کہ یورپ سے جدید ترین سیاسی و فلسفیانہ نظریات کے متعلق انگریزی اور جرمن زبانوں میں جو کتابیں شائع ہوتی تھیں اُنکو علامہ باقاعدہ پڑھتے تھے۔ ملک بھر کے اخبارات اور رسالے ان کے نام آتے تھے۔ لیکن وہ ایک دو مقامی اخبارات کے سوا باقی سب کو کھولتے بھی نہ تھے اور علی بخش کو بلا کر

اُس کے حوالے کر دیتے تھے۔ ہم علی بخش سے بار ہا اچھے اچھے رسالے پڑھنے کے لئے لے جایا کرتے تھے، باقی وہ ردّی میں بیچ دیتا تھا۔

صُبح کی نماز اور تلاوت قرآن مجید علّامہ اقبال کا باقاعدہ معمول تھا اور تلاوت کے وقت کلامِ الٰہی کے اثر سے اکثر اشکبار ہو جاتے تھے۔ غیرت اسلامی کے پیکر تھے۔ اسلام، شارع اسلام، اکابر تاریخِ اسلام کی ذراسی بے حرمتی پر ضبط نہ کر سکتے۔ عشقِ رسولؐ اُن کے رگ و ریشہ میں رچا ہوا تھا۔ حضور سرور کائناتؐ کا ذکر ذرا موثر طور پر ہوا اور علامہ کے آنسو جاری ہونے پھر جب تک خود بخود طبیعت ہلکی نہ ہو جاتی تھی۔ ان کی گریہ زاری کو کوئی نہ روک سکتا تھا۔

اسمائے الٰہی اور کلام الٰہی اور دُوسرے بابرکت کلمات کی تاثیرات کے بھی قائل تھے ایک دفعہ راقم الحروف سے ذکر کیا کہ طل میری بیوی کے سر میں درد ہوا جو کسی تدبیر سے نہ گیا۔ آخر میں نے قصیدہ بردہ کا فلاں شعر کاٹ کر اس کی پیشانی پر چسپاں کر دیا، چند منٹ میں درد کافور ہو گیا۔

والدۂ جاوید کا دل بہت کمزور تھا۔ بہت جلد ڈر جاتی تھیں۔ ایک دن خفیف سا زلزلہ آیا تو بے ہوش ہو گئیں۔ اعزہ نے علامہ کو باہر سے بلوایا، وہ آکر پاس بیٹھ گئے۔ والدہ جاوید کو ہوش آیا تو اُن کا دل بہلانے کے لئے کہانیاں سُناتے رہے۔ پھر فرمایا! کہانیاں تو سُن لیں۔ اب اللہ کا ذکر کرو۔ قرآن میں آیا ہے کہ اللہ کے ذکر سے دل اطمینان پاتے ہیں۔ پھر خود بلند آواز سے یا حیّ یا قیوم پڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ کمرہ گونج اُٹھا۔ والدۂ جاوید پھر ڈر گئیں۔ علامہ پھر انہی اسما کا ورد کرتے کرتے باہر تشریف لے گئے۔

طبیعت میں مزاح و تفنن بھی تھا۔ لطیفے کی قدر کرتے تھے اور خود بھی لطائف و ظرائف سے ہم نشینوں کو ہنسایا کرتے تھے۔ دن بھر میں پچاسوں آدمی ان سے ملنے آتے اور اسی طرح کی باتیں ہوتیں۔ اسی سلسلہ میں ہر حلقے کی خبریں بھی علامہ تک پہنچتی رہتی تھیں اور

وہ ان خبروں کو سن کر دوسرے احباب تک پہنچا دیتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے، راقم نے ڈاکٹر صاحب کو ایک اہم سیاسی خبر سُنائی اور کہہ دیا کہ فی الحال آپ کسی سے اس کا ذکر نہ کیجئے گا۔ دوسرے دن شام کو میں حاضر ہوا تو بڑی رازداری سے وہی خبر مجھے سُنادی کہ کوئی صاحب مجھے یہ خبر سُنا گئے ہیں۔ آپ فی الحال کسی سے ذکر نہ کیجئے گا۔ میں بے اختیار ہنس پڑا۔ میں نے کہا۔ حضرت! یہ خبر تو میں ہی کل آپ کو سُنا گیا تھا۔ علامہ ہنس دیتے اور کہنے لگے، گویا میرے ذہن میں خبر ہی رہ گئی اور خبر دینے والا نہ رہا۔

میں نے بہت کم لوگوں کو علامہ اقبال جیسا خوش معاملہ پایا ہے۔ وہ روپے پیسے کے معاملے میں بے حد دیانتدار اور محتاط تھے۔ پہلی بیگم کو جتنی رقم ماہوار ادا کرنے کا وعدہ کیا نہایت پابندی سے تادمِ مرگ ادا کرتے رہے۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی نہایت بدنما اور بوسیدہ تھی پونے دو سو روپے ماہوار اُس کا کرایہ دیا کرتے تھے۔ ہزار دفعہ عرض کیا یہ کوٹھی اتنے کی نہیں۔ آپ کیوں روپیہ برباد کرتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ یہی کہتے کہ یہ کوٹھی ایک بیوہ کی ہے جس کے بچوں کی گذران اسی کے کرائے پر ہے۔ مجھے کرایہ کم کرنے کی تحریک کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو نہایت پابندی سے پونے دو سو روپے اس بیوہ کو بھیج دیا کرتے تھے۔ لدھیانہ والی بیگم اور لاہور والی بیگم دونوں بیک وقت علامہ کے ہاں رہیں۔ لیکن ان کے درمیان سوکناپے کا کوئی معاملہ نہ تھا بالکل بہنوں کی طرح رہتی تھیں۔ علامہ کو کبھی ایک لمحے کے لئے کوئی ایسی شکایت نہ پیدا ہوتی جو دو بیویوں والوں کو ہوا کرتی ہے۔ وہ خود بھی ان دونوں میں انتہائی عدل مدِ نظر رکھتے تھے۔ ایک دفعہ میرے سامنے دونوں بیگموں کے لئے دو زیور بن کر آئے جب سُنار نے ان کو تولا، تو ایک زیور کوئی دو ماشے کم نکلا۔ علامہ نے دو ماشے سونے کی قیمت اس زیور کے ساتھ اپنی بیگم کو ادا کر دی تاکہ اُسے بے انصافی کی شکایت نہ ہو۔

علی بخش عمر بھر اُن کا خدمت گار رہا۔ وہ ان کا شیفتہ تھا اور ان کو بھی علی بخش کے سوا

اور کسی ملازم کے کام سے اطمینان نہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ علی بخش چھٹی لے کر گیا اور اپنی جگہ رحمے کو رکھوا گیا۔ جب واپس آیا تو رحمے نے پریشانی ظاہر کی کہ اب میں کہاں جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا چلو تم بھی رہو۔ اس کے بعد کہیں رحما چھٹی پر گیا اور اپنی جگہ ایک اور شخص دیوان کو رکھوا گیا، جب واپس آیا تو تیسرا نوکر پریشان ہوا۔ علامہ نے اسکو بھی رکھ لیا۔ آخر ہم نے علامہ سے کہا کہ آپ کے ہاں کام تو کچھ بھی نہیں اور نوکر تین تین ہیں۔ آخر اس اسراف کا کیا مطلب؟ لیکن انہوں نے سُنی اَن سُنی کر دی اور تینوں نوکر آخر تک رہے۔

ایک دفعہ علامہ نے دوستوں کے کہنے سُننے سے ایک موٹر کار خریدی اور ایک شخص فیروز اس کا ڈرائیور مقرر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب "گل محمد" قسم کے آدمی، نہ کہیں آنے کے نہ کہیں جانے کے۔ فیروز دن بھر بے کار پڑا رہتا تھا۔ آخر اُس نے تنگ آکر کوٹھی کے پھاٹک کے پاس ہی خوانچہ لگا لیا۔ ڈرائیوری کی تنخواہ علامہ سے وصُول کرتا رہا اور خوانچے سے بھی ڈیڑھ دو روپے اور پیدا کر لیتا تھا۔ کبھی پندرہ بیس دن میں ایک دفعہ علامہ کہیں گئے تو موٹر میں انہیں لے گیا۔ ورنہ اللہ اللہ۔

ہم نے بارہا دیکھا، علامہ اقبال شدید درد کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ جب بھی درد ہوتا، خاصا شور مچاتے اور عملِ جراحی کا تو خیال بھی ان کے لئے ہول انگیز تھا۔ لیکن عام طور پر خطرات کے وقت اپنا دماغی توازن قائم رکھتے تھے۔ علی بخش کا بیان ہے کہ جب ۱۹۰۴ میں کانگڑہ کا مشہور زلزلہ آیا۔ میں علامہ کے پاس اندرون بھاٹی دروازہ بالاخانے میں رہتا تھا، یہ زلزلہ نہ تھا، خدا کا قہر تھا۔ کواڑ کھڑ کھڑا رہے تھے۔ چھتیں چیخ رہی تھیں، دیواریں یوں ڈول رہی تھیں گویا ابھی تمام مکانات پیوند خاک ہو جائیں گے اور حقیقت میں بہت سے مکانات گر بھی پڑے تھے۔ میری حالت دوران زلزلہ میں یہ تھی کہ کبھی کوٹھے پر چڑھ جاتا کبھی پھر نیچے اُترتا۔ لیکن علامہ صاحب شروع سے آخر تک اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹے کتاب پڑھتے رہے اور ان میں ذرا بھی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ صرف ایک دفعہ میری گھبراہٹ دیکھ کر

کتاب سے نظریں اٹھائیں اور کہا ! "علی بخش ، یوں بھاگے بھاگے نہ پھرو ۔ سیڑھیوں میں کھڑے ہو جاؤ ، یہ کہہ کر پھر بدستور مطالعہ میں مصروف ہو گئے ۔

قناعت کا یہ عالم تھا کہ کبھی روپیہ کمانے کی کوشش نہ کی وکالت کا بھی یہی حال تھا کہ کبھی کبھار کوئی مقدمہ لے لیا اور شہرت وناموری حاصل ہو جانے کے بعد بہت سے لوگ علامہ کی طرف رجوع کرتے تھے ۔ لیکن وہ صرف اتنے مقدمے لیتے جن کی آمدنی سے انکا خرچ پورا ہو جاتا ۔ مصارف خانگی میں انتہائی کفایت شعاری مدِ نظر تھی ۔ آمد وخرچ کا حساب نہایت باقاعدہ رکھتے تھے اور آخر دم تک اس شعار پر کاربند رہے جب اواخر عمر میں علالت کی وجہ سے ذرائع آمدنی مفقود ہو گئے اور نواب صاحب بھوپال نے پانچ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا ، تو علامہ نے اپنے مصارف کے لئے اس کو کافی سمجھا سر راس مسعود کو ایک خط میں لکھا :

"میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں ۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے ۔ ضرورت سے زیادہ ہوس کرنا روپے کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ۔ آپکو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا ۔ کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لئے زندگی کا نمونہ ہیں ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے ۔"

سادگی پسندی کے متعلق ایک واقعہ ملاحظہ ہو ! پنجاب کے ایک دولتمند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لئے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون دان اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا ۔ رات کو جب اقبال اپنے کمرے میں آرام کے لئے گئے تو ہر طرف عیش وتنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پاکر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسولؐ پاک کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں ، اس نے بوریے پر سو کر زندگی گزاری تھی ۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی ۔ اس بستر پہ لیٹنا ان کے لئے ناممکن ہو گیا

اُٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جاکر ایک کرسی پہ بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کیا۔

جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلاکر اپنا بستر کھلوایا۔ ایک چارپائی اس غسلخانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے، غسلخانے ہی میں سوتے رہے۔

سادگی اور قناعت سے لازمی طور پر غیرت مندی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ غیرت کا نقصان صرف احتیاج کی وجہ سے ہوتا ہے اور قانع آدمی محتاج نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدرآباد دکن نے علامہ اقبال کو توشہ خانے سے ایک ہزار روپے کا چیک بھیجا۔ چونکہ یہ دوستانہ ہدیہ تھا، بلکہ ایک ایسے فنڈ سے بھیجا گیا تھا کہ اس سے کچھ لینا علامہ کی غیرت مندی کو گوارا نہ تھا۔ اس لئے آپ نے ان اشعار کے ساتھ چیک واپس کر دیا۔

تھا یہ فرمانِ الٰہی کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات

مجھ سے فرمایا کہ لے، اور شہنشاہی کر
حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات

میں تو اس بارِ امانت کو اُٹھاتا سرِ دوش
کام درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول !
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

جائز و ناجائز کے متعلق بے حد محتاط تھے وکیلوں کے پاس مؤکل عام طور پہ تحائف و ہدایا لاتے ہیں اور یہ محنتانہ کے علاوہ ہوتے ہیں۔ علامہ کو ان تحفوں کے قبول میں بھی تامل تھا چنانچہ انہوں نے سید سلیمان ندوی کو اس صورت سے آگاہ کر کے سوال کیا ہے کہ آیا ایسا مال مسلمان کے لئے حلال ہے۔ بزرگوں کے ادب میں انتہائی اہتمام کرتے تھے۔ پروفیسر منظور احمد (ہمشیرزادہ علامہ) بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ علامہ اقبال سیالکوٹ میں رحیما عطار کی دوکان کے سامنے کھڑے تھے۔ تختے پر حقہ دھرا تھا۔ علامہ حقہ پی رہے تھے۔ ایک پاؤں زمین پر اور دوسرا تختے پر تھا۔ طلائی جوتی پہنے ہوئے تھے۔ جو پاؤں تختے پر تھا اس کا جوتا کسی قدر ڈھیلا تھا۔ اتفاق سے مولوی سید میر حسن شاہ اُدھر سے گزرے اور علامہ اقبال کی نظر اُن پر پڑ گئی۔ جھٹ

تختے پر سے پاؤں نیچے کیا۔ جوتے کا پاؤں تختے ہی پر چھوڑا اور صرف ایک ہی پاؤں میں جوتا پہنے اپنے اُستادِ محترم کی طرف لپکے۔ حضرت شاہ صاحب آگے آگے تھے اور علامہ گردن جھکائے اُن کے پیچھے پیچھے مؤدبانہ جا رہے تھے، ایک پاؤں میں جوتا تھا، دوسرے میں نہ تھا۔ حضرت شاہ صاحب کو ان کے گھر تک پہنچا کر واپس آئے، اور پھر اپنا جوتا پہنا ــــ کیا آجکل کے زمانے میں اس ادب و اخلاق اور طبعی سعادت کا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے؟

غرض علامہ نہایت سادہ مزاج، درویش صفت، متوکل اور عاشقِ رسولؐ مسلمان تھے۔ علم و فضل اور شہرت و ناموری کی بلندیوں پر پہنچ کر بھی اُن کی منکسر مزاجی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ غربا کے ساتھ بہت محبت سے ملتے تھے اور اُمرا کی کوئی خاص آؤ بھگت نہ کرتے تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ بعض ہندو، سکھ اور عیسائی بھی اُن سے دلی محبت کرتے تھے کیونکہ اُن کا دل آئینے کی طرح صاف تھا۔ جس میں کسی طرف سے بھی کدورت نہ تھی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

اقبال کا گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلق

مجھے علامہ اقبال کی ابتدائی نظمیں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں سُننے کا اتفاق ہوا ہے، جو عموماً شیرانوالہ دروازہ میں انجمن کے ہائی سکول میں ہوتے تھے اس زمانے میں اور خصوصاً ان کی نظم کے وقت مقام بارہ مولا کشمیر کے رئیس عبدالصمد ککڑ، جلسہ میں اپنے خاص انداز سے اقبال کا تعارف کروایا کرتے تھے۔ یہ ایک عجیب علمی فضا تھی، مگر اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں مجھے علامہ سے زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا جب انکی دُوسری شادی لدھیانہ میں ہُوئی پھر آپ سے تعلقات وفات (۱۹۳۸ء) تک قائم رہے۔

اس تمام زمانے میں علامہ کی صحبت میں گورنمنٹ کالج میں ان کے زمانہ طالب علمی اور وہاں کی ملازمت کے بعض واقعات کا تذکرہ کبھی کبھی دلچسپی کا سامان رہتا تھا۔ میں یہاں مختصر طور پر بیان کرتا ہُوں کہ آپ نے سیالکوٹ مشن کالج سے ۱۸۹۵ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا، جس کے بعد آپ نے اعلیٰ تعلیم کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور کالج کے ہوسٹل میں ان کی رہائش کا وہاں کے قواعد کے مطابق انتظام بھی ہو گیا۔

۱۸۹۷ء میں اُنہوں نے بی اے کا امتحان امتیاز سے پاس کیا تو ان کو عربی اور انگریزی میں اوّل آنے پر طلائی تمغے بطور انعام ملے۔ اس کے بعد انہوں نے ۱۸۹۹ء میں اسی کالج سے ایم۔ اے کا امتحان فلسفے میں پاس کیا۔ آپ اس وقت ہوسٹل کوا ڈرینگل (جس کا موجودہ نام

اقبال ہوسٹل ہے) میں کمرہ نمبر ا میں رہتے تھے۔ یہیں سے آپ اکثر نکل کر بھاٹی دروازہ کے اندر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ اور بعض احباب کے ہاں بھی جایا کرتے تھے، اس کا ثبوت ہمیں ان کے ایک خط سے بھی ملتا ہے جو آپ نے اسی ہوسٹل کے مندرجہ ذیل پتہ سے مولانا احسن مارہروی کو لکھا ہے۔ اس خط کے آخر پر آپ نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے :

"خاکسار محمد اقبال۔ از لاہور گورنمنٹ کالج بورڈنگ ہاؤس، ۲۸ فروری ۱۸۹۹ء"

اس خط میں آپ نے ان کے رسالے "گلدستہ" کے لئے نظم ارسال کرنے کا وعدہ کیا اور حضرتِ داغ یعنی اپنے استاد سے فوٹو طلب کرنے کے لئے لکھا ہے۔

علامہ اقبال ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو اورینٹل کالج میں میکلیوڈ عریبک ریڈر کی حیثیت سے متعین ہو گئے۔ حسنِ اتفاق سے انہی ایام میں اقبال کے مشفق و ہمدرد اُستاد پروفیسر ٹامس آرنلڈ بھی اورینٹل کالج کے پرنسپل مقرر ہو گئے تھے۔ اقبال اورینٹل کالج میں میکلیوڈ عریبک ریڈر کی حیثیت سے ۱۹۰۳ء تک کام کرتے رہے، مگر اس اثنا میں آخر ۱۹۰۰ء سے ۸ جون ۱۹۰۱ء تک بلا تنخواہ چھٹی پر رہے۔ کیونکہ اس عرصہ میں وہ چھ ماہ کے لئے انگریزی کے ایڈیشنل پروفیسر ہو کر گورنمنٹ کالج میں رہے۔ جولائی ۱۹۰۱ء کے بعد اقبال پھر اپنے منصب پر میکلیوڈ عریبک ریڈر کی حیثیت سے اورینٹل کالج واپس تشریف لے آئے۔

اقبال نے دورانِ قیام اورینٹل کالج "نظریہ توحید مطلق" پر جو شیخ عبدالقادر جیلانی کا پیش کردہ ہے، انگریزی میں ایک مقالہ بعنوان :

"The Doctrine of the Absolute unity as Expounded by Al Jilani" مرتب کر کے "Indian Antiquity" کے ماہوار پرچہ میں ۱۸۹۹ء میں چھپوایا۔ اقبال اس زمانے میں اورینٹل کالج کی بی او ایل

اور انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کو پڑھاتے بھی تھے۔ اقبال کا یہ تعلق اسی کالج کی اورینٹل فیکلٹی سے آپ کے لندن سے واپس آنے پر بھی رہا۔ ویسے اس زمانہ میں علمی حیثیت سے اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج میں کم فرق محسوس ہوتا تھا۔ اورینٹل کالج کے بعد آپ پھر اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج ہو گئے۔ اس زمانے میں آپ بھاٹی دروازہ کے اندر ایک کرایہ کے مکان میں مقیم تھے۔ گورنمنٹ کالج میں آپ ۱۹۰۴ء تک رہے۔ اس کے بعد آپ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ تشریف لے گئے۔ جب آپ ۱۹۰۹ء میں واپس آئے تو آپ نے بیرسٹری شروع کی اور ساتھ ساتھ آپ کچھ عرصہ تک گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے اعلیٰ پروفیسر بھی رہے، اور اس وقت آپ کے لئے خاص طور پہ ہائی کورٹ سے کالج نے یہ انتظام کرالیا تھا کہ آپ کے مقدمات کالج کے اقات کے بعد پیش ہوا کریں تقریباً ڈیڑھ سال تک یہ انتظام رہا۔ اس زمانے میں انڈین سول سروس زیادہ تر انگریزوں کیلئے مخصوص تھی۔ گورنمنٹ نے اقبال کو یہ اعلیٰ اسامی پیش کی۔ مگر آپ نے اسے قبول نہیں کیا اور بیرسٹری کے آزاد پیشہ کو پسند کیا۔ آپ طبعاً ملازمت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ آپ نے ایک مرتبہ اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کو ملازمت کے متعلق بطور مشورہ جواب میں لکھا اور ملازمت سے اپنے اجتناب کو اس طرح ظاہر فرمایا۔

"ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور نے مجھ سے اسطرح گفتگو کی جیسے کوئی اپنے کلرک سے کرتا ہے۔ اس لئے اس دن سے ملازمت سے طبیعت بے زار ہو گئی اور ارادہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے پرہیز کرونگا۔"

مگر آپ کی شہرت بحیثیت پروفیسر گورنمنٹ کالج ہمیشہ قائم رہی۔

۱۹۲۳ء کے جنوری کے مہینے کی اوّل تاریخ کو آپ کو سرکار انگلشیہ نے "سر" کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ ۱۹۳۱ء میں پروفیسر جیٹرجی نے لندن سے آکر شعبہ فلسفہ کا

گورنمنٹ کالج میں چارج لیا۔ اسی زمانہ میں قاضی اسلم علی گڑھ سے بی اے کر کے یہاں ایم۔ اے فلسفہ کی کلاس میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے یادداشتوں کے ضمن میں ایک مستقل مضمون :

"Iqbal at a College Reception in Lahore"

کے عنوان سے کراچی کے مجلہ اقبال ریویو اکتوبر ۱۹۷۰ء میں لکھا ہے، جو بڑا دلچسپ ہے۔ انہی کی کوشش سے ایک استقبالیے کا گورنمنٹ کالج میں وہاں کی فلسفے کی انجمن "بریٹ" کی طرف سے طے پا گیا، کیونکہ یہ خوشی اس مجلس کی بھی تھی۔ اقبال کو یہ خطاب ان کے علمی کارناموں کے باعث میسر آیا تھا۔ یہ کسی سیاسی خدمت کا نتیجہ نہ تھا۔ گورنمنٹ کالج کی اس انجمن سے بی اے کے طلبا زیادہ وابستہ ہوتے تھے جن میں ہندو مسلم اور سکھ سب شامل تھے۔ چنانچہ وہ علامہ کی خدمت میں چیٹرجی کی چٹھی لے کر دوسرے طلبا کے ہمراہ دعوت دینے کے لئے گئے۔ علامہ اپنے گھر میکلوڈ روڈ پر آزادانہ اور بے تکلف بیٹھے تھے بہرحال وہ دن اور وقت دعوت طے کر آئے۔ واپس آکر انہوں نے مدعوئین کی فہرست مرتب کی جس میں شہر کے معززین بھی شامل تھے۔ اس بزم کے سیکرٹری کلیم الرحمان لاہور کے ایک معروف خاندان کے فرد تھے۔ اسسٹنٹ سیکرٹری منوہر ناتھ تھے۔ دعوت کا دن ۲۳ جنوری ۱۹۲۳ء مقرر ہوا تھا۔ یہ دعوت کالج کے مغربی لان میں منعقد ہوئی اور ایک فوٹو بھی بصورت گروپ "بریٹ" (Brett) بزم کے تحت ہوا۔ جس میں پرنسپل مسٹر ہیمی، پروفیسر چیٹرجی، پروفیسر احمد حسین (جو بعد میں اسلامیہ کالج گوجرانوالہ کے پرنسپل ۸۰ سال کی عمر تک رہے) اور شرکائے دعوت میں شیخ فضل حق اور انور سکندر خان بھی شامل تھے۔ دعوت بہت سادہ تھی۔ یعنی کالج کی جانب سے استقبالیہ اور پھر علامہ اقبال کا خطاب۔ آپ نے اس موقع پر ایک نظم بھی سنائی تھی۔ غرضیکہ اس طرح علامہ کا تعلق گورنمنٹ کالج سے قائم رہا۔ اس دعوت کا مکمل بیان قاضی اسلم نے متذکرہ بالا رسالہ میں شائع کرا دیا ہے۔ یہاں یہ بیان کرنا بے جا نہ ہو گا کہ

اہلِ لاہور کی طرف سے بھی جنوری ۱۹۲۳ء میں علامہ اقبال کے اعزاز میں ان کو "سر" کا خطاب ملنے پر ایک شاندار عصرانہ مقبرہ جہانگیر پر منعقد ہوا تھا، جس میں سکول اور کالج کے طلباء نے بھی نظمیں پڑھی تھیں۔

بہر حال گورنمنٹ کالج کے ضمن میں عرض ہے کہ جس سال اقبال نے کالج میں داخلہ لیا اسی سال میر سید غلام بھیک نیرنگ بھی میٹرک پاس کرنے کے بعد اس کالج میں داخل ہو گئے۔ ان کے ہمراہ کالج میں اور ہوسٹل میں ان کے ہم جماعت چودھری جلال الدین ضلع سیالکوٹ (ڈسکہ کے رہنے والے) بھی تھے۔ اُنہوں نے میر غلام بھیک سے اقبال کا ذکر اس طرح کیا کہ آپ مولوی سید میر حسن کے خاص تربیت یافتہ بھی ہیں اور شاعر بھی، اور آ کر بی اے میں داخل ہوئے ہیں۔ ایک روز اقبال بھاٹی دروازہ سے کالج کی طرف آ رہے تھے کہ چودھری جلال الدین نے اقبال کا تعارف غلام بھیک سے کر دیا۔ اس کے بعد آپ کو اقبال کا کلام سننے یا دیکھنے کا شوق ہوا، چنانچہ ایک روز چودھری صاحب اقبال کے کچھ اشعار کسی پرچہ کی صورت میں لائے، جو آج بانگِ درا میں نہیں ہیں۔ اسی طرح اقبال نے بھی میر غلام بھیک کے کلام کا نمونہ دیکھنا چاہا۔ یوں گویا اقبال کا چرچا گورنمنٹ کالج میں ہوتا رہا۔ آپ کے ہم جماعت طلباء میں مولوی ضیاء الدین احمد تھے جو کوچہ ہنومان گمٹی بازار لاہور میں رہتے تھے۔ اقبال اکثر ہوسٹل سے نکل کر ان کے ہاں آ جاتے اور ان کا اکثر ذکر کیا کرتے۔ وہ بمبئی میں پولیس آفیسر تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا صلاح الدین احمد نے اپنے بڑے لڑکے وجیہہ الدین احمد کی شادی کا ولیمہ اسی قدیم مکان واقعہ کوچہ ہنومان میں کیا تھا، جس میں اکثر عبد القادر اور بہت سے دیگر حضرات مدعو ہوتے تھے۔ شیخ عبد القادر نے اس موقع پر فرمایا:

"جس زمانہ میں میر غلام بھیک نیرنگ لاء کالج میں پڑھتے تھے تو اسی مکان میں آ گئے تھے۔ میر صاحب اور مولوی ضیاء الدین احمد بڑے دوست تھے۔ میں اور اقبال ان سے

ملنے یہاں آیا کرتے تھے۔ ہمارے ایک دوست کِدارناتھ چرپڑہ بھی تھے۔ میر غلام بھیک اور مولانا ضیاالدین احمد کو کسرت کا بہت شوق تھا۔ اس کے کونے میں انہوں نے اکھاڑہ بھی بنا رکھا تھا، جہاں کُشتی لڑتے تھے۔ کبھی کبھی اقبال مرحوم کو بھی شوق آتا تو وہ بھی لنگوٹ باندھ کر اکھاڑے میں اُترتے تھے۔ میر صاحب کے ساتھ ان کا دنگل بڑا پُر لطف ہوتا تھا۔

گورنمنٹ کالج میں اقبال کے زمانۂ پروفیسری میں ایک پروفیسر مدن گوپال سنگھ چاولہ ریاضی پڑھاتے تھے۔ وہ اپنے مضمون میں مشہور تھے۔ مگر وہ عام مجلسی آداب سے قدرے عاری تھے۔ ایک روز میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں کوئی صاحب اقبال کے یہاں آئے۔ اقبال کو وہ بھی عام فہم وشعور سے ذرا عاری نظر آئے تو آپ نے مسکرا کر کہا کہ میں اکثر پروفیسر چاولہ کو کالج میں کہا کرتا تھا، خاص کر جب وہ سٹاف روم میں ہماری طرف پیٹھ کر کے خلاف قاعدہ بیٹھ جاتے" پروفیسر چاولہ نوازش فرما کر مجھے ریاضی پڑھا دیں اور میں آپ کو عام فہم وشعور سکھا دونگا تاکہ آپ ذرا آداب محفل کے اعتبار سے ٹھیک ہو کر بیٹھ جایا کریں۔"

ایک روز علامہ اقبال نے اپنی عادت کُتب بینی کا ذکر مسکرا کر کیا اور کہا کہ جب میں گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل میں رہتا تھا تو اکثر کمرے میں تمام وقت مطالعہ میں گذارتا تھا ایک روز قریب شام جب دیگر طلبائے ہوسٹل گراؤنڈ میں کھیل میں مصروف تھے تو میں پڑھنے میں مستغرق تھا۔ اتنے میں ہمارے پرنسپل صاحب میرے کمرے میں تشریف لے آئے، فرمانے لگے تمام طالب علم باہر گراؤنڈ میں ورزش اور کھیل میں مصروف ہیں اور تم یہاں پڑھ رہے ہو، میں نے ادب سے جواب دیا کہ یہ بھی تو اپنی جگہ ایک ورزش ہے۔

اقبال سے جن طلبا نے گورنمنٹ کالج میں پڑھا۔ ان میں سے اکثر آپ سے بعد میں بھی ملنے آیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں جناب سلیمان خان جو کہیں افسر مال تھے اور سکندر خان جو سابق ہیڈ کلرک پنجاب یونیورسٹی کے صاحبزادے تھے جب بھی

لاہور آتے تو علامہ کے یہاں حاضر ہوتے۔ میں نے ان کو بارہا دیکھا ہے۔ علی بخش بھی انکی عزت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ علامہ سے ان کے ایک لیکچر کی یاد کو تازہ کر کے ذکر کر رہے تھے جو علامہ نے شیلے پر دیا تھا۔ اور خاص کر علامہ کے نظریات شاعری پر گفتگو کر رہے تھے کہ علامہ کو انگریزی شعراء میں شیلے بہت پسند تھا۔ میرا خیال ہے کہ علامہ نے خود یا ان کے کسی شاگرد نے اس سے استفادہ کر کے شیلے کے نظریات شاعری کے بارے میں کتاب بھی شائع کی تھی۔ میں نے علامہ کے ہاں معمولی طباعت میں اس کے نسخے بھی دیکھے تھے۔

مولوی محمد علی قصوری بیان کرتے تھے کہ انہوں نے ۱۹۰۹ء سے لے کر ۱۹۱۱ء تک گورنمنٹ کالج لاہور میں علامہ سے پڑھا ہے، جب وہ فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ اور کئی انگریزی نظمیں بھی علامہ سے پڑھی تھیں۔ ان کا بیان ہے کہ علامہ اقبال دوران لیکچر اکثر مثال کے طور پر مطالب سمجھانے کے لئے فارسی اشعار سے استفادہ کر کے انگریزی کے اشعار کے مفہوم کو واضح کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بیان کیا کہ ہم نے علامہ سے ملٹن کی نظم "Paradise Lost"--- اور ورڈزورتھ کی "Ode to immortality" پڑھی تھی آپ نے ان کو اس طرح خوش اسلوبی سے سمجھایا کہ آج تک یاد ہے۔ میں نے اپنی یادداشتوں کو ایک مرتبہ علامہ صلاح الدین سلجوقی افغانی سے بھی بیان کیا جو کہ بمبئی میں افغان گورنمنٹ کے کونسل تھے۔ آپ کو علامہ اقبال سے ملنے کا شوق ہوا۔ یہ صلاح الدین سلجوقی مرحوم اسلامی رنگ کی ایک خاص شان کے مالک تھے۔

علامہ کبھی کبھی گورنمنٹ کالج کے ماحول کا بھی ذکر کیا کرتے تھے، اور مسکرا مسکرا کر کیا کرتے تھے۔ اس کالج میں جہاں اب مسجد تعمیر ہوئی ہے اس کے قرب میں ایک خانقاہ کسی بزرگ کی ہے، جہاں سال میں ایک مرتبہ عرس ہوتا تھا اور لوگ جو اس میں شرکت کرتے زیادہ تر ہیر وارث شاہ پڑھا کرتے تھے۔ علامہ نے اپنے زمانہ طالب علمی میں ایسی بعض مجالس دیکھی تھیں۔ ویسے میں نے خود بھی ایسی مجالس آج سے پچاس سال قبل

دیکھی ہیں، جن میں مولوی غلام رسول مصنف "سوہنی مہینوال" جیسے عظیم پنجابی شاعر شامل ہوتے تھے۔

میر سید غلام بھیک نیرنگ نے بیان کیا ہے کہ ہماری سہ سالہ صحبتوں میں جو اسی گورنمنٹ کالج میں ہوتی تھیں اقبال اپنی ایک تجویز بار بار پیش کیا کرتے تھے۔ ملٹن کی مشہور نظم "Paradise Lost" اور "Paradise Regained" کا ذکر کر کے کہا کرتے تھے کہ واقعات کربلا کو اس رنگ میں نظم کرونگا کہ ملٹن کی "Paradise Regained" کا جواب ہو جائیگا۔ مگر اس کی تکمیل نہیں ہوئی۔ بقول سید غلام بھیک نیرنگ، علامہ اس زمانہ میں پروفیسر آرنلڈ سے بہت متاثر تھے۔

جب پروفیسر ڈکنسن گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ انگریزی کے صدر ہو کر علی گڑھ سے آئے تو وہ اکثر علامہ سے ملنے ان کے گھر آتے اور علمی معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ علامہ نے ان کے دماغ سے ڈرامہ "دارا شکوہ" کا خیال نکال دیا تھا۔ جس پر وہ بہت مصر تھے۔ علامہ نے ان پر تاریخ کی روشنی میں بحث کر کے بہت سے حقائق واضح کئے۔ ان کے علامہ کے یہاں آنے سے عجیب علمی فضا نظر آیا کرتی تھی، کیونکہ علامہ کو ان کی خاطر ذرا زیادہ ٹھوس علمی گفتگو کرنا پڑتی۔ عموماً اسلامی ثقافت گفتگو کا موضوع ہوا کرتی۔ علاوہ ازیں وہ بعض اوقات اپنے زمانہ کے بعض یورپین پروفیسروں کے پڑھانے کے طریقے پر بھی گفتگو کیا کرتے۔

مس ڈورا الینٹ / رفیق ڈوگر

اقبال کی معاشرتی زندگی کے خدوخال

شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے اپنے چھوٹے بچوں جاوید اور منیرہ کی دیکھ بھال کے لئے ایک جرمن خاتون مس ڈورا الینٹ ویرا کو مقرر کیا تھا۔ علامہ کی بیوی کی وفات کے وقت بچے ابھی چھوٹے تھے۔ علامہ خود بیمار رہتے تھے۔ فکرِ دوام کے ساتھ ساتھ گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی نگہداشت سب ذمہ داریاں ان پر آن پڑیں۔ وہ پریشان رہتے تھے۔ اپنے دوست اور بہی خواہ علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر رشید احمد صدیقی کو انہوں نے اس پریشانی کے متعلق لکھا کہ اگر بچوں کی نگہداشت کے لئے کوئی مناسب انتظام ہو جائے تو ان کی پریشانی کم ہو سکتی ہے۔ صدیقی صاحب نے انہیں لکھا کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک پروفیسر کے ہاں ان کی جرمن بیوی کی چھوٹی بہن مقیم ہے اور اس سے بات ہو سکتی ہے۔ علامہ کی اجازت سے انہوں نے بات کی اور مس ڈورا لاہور منتقل ہو گئیں۔ کاتبِ تقدیر نے ان کی قسمت میں مفکرِ مشرق کو قریب سے دیکھنا لکھا تھا۔ وہ خوش نصیب خاتون علامہ کے پیارے بچوں کی پرورش کے بعد شادیوں تک کے مراحل میں ان کے ساتھ رہیں۔ ۱۹۳۶ء میں لاہور آئیں صحیح تاریخ انہیں یاد نہیں اور ۱۹۶۲ء میں جرمنی گئیں۔ درمیان میں ایک بار کچھ عرصہ کے لئے اپنی بہن کے پاس علی گڑھ گئیں اور اب بھی پاکستان آتی ہیں جاوید اور منیرہ سے ملنے کے لئے۔ ان کو خوش دیکھ کر خوش ہونے کے لئے کہ وہ کہتی ہیں دنیا میں میری سب سے

بڑی خوشی ان کی خوشی ہے اور میں بہت خوش ہوں کہ میرے بچے خوش زندگی گذار رہے ہیں - وہ کہتی ہیں میں اپنے کو ان کی ماں تو نہیں کہہ سکتی لیکن وہ میرے لئے بچوں کی طرح ہیں - جاوید اب مسٹر جسٹس جاوید اقبال ہوتے ہیں اور بانو (منیرہ) ایک پوتے کی دادی بن چکی ہیں مگر مس ڈورا کی وہ اسی طرح عزت کرتے ہیں جس طرح بچے اپنی ماں کی کیا کرتے ہیں وہی محبت اور وہی بے تکلفی - وہ ان کے گھروں میں ان کے بچوں کے درمیان رہتی ہیں اور بہت خوش رہتی ہیں - کل شام جب ہم جاوید منزل ان سے ملاقات کے لئے پہنچے تو وہ اپنے کمرے میں شام کی چائے کے لئے تیار ہو رہی تھیں - بیگم ڈاکٹر جاوید اقبال اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر انہیں پیش کرتی تھیں - بیٹھنے کے کمرہ میں چاروں طرف کتابوں کی الماریاں تھیں - سامنے علامہ اقبال کی بڑی سی تصویر - علامہ کی وصیت کے مطابق ان کی تمام کتابیں اسلامیہ کالج کی لائبریری کو دے دی گئی تھیں - صرف ایک سو کتابیں وہ جاوید کے پڑھنے کے لئے چھوڑنے کی وصیت کر گئے تھے - جن پر انہوں نے اپنے ہاتھ سے نوٹس لکھے تھے - ہمیں یہ کتابیں دیکھنے کا اشتیاق تھا مگر وقت کم تھا اور مس ڈورا سے علامہ مرحوم کی زندگی کے متعلق زیادہ سے زیادہ باتیں کرنا چاہتے تھے کہ انہوں نے دو سال کے دوران (ان کی آمد کے دو سال بعد علامہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے تھے) ــــ جو کچھ دیکھا اور علامہ اقبال کو جیسا دیکھا ہم جاننا چاہتے تھے -

محبت کرنے والا باپ

دنیا میں شاید ہی کوئی باپ ہو گا جسے اپنے بچوں سے محبت نہ ہو مگر جب بچے ماں کی محبت سے محروم ہو جائیں اور باپ کو ماں اور باپ دونوں کی محبت اکیلے دینا پڑے اور یہ احساس بھی ہو تو پھر وہ اپنے بچوں سے کیسے محبت کرتا ہے ؟ مس ڈورا نے بتایا کہ جب تک بچے سکول سے واپس نہیں آتے تھے وہ کھانا نہیں کھاتے تھے - ان دنوں وہ بہت کمزور تھے ہر وقت پلنگ پر پڑے رہتے تھے مگر دوپہر کا کھانا کھانے کے کمرے میں آکر بچوں کے ساتھ

کھاتے تھے۔ ان سے باتیں کرتے۔ سکول کے متعلق، تعلیم کے متعلق اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ رات کو وہ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ دل کے مریض تھے۔ مس ڈورا نے بتایا کہ انہوں نے اصرار کیا کہ انہیں رات کو کچھ کھانا چاہیئے۔ دل کے مریض کے لئے تو یہ اور بھی ضروری ہے وہ کہنے لگے کیا کھاؤں؟ مس ڈورا نے کہا سوپ پی لیا کریں۔ علامہ نے کہا۔ سوپ کون بنائے گا؟ مس ڈورا اس کے بعد ان کے لئے خود سوپ تیار کرنے لگیں۔ رات کے کھانے کے بعد جاوید اور منیرہ باقاعدگی سے ان کے پاس آتے کہانیاں سُناتے۔ باتیں کرتے" بانو ان کے کمرے میں ادھر اُدھر دوڑتی پھرتی تھی۔ بڑی شریر تھی، اور ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوتے تھے۔ انہوں نے بتایا۔ اس کے بعد بچے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ علامہ کو بچوں کے مستقبل کی بہت فکر تھی۔ انکی ماں مرچکی ہے، میرے بعد ان کا کیا بنے گا؟ وہ سوچتے تھے اور کہا کرتے تھے بچے بہت چھوٹے ہیں اور میں عمر کے لحاظ سے ان سے بڑا ہوں۔ خدا نے مجھے آخری حصّہ عمر میں بچے دیئے ہیں۔ ذہنی طور پر وہ مجھ سے گھُل مل نہیں سکتے ان کا احساس تھا اور وہ ان سے زیادہ گھُل مِل کر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔

بچّوں کی تعلیم

علامہ اقبال دل اور دماغ سے مسلمان تھے۔ مسلمان مفکر اور شاعر اور مس ڈورا عیسائی ہم نے پوچھا کہ کیا آپ کو یہ احساس تھا؟ اور علامہ نے اس سلسلہ میں بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں کبھی آپ کو کوئی ہدایت دی تھی؟ آپ نے ان کے بچّوں کو ان کے مذہب اور نظریات کے مطابق تعلیم دینے کے لیئے کیا اہتمام کیا؟ مس ڈورا نے کہا۔" علی گڑھ میں پروفیسر صدیقی ان کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ اقبال بہت بڑا مفکّر ہے اور بہت بڑا انسان ہے اور اس وقت وہ دُنیا میں مشہور ہو چکے تھے جب میں لاہور پہنچی تو مجھے یہ سب کچھ معلوم تھا۔ بانو اور جاوید دونوں سکول جاتے تھے میرے آنے سے پہلے ہی انہیں قرآن پڑھانے

کے لئے مولوی صاحب مقرر تھے ۔ جاوید سنٹرل ماڈل سکول میں پڑھتے تھے اور منیرہ ایک مسلم سکول میں۔ لیکن مجھے وہ پسند نہیں آیا ۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے بات کی۔ انہوں نے کہا آپ بانو کو اپنی مرضی کے سکول میں داخل کرا سکتی ہیں ۔ میں نے کہا میں اس شہر میں نئی ہوں۔ نہیں جانتی اچھا سکول کونسا ہے۔ آپ کسی سے کہیں کوئی اچھا سکول تلاش کر کے بتائے ۔ انہوں نے کہا یہ کام آپ کو خود کرنا ہوگا۔ میں نے اپنے طور پر تمام گرلز سکولوں کا جائزہ لیا اور بانو کے لئے کینرڈ سکول پسند کیا۔ مشنری سکولوں میں تمام بچے صبح مذہبی رسوم میں شرکت کرتے ہیں ۔ جب میں نے ڈاکٹر صاحب کو اس کے متعلق بتایا تو انہوں نے کہا مجھے بانو کے سکول کی مذہبی رسوم میں شرکت کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ۔ میں نے خود بائبل پڑھی ہے ۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ سکول میں دیگر بچوں کی طرح پڑھے مگر ساتھ ساتھ اسے اپنے مذہب کے متعلق بھی پوری تعلیم دی جائے تاکہ وہ اس مذہب کی رُوح سے آگاہ ہو اور خود اس کو سمجھنے کے قابل ہو۔ مس ڈورا نے بتایا کہ بانو کو بچپن میں کہانیاں سُننے اور سُنانے کا بڑا شوق تھا۔ ایک رات سونے سے پہلے اس نے مجھے قصّہ یوسفؑ کہانی کے سے انداز میں سُنایا میں قرآن کے انگریزی ترجمہ میں یہ قصّہ پڑھ چکی تھی ۔ بانو سے پوچھا کہ کیا اس نے بھی یہ قصّہ قرآن میں پڑھا ہے ۔ اس نے کہا نہیں ۔ میں حیران ہوئی کہ قرآن پڑھتی ہے اور اصل قصّہ نہیں جانتی بانو نے بتایا کہ مولوی اسے قرآن عربی زبان میں پڑھاتا ہے ۔ اور وہ عربی نہیں جانتی۔ میں نے علامہ کے دوست اور ان کے بچوں کے سرپرست دہلی چوہدری محمد حسین مرحوم سے بات کی کہ وہ کوئی ایسا مولوی لائیں جو قرآن پڑھانے کے ساتھ ساتھ بچوں کو سمجھا بھی سکے تاکہ وہ اسکی تعلیمات اور رُوح سے آگاہ ہو سکیں ۔

قرآن اور اقبال

ڈاکٹر صاحب کو قرآن سے عشق تھا مس ڈورا نے بتایا۔ "ایک روز انہوں نے مجھے بلایا اور کہا آج ایک بہت مشہور عرب قاری آنے والا ہے جب وہ آئے تو میرے بچوں کو میرے کمرے

میں بھیج دینا اور اگر آپ پسند کریں تو خود بھی آجائیں۔ میں اس سے قرآن سُننا چاہتا ہوں۔ قاری آیا تو بچوں کے ساتھ میں بھی ان کے کمرے میں گئی۔ ڈاکٹر صاحب (وہ علاّمہ کو ڈاکٹر صاحب کہتی ہیں) بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئے قاری نے قرآن کی تلاوت کی۔ ڈاکٹر صاحب دونوں ہاتھوں میں سر کو پکڑے ہوئے بیٹھے تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش جاری تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے بستر پر ہر وقت قرآن موجود رہتا جسے وہ تکیہ کے سہارے بیٹھے، لیٹے ہوئے ہر وقت پڑھتے رہتے تھے۔ بعض اوقات وہ نماز بھی چارپائی پر ہی ادا کرتے تھے۔

فاطمہ اور ڈورا

بانو بہت شریر تھی۔ ایک روز شام کے کھانے کے بعد علامہ کے کمرے میں سب بیٹھے تھے وہ ضد کرنے لگی کہ آپا جان کہو " لا الٰہ الا اللہ ..... " میں کہتی نہیں تھی اور وہ ضد کیے رہی تھی کہ اچھی آپا جان کہو نا۔ میرے لئے۔ ایک ہی بار کہہ دو۔ میں نے کہہ دیا۔ وہ خوشی سے اُچھل پڑی اور کہا۔ اب آپا آپ مسلمان ہو گئی ہیں اور آپ کا نام فاطمہ ہے" علامہ ان کی اس ضد پر بہت خوش ہوئے۔ اور ہنسنے لگے۔

پاکستان کی ضرورت

ہم نے مس ڈورا سے پوچھا کہ کیا آپ جانتی تھیں کہ علاّمہ ایک مُلک۔ ایک مُسلمان مُلک کے قیام کا نظریہ پیش کرنے کے بعد اس کے وجود میں لانے کی جدوجہد میں مصروف رہے تھے کبھی آپ سے اس سلسلہ میں کوئی بات ہوئی؟ اُنہوں نے جواب دیا" ہاں میں ڈاکٹر صاحب کو باہر سے آنے والے خطوط پڑھ کر سُنایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ لندن سے مُسلمان طلبہ کا ایک خط آیا جس میں پاکستان کے قیام پر زور دیا گیا تھا اور ڈاکٹر صاحب سے مشورہ مانگا گیا تھا۔ خط پڑھ کر میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ کیا بات ہے دُنیا میں لوگ اکٹھے ہو رہے

ہیں اور آپ الگ ۔ برِ صغیر کے مسلمانوں کو آپ الگ کر کے ان کے لئے الگ ملک قائم کرنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے کہا بیٹھو میں تمہیں بتاتا ہوں اس کی کیا ضرورت ہے ۔ پھر انہوں نے برِ صغیر کی تاریخ مسلمانوں کے ماضی اور حال، مذہب رسم و رواج کے حوالہ سے پاکستان کے قیام کی ضرورت پر تفصیلی بات کی اور کہا کہ مسلمانوں کے بحیثیت قوم زندہ رہنے کے لئے ان کے الگ ملک کا قیام ضروری ہو گیا ہے ۔ اس کے بغیر ان کی بقا ممکن نہیں ہو گی۔ ہم نے پوچھا پاکستان بن جانے پر آپ نے کیا محسوس کیا؟ کہنے لگیں یہ کہ آج ڈاکٹر صاحب زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے ۔ انہوں نے بتایا کہ موت سے پہلے بچوں کے مستقبل سے بھی زیادہ انہیں برِ صغیر کے مسلمانوں کے مستقبل کی فکر رہتی تھی ۔ وہ کہتے تھے ان کا کیا بنے گا لیکن یہ بھی کہا کرتے تھے کہ پاکستان قائم ہو کر رہے گا ۔

سیاست اور اقبال

مس ڈورا نے بتایا کہ گھر میں دو اخبار آتے تھے ایک اردو اور ایک انگریزی ۔ میں انہیں انگریزی اخبار پڑھ کر سناتی تھی ۔ اخبار پڑھنے اور سننے کے دوران وہ خبروں پر تبصرہ کرتے ہوتے کبھی کبھی میرے ساتھ سیاسی معاملات پر بھی بات چیت کرتے تھے ۔ مگر عام قسم کی ، لیکن ان سے ملنے اور مشورہ کرنے والے بہت لوگ آتے تھے جن سے وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے لیٹے بات چیت کرتے تھے ۔ میرے جاوید منزل میں قیام کے دوران ہی محمد علی جناح اور پنڈت نہرو انہیں ملنے آتے تھے ۔ جس روز محمد علی جناح ملنے آئے ڈاکٹر صاحب نے پہلے سے ہدایت کی تھی کہ آج ایک بہت بڑے آدمی گھر میں آنے والے ہیں جب وہ آئیں تو جاوید کو میرے کمرے میں بھیج دینا ۔

احباب

مس ڈورا نے بتایا کہ جو احباب ڈاکٹر صاحب کے پاس اکثر آتے تھے ان میں میاں

امیر الدین، ڈاکٹر عبدالمجید، سید نذیر نیازی، چوہدری محمد حسین، راجہ حسن اختر، محمد حسن قریشی اور محمد شفیع شامل تھے۔ سید نذیر نیازی اور شفیع ان کے خطوط کے جواب لکھتے تھے یا جو کوئی اور چیز وہ لکھنا چاہتے۔ علامہ لکھواتے تھے اور نیازی صاحب لکھا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے انہیں شعر بھی لکھواتے ہوں چوہدری محمد حسین ہر روز آتے تھے ڈاکٹر صاحب اپنے پلنگ پر لیٹے رہتے۔ چوہدری صاحب پاس زمین پر بیٹھ جاتے اور پھر گھنٹوں ان سے آہ تیں کیا کرتے انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد بھی چوہدری محمد حسین کا یہ معم عا کر وہ ہر روز آتے تھے اور مجھ سے بچوں کی صحت، تعلیم اور دیگر گھریلو مسائل کے علق پوچھتے تھے، وہ کہتی ہیں چوہدری صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔

عدمِ تکلّف

مس ڈورا نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب ہر ملنے والے سے اس کے ذہنی معیار کے مطابق بات چیت کرتے تھے اور بڑی بے تکلفی سے ملتے تھے۔ اسے احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اتنے بڑے مفکر اور شاعر سے مل رہا ہے اور وہ یہ تاثر دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنی پہلی ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ علی گڑھ میں پروفیسر رشید صدیقی ان کی بہت تعریف کیا کرتے تھے کہ وہ بہت بڑے مفکر اور انسان ہیں۔ جب میں جاوید منزل پہنچی تو وہ شلوار قمیص میں ملبوس بیٹھے تھے۔ ان سے ملاقات کے وقت

I was a litte bit nervous.

لیکن جب ان سے بات چیت کی تو

I felt immediately at ease

ملازموں سے سلوک

ملازموں سے ان کا سلوک بہت اچھا تھا وہ انہیں کبھی نہیں ڈانٹتے تھے اعلامہ کے

دیرینہ ذاتی ملازم، علی بخش سے اگر کوئی بڑی غلطی ہو جاتی تو وہ صرف یہ کہتے "علی بخش تو بہت بے وقوف ہے" علی بخش کو ڈاکٹر صاحب سے بہت محبت تھی اور وہ بہت ہی وفادار ملازم تھا۔ مس ڈورا نے بتایا کہ میرے آنے سے پہلے گھر کا تمام نظام حساب کتاب اسی کے ذمہ تھا۔ جب میں آئی تو حساب کتاب میرے حوالے کر دیا گیا جسے علی بخش نے بہت برا محسوس کیا۔ میں بازار سے واپسی پر اس سے ہر چیز کا حساب مانگتی تھی اور پھر ڈاکٹر صاحب کو بتاتی تھی مگر وہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ علی بخش سے انہوں نے کبھی نہیں پوچھا تھا کہ کیا چیز کتنے کی آئی۔ اسی لئے وہ مجھ سے ناراض ہوتا تھا مگر تھوڑے ہی دنوں بعد اس کی ناراضگی جاتی رہی اور وہ میرے ساتھ باقی تمام عرصہ بڑی خوشی سے کام کرتا رہا۔

خوراک

مس ڈورا نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب گائے کا گوشت قطعاً نہیں کھاتے تھے۔ انہوں نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ "انہیں اور بچوں کو گائے کا گوشت ہرگز نہ دیا جائے" شامی کباب اور قیمہ بھرے کریلے انہیں بہت پسند تھے۔ دال گوشت بھی پسند کرتے تھے۔ میں بچوں کے لئے کیک تیار کرتی تو بانو انہیں بتاتی کہ آپ نے کیک بنائے ہیں تو وہ ایک آدھ کیک چکھ لیتے تھے اور اس کی تعریف کرتے تھے۔ مجھے خوش کرنے کے لئے۔ پھلوں میں انہیں آم بہت پسند تھا۔ میاں امیر الدین اپنے باغ سے ان کے لئے آم لایا کرتے تھے وہ چھوٹے چوسنے والے آم اور بڑے کاٹ کر کھانے والے آم پسند کرتے تھے۔ ایک دفعہ میاں صاحب ان کے لئے ایک نئی قسم کا آم لائے جو پیوند کاری سے ان کے مالیوں نے تیار کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ آم بہت پسند کیا اور کہا اس کا نام ٹیپو سلطان رکھا جائے۔

سفرِ آخرت

مس ڈورا نے بتایا کہ جس وقت ڈاکٹر صاحب کی وفات ہوئی ان کے دوست اور خصوصی معالج حکیم حسن قرشی حیدر آباد دکن گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹروں کو بلایا گیا تو وہ کہتے تھے۔اب یہ لوگ مجھے ٹیکے لگائیں گے۔ قرشی ہوتا تو اس کی دوائی سے مجھے جلد آرام ہوتا۔ وہ قرشی صاحب کی دوائی لے لیتے تھے۔ مگر ڈاکٹروں کی دوائی پسند نہیں کرتے تھے۔ ہم نے پوچھا کہ ان کی وفات پر آپ نے کیا محسوس کیا؟ کہنے لگی میں سوچ رہی تھی کہ جو بچے اپنی ماں سے محروم ہیں اب وہ اپنے باپ سے بھی محروم ہوگئے ہیں۔ میرے لئے یہ احساس بڑا تکلیف دہ تھا۔

اقبال کی شاعری اور مس ڈورا

ہم نے پوچھا کہ آپ نے علامہ کی شاعری سے کیا کچھ پڑھا ہے۔ انہوں نے جواب دیا شاعری پڑھنے کی نہیں محسوس کرنے کی چیز ہے۔ پڑھنے والے کو لکھنے والے کی فکری گہرائی محسوس کرنا چاہیئے۔ میں اردو تھوڑی بہت بول لیتی ہوں مگر اتنی سمجھتی نہیں کہ ڈاکٹر صاحب جیسے مفکر کی فکر کی گہرائیوں کو محسوس کر سکوں، ایک بار ایک جرمن نے علامہ کی شاعری کا جرمن ترجمہ انہیں پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے وہ کتاب مجھے پڑھنے کو دی تھی۔ اس سے پتہ چلا کہ وہ کتنے بڑے شاعر اور مفکر ہیں اور پھر انہوں نے ڈاکٹر جاوید اقبال سے پوچھا کہ وہ کتاب کہاں ہے؟ انہوں نے جواب دیا جو ایک سو کتاب علامہ، جاوید کے پڑھنے کے لئے چھوڑ گئے تھے ان میں تو نہیں ہے۔ مس ڈورا نے کہا: it is great pitty. اور بتایا کہ علامہ کی شاعری کے انگریزی تراجم بھی وہ پڑھ چکی ہیں۔

خواجہ عبدالرحیم

اقبال کی تدفین

بیسویں صدی کے نصف اوّل کا دم وا پسیں تھا کہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو حکیم الامّت علامہ اقبالؒ نے سفرِ آخرت اختیار کیا ؎

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ نا ید

ہمارے سامنے ان کی رحلت کے فوراً بعد یہ سوال تھا کہ قوم کے اس مایۂ ناز فرزند کو سپردِ خاک کرنے کے لیئے کون سی جگہ موزوں ہو سکتی ہے۔ یہ سوال اس لیئے بھی اہم تھا کہ ہم ایک ایسے وجود کو لحد میں اتارنے والے تھے جس کی تاریخ ساز شخصیت نے نہ صرف مُسلمانوں کی حیات ملّی کا ساز و سامان مہیّا کیا۔ بلکہ قدرت نے اس کی ذات گرامی پر قبول عام اور شہرت دوام کی غیر فانی مہریں ثبت کر دی تھیں۔ یہ اقبال ہی تھے جنہوں نے دُنیائے اسلام کی رگ و پے میں نشاۃ ثانیہ کی رُوح پھُونکی اور تقدیر اُمم کی تعمیر و تشکیل کے لئے مستقبل میں جو تاریخی کردار اس دُنیا کو ادا کرنا تھا اس کا شعور بھی اس مردِ حق آگاہ نے بیدار کیا اس برّ صغیر کے مُسلمان اس حقیقت سے اس کی حکیمانہ تعلیمات ہی کی بدولت آگاہ ہُوئے کہ وہ من حیث المسلم ایک قوم ہیں اور انہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی قومی سالمیّت کے تحفّظ کی خاطر ایک جداگانہ ملک کا مطالبہ کریں تاکہ انہیں اپنی امتیازی ذکاوت، دین و دیانت، تاریخ و سیرت اور ماضی کی

کی پُرشکوہ روایات کے مطابق معیشت و معاشرت کے مواقع میسّر آسکیں۔ یہی وہ سرزش غیبی تھا جس نے اُمّتِ مُسلمہ کو یہ رُوح پرور پیغام دیا کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اس نے اپنی قوم پر یہ حقیقت واضح کی کہ اس کے افراد کی قسمت میں محض ہیزم کشی اور سقائی کے گرے پڑے پیشے نہیں ہیں بلکہ یہ تو وہ ہیں جن کے نقوشِ قدم کبھی خورشید در آغوش بھی ہو سکتے ہیں ؎

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سُلطانی کے گنبد پر
تُو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

غرض یہ تھی وہ عبقریت مآب شخصیت جس کی ابدی خوابگاہ کے لئے موزوں ترین مقام کے انتخاب کا مسئلہ زیرِ غور تھا۔

حکیم الاُمّت کے نیاز کیش جاں نثار چوہدری محمد حسین مرحوم، راجہ حسن اختر (جنہیں بارہ سال تک علاّمہ کی صُحبت سے فیضیابی کے مواقع میسّر آئے) اور دیگر متعلقین نے یہ فیصلہ کیا کہ شاہی مسجد کی سیڑھیوں کے قریب حکیم الاُمّت کی آرام گاہ بنے موزوں ترین مقام یہی ہو سکتا ہے۔

صُوبائی حکومت کے سربراہ سکندر حیات خاں مرحُوم نے اس فیصلہ سے اتفاق نہیں کیا سر سکندر حیات خاں پنجاب سے باہر دورہ پر تھے کہ میاں امیرالدین نے ان سے تار کے ذریعے مذکورہ مقام پر تدفین کی اجازت طلب کی لیکن اُنہوں نے نفی میں جواب دیا اور یہ متبادل تجویز پیش کی کہ اسلامیہ کالج کے میدان میں اس مقصد کے لئے کسی مقام کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ مُسلمانانِ لاہور کی ملی جلی آرزوؤں کا احترام کرتے ہوئے علاّمہ کے عقیدت کیش اپنے فیصلے پر جمے رہے اس اثنا میں حیرتناک صُورتحال یہ پیش آئی کہ خود گورنر صُوبہ سرہنری کریک نے بروقت

ان کے ساتھ ہمدردانہ تعاون کیا۔ اس شریف النفس انگریز کی مدد سے ان تمام مشکلات پر قابو پالیا گیا جو محکمہ آثار قدیمہ سے گفت و شنید کے سلسلے میں پیش آئیں۔ کیونکہ یہ مقام اسی محکمہ کی زیرِ نگرانی تھا۔ مختصر یہ کہ حکیم الامّت کی تدفین کے لیئے مطلوبہ مقام کی اجازت مل گئی۔ اس آرامگاہ کے انتخاب سے حکیم الامّت کی وہ آرزو بھی پوری ہو گئی جس کا اظہار موصوف نے اپنی بصیرت کی بنا پر اس شعر میں کیا تھا:

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش　　مرقدے در سایۂ دیوار بخش

تا بیاساید دل بیتاب من　　بستگی پیدا کند سیماب من

با فلک گویم کہ آرامم نگر　　دیدۂ آغازم انجامم نگر

سکھ ہندو رہنما اس مقام تدفین کے انتخاب پر بہت جز بز ہوئے، مزار کی تعمیر تعمیری سامان کی فراہمی اور دیگر معاملات کے سلسلے میں مزار کی کمیٹی نے جو تدابیر اختیار کی تھیں ان میں کافی رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ لوکل سیلف گورنمنٹ کے سکھ وزیر سردار سندر سنگھ مجیٹھیا نے جو تعمیرات کے سلسلے میں اجازت دینے یا نہ دینے کے کل اختیارات رکھتے تھے سختی کے ساتھ مزاحمت کی۔ جب میاں امین الدین جو قیامِ پاکستان کے بعد پنجاب کی گورنری کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ میڈیکل اینڈ لوکل سیلف گورنمنٹ کے محکموں کے سیکرٹری مقرّر ہوئے تو راستہ کی تمام مشکلات رفع ہو گئیں۔ موصوف کی کوششوں سے تعمیر مزار کے سلسلے میں اجازت یابی کے تمام مرحلے طے ہو گئے۔

مزار کی تعمیر کا جو نقشہ زیرِ تجویز تھا اور اس کے سلسلے میں جو تدابیر زیرِ غور تھیں انکی تکمیل و اتمام کی راہیں بعض وزراء اور سرکاری افسروں کے غیر ہمدردانہ طرزِ عمل سے بہت حد تک مسدود ہو کر رہ گئیں۔ بعض دشواریاں ایسی بھی تھیں جو مزار کے محل وقوع اور ان اقدار پر اثر انداز ہوتی تھیں جو مزار کے مجوزہ نقشہ کی رُو سے اس کی ہیئت ترکیبی کا جزو لازم قرار دی گئی تھیں۔

الف:۔ مزار کسی صورت میں بھی صحن مسجد کی فصیل سے اُونچا نہ ہو۔ دُوسرے لفظوں میں یہ کہ تعمیر مزار کی اُونچائی دس بارہ فٹ سے زیادہ نہ ہونے پائے۔

ب:۔ نقشۂ تعمیر گردوپیش کی تعمیرات کے عین مطابق ہو۔

ج:۔ الف اور ب کی قیود کے باوجود یہ ضروری سمجھا گیا تھا کہ مزار کی تعمیر اس انداز سے ہونی چاہیئے کہ اس سے اقبالؒ کے فلسفۂ خودی اور نظریۂ قومیت وغیرہ کی شان نمایاں ہو جائے۔ مرحوم چوہدری محمد حسین کی تمنا تھی کہ مزار اقبال اس حقیقت کا مظہر ہو۔

جہانگیری بخاک ما سرشتند — امامت بر جبین ما نوشتند
درونِ خویش بنگر آن جہاں را — کہ تخمش در دلِ ما ورق کشتند

مزار کمیٹی نے تعمیر کے سلسلے میں ان تمام ماہرینِ فنِ تعمیر کے مشوروں سے استفادہ کیا۔ جن تک آسانی سے رسائی ہو سکتی تھی۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ حیدر آباد دکن کے نواب زین یار جنگ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ انجام کار انہی کے تعمیری خاکے کے مطابق مزار کی تعمیر ہُوئی۔ لیکن اس موقع پر ہمیں بلا تامل یہ کہہ دینا چاہیئے کہ ان کے پہلے اور بعد کے خاکے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلے خاکے سے صاف یہ نظر آتا ہے آتا تھا کہ یہ کسی بُلبل کا قفس ہے اور یہی وجہ تھی کہ اسے کالعدم قرار دیا گیا۔

مجھے خُوب یاد ہے۔ نواب زین یار جنگ بہادر شاہی مسجد میں تھے اور چوہدری محمد حسین مرحُوم انہیں یہ سمجھا رہے تھے کہ گردوپیش کی عمارت میں مزار کی کیا حیثیت اور کیا اہمیت ہے اس وقت ان کے ہمراہ راجہ حسن اختر، میاں امین الدین مرحوم، سر سکندر حیات خاں اور راقم الحروف بھی تھے۔ چودھری صاحب مرحوم کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی اور ان کی زبان پر یہ فقرے کہ مزار کے غرب میں شاہی مسجد ہے جس سے اسلام کی رُوحانی طاقت کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ اس کے بالمقابل مشرق میں شاہی قلعہ ہے جو اسلام کی دُنیاوی عظمت کا مظہر ہے۔ تیسری سمت رنجیت سنگھ کی مڑھی ہے جو اسلام سے بغاوت کی یادگار ہے چوتھی جانب حکیم الامت

کا مزار ہے جنہیں مجدّد ملّت کہا جا سکتا ہے۔ مزارِ اقبال کا نقشہ کچھ ایسا ہونا چاہیئے، کہ سنگ و خشت کی خاموش زبانیں حقیقت کی ترجمانی کریں اور ان کی ترتیب و تعمیر سے اس حقیقت کا انکشاف ہو کہ اقبال کا کلام اور اس کا پیام فقر و سلطنت۔ اور درویشی و شاہی کا ایک حسین امتزاج تھا۔

ان توجیہات سے نواب زین یار جنگ بہادر کے دماغ میں تخلیق و ایجاد کی برقی رَو دوڑ گئی اور پہلے سے ان کے ذہنی تصورات میں جو نقشہ بنا ہوا تھا اسکی بساط ہی اُلٹ گئی دکن کے اس ماہر تعمیرات نے از سرِ نو کام کا آغاز کیا صلاح و مشورے کے بعد موصوف نے وہ تعمیری خاکہ تیار کیا جسے انجام کار قبولِ خاص و عام کی سند ملی مزار کمیٹی نے شروع دن سے یہ طے کیا تھا کہ وہ مزار کی تعمیر کے سلسلے میں عوام سے چندہ کی اپیل نہیں کرے گی اور وہ اس لئے کہ مزار کمیٹی کو معلوم تھا کہ حکیم الاُمّت عوامی چندوں اور سرکاری مدد کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے مزار کمیٹی نے ایک حکمران اور ایک بہت بڑے تاجر کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ یہ اس شرط پر تعمیر کے جملہ مصارف برداشت کرنے کے لئے آمادہ تھے کہ ان کے ناموں کی تختیاں مزار کے ساتھ نصب کر دی جائیں۔ کمیٹی ایسی پیشکش قبول نہیں کر سکتی تھی۔ اقبال اپنی قوم کا اقبال تھا اس کی اُمیدوں اور آرزوؤں کا مرکز، یہ کیسے گوارا کیا جا سکتا تھا کہ اس کے نام کی آڑ میں حکمرانوں اور تاجروں کی دولت و ثروت کے چراغ جلیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد مسٹر غلام محمد مرحوم نے جب کہ وہ وزیر مالیات تھے حکومت کی طرف سے کچھ رقم کی پیشکش کی لیکن مزار کمیٹی نے اپنی سابقہ روایات کے پیشِ نظر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کمیٹی کو اس امر سے ایک گونہ مسرت اور اطمینان ہوا کہ مزار کی تعمیر حکیم الاُمّت کے خیر خواہوں اور عقیدت کیشوں کی نجی کوششوں سے پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

مزار کے بیرونی حصّہ پر سنگِ سُرخ اپنی چھب دکھا رہا ہے اور یہ اس مناسبت سے کہ شاہی مسجد کا بیرونی حصّہ بھی سنگِ سُرخ کا جامہ زیبِ تن کئے ہوئے ہے۔ مزار کے

اندرونی حصہ میں مکرانی سنگِ مرمر کی سلیں جڑی ہوئی ہیں۔ یہ دونوں قسم کے پتھر راجپوتانہ سے درآمد کئے گئے تھے۔ ہر دو قسم کے پتھروں کے درآمدہ مال کی آخری قسط ابھی راستہ ہی میں تھی کہ تقسیم ملک کا سلسلہ پیش آگیا اس لئے یہ سامان کھوکھراپار کے راستے منگانا پڑا۔ فروری ۱۹۵۰ء کو تعمیر کی مہم سر ہوئی۔ مسٹر بشیر احمد انجینئر انچارج نے تعمیر کے سلسلے میں رضاکارانہ خدمات پیش کیں۔ مزار کی حسب ذیل خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ مزار کی چھت تمثیلی اشاریت کی حامل ہے اس کے وسط میں اسم "محمدؐ" کندہ ہے چاروں گوشوں میں اقبال کا نام ہے اس انداز میں کہ ہر نام کی ایک برقی لہر مرکز کی طرف مائل ہے۔ اس تمثیلی اشاریت سے یہ اظہار مقصود ہے کہ اقبال نے جس مرکز انوار سے اقتباس نور کیا ہے وہ ذات ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور انہی کی الہامی تعلیمات کا پرتو اس کے کلام اور اس کے پیغام پر پڑا ہے۔

۲۔ مغربی دیوار پر خط کوفی میں قرآنِ حکیم کی یہ آیت شریف کندہ ہے جو حکیم الامّت کو بے حد مرغوب تھی۔ کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ ۔۔۔۔ الخ

۳۔ مندرجہ ذیل اشعار جو چودھری محمد حسین مرحوم کے خیال کے مطابق حکیم الامّت کے نصب العین اور ان کے پیغام کا ملخص پیش کرتے ہیں، بخط نستعلیق مزار کی چار دیواری پر کندہ ہیں۔

درم مراصفت باد فرودیں کردند   گیاہ را ز سرشکم چو یاسمیں کردند
نمود لالۂ صحرا نشیں ز خونابم   چنانکہ بادۂ لعلے لبا نگیں کردند

بلند بال چنانم کہ بر سپہر بریں   ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند
فروغ آدم خاکی ز تازہ کاریہاست   مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

چراغ خویش برافروختم کہ دستِ کلیم — دریں زمانہ نہاں زیرِ آستیں کردند

درآ بسجدہ و یاری زخسرواں مطلب — کہ روزِ فقر نیاگان ما چنیں کردند

مارچ ۱۹۵۰ء میں جب شاہ ایران نے مزار کی زیارت کی تو وہ ان اشعار سے بہت متأثر ہوئے۔ خطاطی سے متعلق شاہ موصوف نے ان الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا۔

"خوشخطی خوب است"

یہ خطاط وہی ماہرِ فنِ خطاطی عبدالمجید پروین رقم ہیں جنہوں نے اپنی ندرتِ فنکارانہ کمال کا مظاہرہ چودھری محمد حسین مرحوم کی ترغیب اور ان کی عقاب نگاہی کی بدولت کچھ ایسے بے نظیر انداز میں کیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ چودھری محمد حسین کو فنونِ لطیفہ سے خاص شغف تھا اور ان کی نگاہ احتساب زشت و خوب میں بڑی بالغ نظری کے ساتھ امتیاز کرتی تھی اس کا اندازہ اقبال کے دواوین میں متنِ اشعار کی کتابت اور طباعت کی نفاست سے کیا جا سکتا ہے، چودھری صاحب موصوف کتابت کے حسن و قبح پر کڑی نظر رکھتے اور اس سلسلے میں گرمجوشی کے ساتھ اپنی توجہات صرف کرتے تھے۔

کافی غور و خوض کے بعد چودھری صاحب موصوف نے بھی بعض اشعار کا انتخاب کیا تھا اور جن کے بارے میں یہ طے ہے کہ انہیں بھی کندہ کرایا جائیگا۔

مزار کی دیوار کے اس بیرونی حصہ پر جو شاہی مسجد کی سیڑھیوں کی جانب ہے ایک تختی نصب ہے جس پر مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں

بیا تا کارِ ایں اُمّت بسازیم — قمارِ زندگی مردانہ بازیم

چناں نالیم اندر مسجدِ شہر — کہ دل در سینۂ ملا گدازیم

الف:- ان اشعار میں ہماری بے رُوح قیادت پر پوست کندہ تنقید کی گئی ہے اور قوم کو یہ پیغام دیا گیا ہے کہ وہ اجتماعی حیثیت سے فریاد کرے یعنی آمادہ کار رہتا کہ بے رُوح قیادت کے پہلو میں جو دل ہے پگھلے اور وہ قوم کی فریاد کان دھر کر سُننے یعنی جو

فرائض منصبی اس پر عاید ہوتے ہیں ان سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہو۔

تعویذ مزار حکومتِ افغانستان کا عطیہ ہے۔ سردار صلاح الدین سلجوقی کو جو تقسیم سے قبل کئی سال تک نئی دہلی میں افغان قونصل جنرل تھے اس عطیہ تعویذ کے اخذ و حصول اور داد و دہش کا شرف حاصل ہے اس وقت اس عطیہ کی مالیت تین لاکھ کابلی، کے قریب تھی۔ سلجوقی سردارِ اقبال کا عقیدہ تمند تھا اور جب حکیم الاُمّت کی وفات کے بعد یہ سردار فاتحہ خوانی کے لئے لاہور آیا تو یہ دیکھنے میں آیا کہ وہ ایک یتیم اور لاوارث بچے کی طرح اپنے شفیق باپ کی یاد میں دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ تعویذ افغانستان کے نہایت بیش قیمت پتھر سے تیار کیا ہوا ہے۔ یہ پتھر laphlazali کے نام سے موسوم ہے۔

کابل میں شہنشاہ بابر کے مقبرہ میں بھی یہی پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ سفید فام پتھر جو دیکھنے میں بڑا حسین و جمیل ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں جن میں اقبال کی تعلیم کا بنیادی رُخ نظر آتا ہے۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم | چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است | کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

ان اشعار میں وہ بُنیادی صداقت پیش کی گئی ہے کہ اگر تمام مُسلم اقوام نظری و عملی حیثیت سے اس پر عمل پیرا ہوں تو وہ ایک نئی دُنیائے اسلام کی تعمیر کر سکتی ہیں، اور ایسی تعمیر جو آج کی پریشان حال اور مصیبت زدہ دُنیا کے استحکام کا باعث ہو۔ دُنیائے اسلام سے باہر جن نظامات و دساتیر پر عمل ہو رہا ہے اور جن کے مطابق تعلیم و تلقین کا سلسلہ جاری ہے ان سے قطع نظر مُسلم ممالک معاشرتی اور اقتصادی حیثیت سے اپنی بُنیادیں مستحکم کر سکتے ہیں۔

عطیہ بیگم

اقبال

اقبال کے بارے میں اپنے تجربات اور معلومات کا صحیح اور مکمل خاکہ پیش کرتے وقت میں صرف اپنی یادداشت پر اعتماد نہیں کرنا چاہتی اور چونکہ وہ اور بعض خطوط جو میں نے یورپ سے اپنی بہنوں کے نام واقعات کے ذاتی ریکارڈ کی حیثیت سے پرائیویٹ ڈائری کی صورت میں بھیجے تھے، آسانی سے مل گئے ہیں اس لئے میں روزمرّہ کی وہ باتیں بیان کرنے کے قابل ہو گئی ہوں جن سے ان امتیازی کیفیات، ذہنی رجحانات اور بعض مخصوص خصائص کی تشریح ہو جاتی ہے جنہوں نے یورپ میں زمانۂ طالب علمی میں اقبال کی شخصیّت کی تعمیر کرنے میں مدد دی تھی۔

پہلی اپریل ۱۹۰۷ء کے لئے مس بیک نے انہی کے الفاظ میں مجھے "ایک مخصوص دعوت نامہ" بھیجا تاکہ میں ایک ذہین اور طباع طالب علم سے ملاقات کروں جن کا نام محمد اقبال ہے، جو کیمبرج سے خاص طور پر مجھ سے ملنے کے لئے آ رہے ہیں۔ اس دعوت نامہ نے میرے لئے قدرے دلچسپی پیدا کر دی کہ اس سے قبل میں نے اقبال کا نام بھی نہ سنا تھا اور چونکہ لندن میں مختلف ہندوستانیوں کے پاس سے میرے پاس ایسے دعوت نامے آیا کرتے تھے اسلئے اس دعوت نامے نے عارضی شوقِ تجسّس سے زیادہ اور کوئی جذبہ پیدا نہیں کیا۔ مگر چونکہ مس بیک لندن کے مقیم ہندوستانی طلبا کی بہبودی کی نگران تھیں اور ان سے مادرِ مشفق کا سا برتاؤ کرتی تھیں اس لئے ان کے حکم کی تعمیل لازمی تھی۔ کھانے کی میز پر جو گفتگو ہوئی اس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ اقبال فارسی اور عربی کے علاوہ سنسکرت میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ بہت بڑے حاضر جواب ہیں اور دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے اور حاضرین پر مزاحیہ فقرے کسنے

میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ مس بیک نے ان کے آنے سے پہلے یہ حقیقت ذہن نشین کردی تھی کہ وہ صرف مجھ سے ملنے کے لئے آ رہے ہیں اور چونکہ میں نے سیدھی سادی اور بے لاگ فطرت پائی تھی اسی لئے میں نے اقبال سے پوچھا کہ اس ملاقات کی وجہ کیا ہے۔ ان کی عمیق آنکھوں سے یہ ظاہر نہ ہو سکا کہ آیا وہ تعریف یا تعریض سے کام لے رہے ہیں جبکہ انہوں نے کہا کہ "آپ لندن اور ہندوستان میں اپنے سفر کی ڈائری کے باعث بہت مشہور ہو چکی ہیں اور اس لئے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں آپ سے ملاقات کروں" میں نے ان سے کہا "میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ آپ نے کیمبرج سے یہاں تک آنے کی زحمت صرف اس لئے گوارا کی کہ آپ مجھے ہدیۂ تحسین پیش کریں۔ لیکن مذاق کو بالائے طاق رکھیے اور بتایئے کہ اس کی تہ میں حقیقی مقصد کیا ہے؟" میری اس صاف گوئی اور رُوکھے پن پر وہ قدرے متعجب بھی ہوئے اور کہا: "میں آپ کو مسٹر اور مسز سید علی بلگرامی کی طرف سے دعوت دینے آیا ہوں کہ آپ کیمبرج میں ان کی مہمان بنیں اور میرا مشن یہ ہے کہ میں بغیر کسی رکاوٹ کے آپ کی منظوری ان تک پہنچا دوں۔ اگر آپ انکار کر دیں گی تو اس ناکامی کا داغ مجھ پر رہے گا جسے میں نے آج تک کبھی قبول نہیں کیا اور اگر آپ دعوت منظور کر لیں گی تو آپ درحقیقت میزبانوں کی عزت افزائی کریں گی۔"

اقبال کو حسبِ خواہش اپنے تئیں دلچسپ اور خوشگوار بنانے کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ سوسائٹی میں وہ بہت زندہ دلی کا ثبوت دیتے تھے اور حاضر جوابی میں یا تعریف کرنے میں وہ کبھی نہیں جھجکتے، اگرچہ بسا اوقات ان کے مذاق میں طنز کا رنگ نمایاں ہوتا تھا دورانِ گفتگو میں حافظ کا ذکر آگیا اور چونکہ میں خود اس شاعرِ اعظم سے دلچسپی رکھتی تھی اس لئے میں نے ان کے بہت سے برمحل اشعار سُنائے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ خود اقبال بھی حافظ کے بے حد مدّاح ہیں۔ انہوں نے کہا "میں جب حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں اُس وقت اُن کی رُوح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں اور میری شخصیت شاعر کی حیثیت

میں گم ہو جاتی ہے" انہوں نے ایک ایرانی شاعر کا ذکر کیا جسے ہندوستان میں کوئی نہیں جانتا اور مجھ سے کہا کہ "آپ بابا فغانی کے کلام کا ضرور مطالعہ کریں۔ ان کی بہت کم تصانیف ہندوستان دستیاب ہوتی ہیں لیکن ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے اسلئے کہ وہ ایک جداگانہ زاویہ نگاہ پیش کرتی ہیں۔" یہ ہیں اقبال سے میری پہلی ملاقات کے تاثرات اور اس کے دوران میں ہم نے طے کر لیا کہ میں ۲۲ اپریل کو کیمبرج پہنچوں گی۔

اس کے چند دن بعد اقبال نے مجھے فراسکے ٹی میں جو لندن کا ایک مشہور فیشن ایبل ہوٹل ہے، رات کے کھانے پر مدعو کیا تاکہ میں چند جرمن فضلا سے ملوں جن کے ساتھ مل کر وہ کام کر رہے تھے۔ اس ڈنر کے موقع پر ہر چیز نہایت قرینہ اور نزاکت سے سجائی گئی تھی اور جب میں نے اسکی تعریف کی اور داد دی تو اقبال نے کہا "میں دو شخصیتوں کا مجموعہ ہوں۔ ظاہری شخصیت کارآمد اور عملی ہے اور باطنی شخصیت خواب دیکھنے والے، فلسفی اور صوفی کی سی ہے۔" ڈنر سے قطع نظر کرتے ہوئے جو بہت ہی لذیذ تھا، میری ذہنی طور پر بھی دعوت ہو گئی، اس لئے کہ مجھے اقبال سے اور جرمن فلسفیوں سے گہرے فلسفیانہ مسائل پر گفتگو کرنے اور بحث کرنے کا موقع مل گیا۔ اس دعوت کے جواب میں میں نے ۱۵ اپریل کو ان کے اعزاز میں ایک چھوٹی سی پارٹی کا انتظام کیا جس میں میں نے اپنے چند فاضل دوستوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ ان میں مس سلوسٹر اور مس لیوی جو لندن میں زبان اور فلسفہ کے طالبات کی حیثیت سے بہت مشہور تھیں اور ایم مینڈل اور ہیر میٹر ٹرانف جو مشہور موسیقی دان تھے، خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ پارٹی میں بہت زندہ دلی کا اظہار کیا گیا اور جب اقبال نے فی البدیہہ چند شعر موزوں کر کے سنائے تو ان خواتین نے بھی اسی انداز میں مزاحیہ اشعار سے جواب دیا اور اس طرح فضا میں شروع سے آخر تک علمی پھلجھڑیاں چھٹتی رہیں۔ ایک موقع پر میں نے اقبال کے اشعار کو قلمبند کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر روک دیا:

"یہ باتیں اسی قسم کے خاص موقع کے لئے ہوتی ہیں اور ان کا مشن اسوقت ختم ہو

جاتا ہے جب وہ زبان سے ادا ہو جاتی ہیں"۔

ہمارے موسیقی دان دوستوں نے کلاسیکل موسیقی کا مظاہرہ کیا اور اس طرح سے جو تین گھنٹے وہاں صرف ہوئے ان کی یاد عرصہ دراز تک دلوں کو گرماتی رہی۔

جیساکہ پہلے سے طے پاچکا تھا ۲۲ اپریل ۱۹۰۷ کو میں کیمبرج روانہ ہو گئی۔ میرے ہمراہ اقبال اور شیخ (اب سر) عبدالقادر تھے۔ راستہ بھر یہ دونوں فاضل نہایت عالمانہ گفتگو میں مصروف رہے جس میں کبھی کبھی مذاق بھی ہو جاتا تھا۔ گفتگو کی نوعیت ایسی تھی جس سے مجھ کو بھی دلچسپی لیتی رہی یہانتک کہ ہم دوپہر کو بارہ بجے سید علی بلگرامی کے ہولکتہ پر پہنچ گئے۔ اقبال نے سید علی بلگرامی کے گھرانے والوں سے میرا تعارف اسطرح سے کرایا گویا کہ کوئی مقدس چیز ان کے سپرد کی جا رہی ہے، اور پھر کہا، "اگر زندگی میں مجھے کبھی ناکامی کا خطرہ پیش آیا تو وہ اس وقت تھا جبکہ میں مس فیضی سے ملا جنہوں نے محض آپ کے احترام میں آپ کے دعوت نامہ کو رد نہ کر کے میری لاج رکھ لی" اور آخر میں اپنا ایک فارسی شعر پڑھ کر سنایا۔ دن بھر بڑی اچھی گفتگو ہوتی رہی اور جو لوگ بلگرامی کے مکان پر جمع تھے وہ سب ایک دوسرے سے عالمانہ مباحث کرتے رہے۔ کبھی کبھار اقبال تھکے ہوئے اور بے حس سے معلوم ہوتے یہ کیفیت اس وقت ہوا کرتی تھی جب کہ وہ موقع کے منتظر رہتے تھے کہ پارٹی کے کسی شخص کے منہ سے کوئی بات نکلے اور وہ برق رفتاری سے اس کا جواب دیں۔ میں نے اقبال کی یہ خصوصیت پہلی مرتبہ یہاں محسوس کی اور اندازہ لگا لیا کہ جب کبھی وہ بے تعلقی اور اُچاٹ سے معلوم ہوتے ہیں تو فقط اس وقت جبکہ وہ ترکی بترکی جواب دینے کے لئے موقع کے متلاشی رہتے ہیں اور اس وقت ان کا جواب اتنا جلد اور غیر متوقع ہوتا ہے کہ فریق ثانی اس غیر متوقع اچانک پن سے کم سے کم تھوڑی دیر کے لئے تو بالضرور سٹ پٹا جاتا ہے۔

انہیں دیکھ کر مجھے ولیم گلیڈ اسٹون کی اور ان کے طریقوں کی یاد تازہ ہو گئی جو وہ پارلیمنٹ کے ایوان میں برتا کرتے تھے۔ میں اسی شام کو لندن واپس آ گئی۔

پہلی جون ۱۹۰۷ء کو میں پروفیسر آرنلڈ کی دعوت پر پکنک کے لئے کیمبرج گئی۔ اس پکنک کا انتظام دریا کے کنارے ایک درخت کے نیچے کیا گیا تھا اور اس موقع پر بہت سے نامی فضلا جمع تھے۔ گفتگو ادھر ادھر کے عام معلومات پر ہوتی رہی اور اسے فلسفیانہ رنگ دینے کی غرض سے پروفیسر آرنلڈ نے موت وحیات کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ ہر شخص نے زیرِ بحث مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور جب بحث نے غیر واضح رنگ اختیار کر لیا اسوقت پروفیسر آرنلڈ نے اقبال سے مخاطب ہو کر کہا کہ "زیرِ بحث مسئلہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" اقبال نے، جواب تک بالکل خاموش بیٹھے تھے طنزیہ ہنسی سے جواب دیا:

"زندگی موت کی شروعات ہے اور موت زندگی کی"۔

اس کے بعد بحث ختم ہو گئی۔

۹ جون ۱۹۰۷ء کو میں پروفیسر آرنلڈ کے یہاں کھانے پر مدعو تھی اور اقبال بھی وہاں موجود تھے۔ پروفیسر آرنلڈ نے جرمنی میں ایک نایاب عربی مخطوطہ کی دریافت کا ذکر کیا جس کے بارے میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی کہ وہ کیا ہے، اور کہا: "اقبال، میں تمہیں وہاں بھیجنے کا خیال کر رہا ہوں اسلئے کہ تم ہی اس ذمہ دارانہ کام کے لئے موزوں ترین شخص ہو"۔ اقبال نے معذرت کے لہجہ میں کہا: "میں اپنے استاد کے سامنے بالکل مبتدی کی حیثیت رکھتا ہوں"۔ پروفیسر آرنلڈ نے جواب دیا: "مجھے پورا یقین ہے کہ شاگرد اپنے استاد سے آگے بڑھ جائے گا"۔ اقبال نے قدرے خشک مزاجی سے کہا: "اگر آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں تو میں اپنے استاد کی بات کو مانے لیتا ہوں اور ان کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں"۔ پروفیسر آرنلڈ سمجھ گئے کہ اقبال کا حقیقی مفہوم کیا ہے اور تصدیق کی کہ اس بارے میں اقبال کو ان پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ یہ تمام باتیں ایسی شستگی کے ساتھ اور ایسے مہذب پیرایہ میں کی جارہی تھیں کہ یہ دیکھنا موجبِ مسرت تھا کہ اعلیٰ پایہ کے ذہین اور طباع اشخاص ایک دوسرے کے ساتھ کس پاکیزہ طریقہ سے بحث کرتے ہیں۔

دوسرے دن اقبال میرے یہاں آئے اور فلسفہ پر چند جرمن اور عربی کتابیں بھی ساتھ لائے۔ ان کے ہمراہ ایک جرمن پروفیسر بھی تھے۔ انہوں نے ان کتابوں سے چند اقتباسات پڑھ کر سنائے اور اس کے بعد بحث کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں ہم سب نے حصّہ لیا۔ بیچ میں تقابل کی غرض سے حافظ کی طرف اشارہ کرتے رہتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اقبال پر فارسی کے کسی دوسرے شاعر کے مقابلہ میں حافظ کا رنگ زیادہ چڑھا ہوا ہے اسلئے کہ وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے جسمیں وہ ان کے خیالات کو پیش کر کے دوسرے فلسفیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ نہ کرتے ہوں۔ پورے تین گھنٹے تک کتابیں پڑھی گئیں اور ان پر بحث ہوتی رہی اور انہوں نے کہا کہ: "اس طریقہ سے پڑھنے اور بحث و مباحثہ کرنے سے میرے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور میرے معتقدات پختہ ہو جاتے ہیں۔"

۲۳ رجون ۱۹۰۷ء کو میرے یہاں ایک تقریب کا انتظام کیا گیا تھا جس میں ممتاز اور نامور ہندوستانی اور انگریز شریک تھے۔ ڈاکٹر انصاری نے چند گانے سنا کر ہم کو محظوظ کیا۔ (لارڈ) سنہا کی صاحبزادیوں کمولا اور رمولا نے موسیقی سے مسرور کیا اور اقبال نے چند مزاحیہ اشعار سنائے جو فی البدیہہ کہے گئے تھے اور جن میں ہر موجود اور اہم مہمان کے بارے میں ان کی خصوصیت کے متعلق مبالغہ آمیز طریقہ سے تبصرہ کیا گیا تھا جنہیں سن کر ہم سب نے خوب ہی قہقہے اڑائے۔

ایک جرمن خاتون نے جس کا نام مس شولی تھا، ۲۷ رجون کو مجھے ہندوستانی وضع کے ڈنر پر مدعو کیا۔ میں بہت خوش ہوئی اسلئے کہ لندن میں ہندوستانی وضع کے کھانے کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا اور میں نے فوراً دعوت کو منظور کر لیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اقبال اسی کے یہاں رہتے ہیں اور انہی کے کہنے پر مس شولی نے میرے نام دعوت نامہ بھیجا ہے کھانا جو بالکل ہندوستانی وضع کا تھا اور ہندوستانی خصائص پر مشتمل تھا، اقبال کی زیرِ ہدایت تیار کیا گیا تھا۔ اقبال نے مجھ سے کہا کہ وہ ہر قسم کے ہندوستانی کھانوں کا اہتمام کر سکتے ہیں لیکن

مجھے دعوت دینے میں ان کا حقیقی منشا یہ تھا کہ وہ مجھے وہ مقالہ پڑھ کر سنائیں جسے انہوں نے اپنی ڈگری کے لئے تیار کیا تھا۔ اقبال نے اسے تمام و کمال پڑھ کر سنایا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے اس کی تیاری میں کس قدر جانفشانی اور تحقیق سے کام لیا ہے۔ جب وہ پڑھ چکے تو انہوں نے میری رائے طلب کی اور جو کچھ میں نے کہا اسے انہوں نے مقالہ میں شامل کرنے کی غرض سے قلمبند کر لیا۔ ابھی مشکل سے ہم نے یہ کام ختم کیا ہوگا کہ چند دوست آگئے اور ان کی معیت میں ہم امپیریل انسٹی ٹیوٹ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کرنے کی غرض سے گئے جہاں شاہی خاندان کے ارکین بھی موجود تھے۔ سوائے اقبال کے باقی سب کے لئے انکی موجودگی دلچسپی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ اقبال ساری شام تھکے ہوئے اور پریشان سے معلوم ہوتے تھے، اور جب انہوں نے یہ جملہ کہا کہ "یہ سب مسرت بخش تضیع اوقات تھا" تو میں نے اسے سنکر کہا کہ "اس ریمارک سے ان کی فطری اُپج (اوریجینیلٹی) کا اظہار نہیں ہوتا۔"

۲۹ر جون ۱۹۰۷ء کو لیڈی ایلیٹس کے یہاں فیشن ایبل پارٹی دی گئی۔ جہاں اقبال کو دیکھ کر مجھے قدرے اچنبھا ہوا۔ جب میں ان سے مصروف گفتگو تھی عین اس وقت مس سروجنی داس جو نہایت قیمتی لباس میں ملبوس تھیں اور ضرورت سے زیادہ ہیرے جواہرات میں لدی ہوئی تھیں اور بھدے طریقے سے بنی ٹھنی تھیں، ایک دم اندر آگئیں۔ انسانیت کا یہ نمونہ انگلستان جاتے وقت میرا ہمسفر تھا۔ مس موصوف اپنے آپ کو تمام خوبیوں کا مجموعہ سمجھتی تھیں۔ مجھے اور ہر شخص کو جو ان کی راہ میں آیا، کلیتاً نظر انداز کرتے ہوئے اور پیکر جذبات بنے ہوئے سیدھی اقبال کے پاس پہنچیں اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہا: "میں صرف آپ سے ملنے کے لئے آئی ہوں۔" اقبال نے اس عزت افزائی کا جو جواب دیا وہ یہ تھا: "یہ صدمہ اس قدر فوری اور اچانک ہے کہ مجھے تعجب ہوگا اگر میں اس کمرے میں سے زندہ باہر نکل سکونگا۔"

۴ر جولائی ۱۹۰۷ء تک اقبال نے "تاریخ دنیا" کا کام مکمل کر لیا تھا جو انہوں نے

اپنے جرمن امتحان کے لئے لکھی تھی۔ انہوں نے سارا مسودّہ پڑھ کر سُنایا اور جب مَیں نے بعض واقعات کے بارے میں اپنے خیالات پیش کئے تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا : "ہر شخص اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ سے واقعاتِ عالم پر نظر ڈالتا ہے اور میں بھی اسی مخصوص روشنی میں دُنیا کی تاریخ کو دیکھتا ہوں۔" وہ علم کے مخزن تھے اور ان کی یادداشت حیرت انگیز طریقہ پر قوی تھی جس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے اپنی اس کتاب میں جمع کئے تھے۔ مس شول نے پھر ہمیں ہندوستانی وضع کا کھانا کھلایا، جسے اقبال کی زیرِ ہدایت تیار کیا گیا تھا۔ چونکہ وہ ماہر منتظمۂ خانہ تھیں اس لئے وہ ہر نئے کھانے کو جو انہیں بتایا جاتا تھا بہت جلد سیکھ لیتی تھیں۔

فلسفیانہ مضامین سے دلچسپی بڑھتی گئی اور اقبال نے میری دلچسپی کے پیشِ نظر ۱۳، ۱۴، ۱۵ر جولائی ۱۹۰۷ء کی تاریخیں مقرر کیں۔ تاکہ روزانہ دو گھنٹے تک فلسفہ کا مطالعہ کیا جاتے، چنانچہ میں، اقبال اور پروفیسر ہیرشیک سینٹ جنہوں نے جرمنی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی تھی، آپس میں شاعری اور فلسفہ پر نہایت گہری دلچسپی کے ساتھ بحث کرتے۔ اقبال تمامتر جرمن علوم و فنون کی تائید میں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ "اگر تم علم کے کسی شعبہ میں اپنی معلومات کو بڑھانا چاہتے ہو تو تمہارا منتہائے نظر جرمنی ہونا چاہیئے" انہوں نے پھر کہا کہ "دوسروں سے بحث کرتے وقت ایک نئی دُنیا تمہارے سامنے آجائیگی اور مَیں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اسی طریقہ سے حاصل کیا ہے۔" دُوسرے دن اقبال نے مجھے اپنی پولیٹیکل اکانومی کا اصل مسوّدہ تحفہ کے طور پر دیا اور ساتھ ہی وہ مقالہ بھی جس پر انہیں ڈگری ملی تھی۔ بعد کو وہ جرمن زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا۔ اس فاضلانہ مقالے کی بدولت ان کی ناموری، شہرت اور وقار میں بہت اضافہ ہو گیا۔

۲۳ر جولائی ۱۹۰۷ء کو ایک علمی مذاکرہ ہوا جس میں بہت سے ہندوستانی مقیم لندن شریک تھے۔ ایک نوجوان ہندوستانی نے جس کا نام پرمیشور لال تھا، بڑے ولولے کے ساتھ وہ

خطوط پڑھ کر سنائے جو اس کے گھر والوں نے اُسے بھیجے تھے اور پھر رسالہ "مخزن" سے چند گیت اور نظمیں پڑھ کر سنائیں اور حاضرین کو محظوظ کیا۔ یہ سب نظمیں حُبِ وطن اور آزادی سے متعلق تھیں اور اقبال کے زورِ قلم کا نتیجہ تھیں۔ اس نے کہا کہ "یہ ساری نظمیں شمالی ہند میں گھر گھر گائی جاتی ہیں۔ اقبال کی ان قومی نظموں سے گھر، بازار اور گلیاں گونج رہی ہیں اور ان کی وجہ سے ہندوستان میں قومیت کا وہ احساس پیدا ہو گیا ہے جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا" تمام مجمع میں اس قدر جوش پھیلا ہوا تھا کہ سب نے "مخزن" کی مطبوعہ نظموں کو ایک ساتھ گانا شروع کر دیا۔ اور سارا ہال اقبال کے اشعار سے گونج اُٹھا۔ جب ذرا جوش ٹھنڈا ہوا تو میں نے وہ خط نکالا جو اقبال نے مجھے جرمنی سے بھیجا تھا۔ یہ جرمن زبان میں تحریر کیا گیا تھا اور جب وہ پڑھا جا چکا تو سب نے یہ کہہ کر اس کی تعریف کی کہ وہ روانی اور ادبیت کا بہترین نمونہ ہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے یہ کہہ کر مجھ سے وہ خط مانگ لیا کہ "اگرچہ اقبال میرے شاگرد ہیں لیکن میں انکی تحریرات سے بہت کچھ سیکھتا ہوں"۔ انہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "تم بہت خوش قسمت ہو کہ انہوں نے تمہیں ایسا اہم خط بھیجا" اور مجھے یہ کہہ کر یقین دلایا کہ "میں اس قیمتی جرمن شاہکار کو اپنے عزیز ترین مجموعے میں بہ حفاظت تمام رکھوں گا"۔ یہ صورت حالات بہت نازک تھی اور میں اس عظیم المرتبت انسان کی درخواست کو رد نہ کر سکی اور اقبال کا خط ان کے حوالہ کر دیا۔ جو دو مسودے اقبال نے ۱۶ر جولائی کو مجھے تحفہ کے طور پر دیئے تھے وہ بھی پروفیسر آرنلڈ ہی کے پاس رہ گئے۔ چونکہ پروفیسر موصوف نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ان دونوں مسوّدات کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں اس لئے میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ ان کی درخواست کو منظور کر لوں۔

۱۶ر اگست ۱۹۰۷ء کو پروفیسر آرنلڈ نے مجھے اپنے مکان واقع ومبلڈن میں مدعو کیا۔ ان کے گھر کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بہترین گھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی نو سالہ بچی نے اپنی موجودگی سے زندہ دلی اور خوش طبعی کی فضا پیدا کر دی تھی۔ اور ساتھ ہی اپنے والد کے

فلسفیانہ وقار کو بھی پوری طرح قائم رکھا تھا۔ ایک فاضل جرمن خاتون مس اسٹریٹن بھی وہاں موجود تھیں۔ گفتگو زیادہ تر لندن میں میرے کام کے متعلق ہی ہوتی رہی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اپنا کام ختم کرتے ہی ہندوستان واپس چلی جاؤں۔ مگر پروفیسر آرنلڈ نے پُرزور طریقے سے رائے دی کہ مجھے کچھ دن اور جرمنی میں اور خصوصیت کے ساتھ ہائیڈلبرگ میں بسر کرنے چاہئیں تاکہ فلسفہ کے متعلق میرے خیالات میں وسعت پیدا ہو۔ مس اسٹریٹن نے ان تمام امکانات کی تشریح کی جو جرمنی میں مہیا ہو سکتے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے خیالات اور قوت ادراک میں پھیلاؤ پیدا ہو سکتا ہے۔ اور کچھ اس طرح سے میرے دل پر ان فوائد کا نقش بٹھایا کہ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس موقع کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے اپنے بھائی ڈاکٹر فیضی کی معیت میں جرمنی جانے کا فیصلہ کر لیا، اسلئے کہ وہ خود بھی وہاں جانے کے خواہشمند تھے اور اس ملک میں ایک مرتبہ پہلے بھی جا چکے تھے اور جرمن زبان سے واقف تھے۔ منجملہ بہت سی باتوں کے پروفیسر آرنلڈ نے اقبال کے کارناموں سے بحث کی اور مجھے ان کی بہت اصل تحریریں دکھلائیں جن میں وہ خط اور دو قلمی نسخے بھی تھے جو مجھ سے لے لئے گئے تھے۔

پروفیسر محمد عثمان

حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور

"میرا سینہ غم ناک اور یاس انگیز خیالات کا خزینہ ہے۔ یہ خیالات میری رُوح کے تاریک گوشوں سے سانپوں کی طرح نکلے چلے آتے ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے میں عنقریب ایک سپیرا بن جاؤں گا۔ گلیوں میں پھرونگا اور تماشبین لڑکوں کی ایک بھیڑ میرے پیچھے پیچھے ہو گی"۔

میرا خیال ہے بہت سے لوگوں کو یقین نہیں آئے گا کہ مندرجہ بالا جملے علاّمہ اقبال کے ہیں۔ لیکن یقین آنے یا نہ آنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ جملے اقبال ہی کے تو ہیں۔ (دیکھئے اقبال نامہ حصہ دوم: ۱۳۱) اور ان کی زندگی کے ایک خاص رُخ، ایک سنگین دور، ایک ہیجانی وقفے کی بہت عمدہ ترجمانی کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے مُلک کے اکثر لوگ اپنے بڑے انسانوں کے متعلق عجیب و غریب غلط فہمیاں رکھتے ہیں۔ ان غلط فہمیوں کا سلسلہ پیغمبروں کی برگزیدہ ذات سے شروع ہوتا ہے اور خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام سے ہوتا ہوا ماضی وحال کے تمام آئمۂ دین، صوفیائے عظام اور شاعروں، ادیبوں اور مفکروں تک جا پہنچتا ہے جن کی زندگی اور کارنامے کا تعلق کسی نہ کسی طرح اسلام اور اسلامی خدمت سے ہو۔ ان بزرگوں کی ذات کو ہر قسم کی خوبیوں کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے اور گناہ اور معصیت تو رہے ایک طرف، معمولی خطاؤں اور فطرتِ انسانی سے لازمًا سرزد ہونے والی لغزشوں کو بھی

ان کی طرف منسوب کرنا ان کی بزرگی کی توہین اور ان کی پارسائی کی اہانت خیال کیا جاتا ہے مثال کے طور پر لوگ یہ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ ان مقدس ہستیوں میں سے کسی کو کسی وقت کسی حسینہ نے بے حد متاثر کیا ہوگا یا اس کے دل میں چاہت کی آگ بھڑکا دی ہوگی حالانکہ حسن و شباب سے متاثر ہونا اور اس کے نتیجے کے طور پر دل میں محبت و آرزو کا جاگ اٹھنا ایک نہایت فطری امر ہے جس کی تصدیق (بالواسطہ ہی سہی) قرآن حکیم سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ جب ایک قبطی کو ہلاک کر کے مصر سے بھاگے اور جناب شعیبؑ کے گاؤں کے قریب ایک کنوئیں پر ان کی نظر دو جوان لڑکیوں (حضرت شعیبؑ کی صاحبزادیوں) پر پڑی تو انہوں نے اس موقع سے خاصا گہرا اثر قبول کیا اور یہ پُرمعنی دُعا بے اختیار ان کی زبان پر آگئی: "خدایا! جو نعمت بھی تو مجھ پر نازل کرے، میں اس کا محتاج ہوں"۔ (قرآن ۲۸، ۲۴) یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بعد میں ان میں سے بڑی لڑکی کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کی شادی ہوئی تھی۔

اسی طرح سورۃ الاحزاب میں رسول کریمؐ کی ازدواجی زندگی کے اصول و قواعد مذکور ہیں اور آنحضرت صلعم کے لئے کچھ خصوصی مراعات کا بیان ہے۔ وہاں سلسلۂ مضمون ختم کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: "اس کے بعد دوسری عورتیں تم پر حلال نہیں اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بدلے میں اور بیویاں کر لو"۔ (آیت کا بقیہ حصّہ بجنسہ درج ہے)

ولو اعجبک حسنھن، خواہ بعض عورتوں کا حسن تم کو کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے[1]

آیت بلاشک و شبہ اس امر کی دلیل ہے کہ پیغمبروں کی ذات بھی ذوقِ جمال سے عاری یا بالاتر نہیں اور ان کو بھی عورتوں کا حسن (عام انسانوں کی طرح) متعجب یا متاثر کر سکتا ہے۔

---

[1] عبداللہ یوسف علی اس حصّہ آیت کا انگریزی ترجمہ یوں کرتے ہیں:

Even though their beauty attract them

البتہ یہ تعجب و تاثر مختلف انسانوں کے لئے مختلف ہوتا ہے جو لوگ (بڑے یا چھوٹے) اصلاحی، انقلابی یا کاروباری مقاصد میں محو و منہمک ہوتے ہیں، ان کی زندگی میں یہ تاثر کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن جو لوگ نسبتاً شاعرانہ اور فنکارانہ طبیعتوں کے مالک ہوتے ہیں ان کے لئے یہ جذبہ بعض اوقات بڑی شدت، گہرائی اور ہمہ گیری اختیار کر لیتا ہے۔ اور ان کی پوری زندگی پر چھا جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے صبر و قرار اور اعتماد و یقین کی بظاہر مضبوط عمارت بنیادوں تک ہل جائے یا سوز و غم کی ایک مستقل کیفیت ان کے رگ و پے میں سرائت کر جائے۔ علامہ اقبال اپنے تمام علم و فضل اور وزن و وقار کے باوصف چونکہ فطرتاً شاعر تھے اور حسن پسندی کا بڑا شدید رجحان رکھتے تھے اس لئے ان کو بھی ایک زمانے میں اس قسم کے ایک ہیجانی دور سے گذرنا پڑا۔ یہ دور کب اور کیسے آیا؟ اس میں ان کے احساسات کی تلخی یا شدت کا کیا عالم تھا؟ اور اس نے ان کی شاعری اور زندگی پر کیا اثرات پیدا کئے؟ اس مضمون میں انہی سوالات سے بحث کی گئی ہے۔

(۲)

یوں تو یہ دور یورپ سے واپسی پر جب کہ اقبال کی عمر ۳۱ برس کی تھی شروع ہوتا ہے اور آئندہ پانچ سال تک جاری رہتا ہے۔ مگر اس کے اسباب کو سمجھنے اور اسی کے پس منظر کو جاننے کے لئے ہمیں نہ صرف ان کے قیام یورپ کی زندگی کا بلکہ اور پیچھے جاکر ان کی ازدواجی زندگی کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔ ایسا کئے بغیر ہم زیر مطالعہ دور میں انکے نفسی اضطراب اور ذہنی کشمکش کے ان محرکات اور مؤثرات کو سمجھ نہ سکیں گے۔ جن کی جڑیں ان کے ماضی میں پیوست تھیں۔ لہذا میں سب سے پہلے ان حالات و واقعات کو مختصراً پیش کرونگا۔ جن سے ان کی جذباتی اور ازدواجی زندگی کسی نہ کسی طرح متاثر معلوم ہوتی ہے۔

پہلی شادی

اقبال نے بمشکل میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا کہ تقریباً ۱۶ برس کی عمر (۱۸۹۳ء) میں ان کو زنجیر ازدواج میں جکڑ دیا گیا۔ ان کی اہلیہ اچھے خاندان کی مگر سادہ مزاج اور زیورِ تعلیم سے قریب قریب عاری خاتون تھی۔ شادی کے بعد اقبال نے ایف۔اے، بی۔اے اور ایم اے کے تعلیمی مرحلے ہی طے نہیں کئے بلکہ وہ سیالکوٹ سے لاہور اُٹھ آئے تھے اور ان دونوں شہروں کی معاشرت میں جو فرق تھا ان کے ذہن نے لامحالہ اس سے بھی اثرات قبول کئے ہو نگے پھر ۱۸۹۹ء میں وہ پہلے اورینٹل کالج اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ اب ان کے احباب کا حلقہ اور ان سے ملنے جلنے والوں کی ذہنی اور معاشرتی سطح اس سطح سے بے حد مختلف تھی جو انہیں میٹرک پاس کرنے پر اور شادی کے وقت سیالکوٹ میں میسر تھی۔ خود اُن کا ذہن اور ذوق اپنے ارتقا کی بے شمار منزلیں قطع کر چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنی ازدواجی زندگی کو نباہتے چلے گئے۔ اس زمانے میں انہوں نے اپنے متعلق جو سب سے اہم نظم "زہد و رندی" لکھی اس سے جہاں ان کی وسیع مشربی، راگ پسندی، حسن دوستی اور بے داغ جوانی کا پتہ چلتا ہے وہاں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ اپنے گرد و پیش سے یا اپنی گھریلو زندگی سے ناخوش یا غیر مطمئن ہیں اور نہ حسن و عشق کی کسی خصوصی واردات کا اس سے اظہار ہوتا ہے۔

یورپ کی فضا

مگر کچھ عرصے کے بعد (۱۹۰۵ء) جب وہ لاہور کی فضا چھوڑ کر لندن، کیمبرج اور

۱۔ "ذکرِ اقبال" از سالک : ۱۵

ہائیڈل برگ (جرمنی) کی فضاؤں میں پہنچے تو ان کا ذہن ایک نئی دُنیا، ایک نئی معاشرت اور اس اعتبار سے قلب و نظر کے بعض نئے تقاضوں سے آشنا ہوا۔ ان کا مزاج اس عہد کے عام ہندوستانی طلبہ سے بہت مختلف اور بہت بلند تھا۔ وہ انگلستان نہ عیش و عشرت کے خیال سے گئے تھے اور نہ مغرب پسندی اور فیشن پرستی کی خاطر۔ ان کا مجموعی طرزِ عمل بھی اپنے عہد کے بیشتر ہندوستانی طلبہ سے کہیں اعلیٰ اور ارفع رہا تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یُورپ کی آزاد معاشرت نے جس میں عورت محض جسمانی حسن کی نمائش ہی کرتی نظر نہیں آتی بلکہ اپنی ذہنی کاوشوں اور کمالات کے لحاظ سے بھی بڑی حسین اور پُرکشش ہے، ان کو بیحد متاثر کیا اور ان کی شاعری (گویا ان کا ذہن) ایک نئے اور انوکھے دَور میں داخل ہو گئی۔

قیامِ یورپ کی شاعری

اس کا ثبوت یہ ہے کہ قیام یورپ کے زمانے میں اقبال نے جس قدر نظمیں لکھیں دو تین کو چھوڑ کر باقی سب کا موضوع حسن و عشق ہے۔ ان میں سے بعض تو اس اہم انسانی موضوع پر ان کے فکر و نظر اور فلسفیانہ سوچ بچار کا اظہار کرتی ہیں مثلاً "محبت" "حقیقتِ حُسن" "پیام" "پیامِ عشق" وغیرہ مگر چند نظمیں، ایسی ہیں جن کے ذاتی اور واقعاتی ہونے میں کچھ کلام نہیں۔ ان میں سب سے اہم "وصال" اور "حُسن و عشق" ہیں۔ 'وصال' کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

جُستجو جس گُل کی تڑپاتی تھی اے بُلبُل مُجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گُل مجھے

اس سے اگلے دو شعر یہ ہیں:

خود تڑپتا تھا چمن والوں کو تڑپاتا تھا میں
تجھ کو جب رنگیں نوا پاتا تھا شرماتا تھا میں

میرے پہلو میں دلِ مضطر نہ تھا سیماب تھا
ارتکابِ جرمِ اُلفت کے لئے بے تاب تھا

یہ ماضی کا بیان تھا مگر اب حالات یکسر بدل چکے ہیں۔ نظم کے دُوسرے بند کے چند اشعار یہ ہیں :

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں
اہلِ گلشن پر گراں میری غزل خوانی نہیں
عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے
کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے مرے
ضو سے اُس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

"حسن و عشق" میں پہلے تو وہ اپنی وارفتگی کا حال بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ان کا دِل "سیلِ محبت" میں ڈوب گیا ہے، بہہ گیا ہے، کھو گیا ہے اور اس کے بعد ان اثرات کا ذکر کرتے ہیں جو وارداتِ عشق نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں میں پیدا کئے ہیں :-

ہے مرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار
میرے بیتاب تخیّل کو دیا تُو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حسُن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال
تجھ سے سرسبز ہوئے میری اُمیدوں کے نہال
قافلہ ہو گیا آسُودۂ منزل میرا

قیامِ انگلستان کی آخری غزل کا آخری شعر ہے:

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہے اسکی
کہیں سرِ راہگذار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

سر عبدالقادر مرحوم نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ "مخزن" مرتبہ حامد علی خاں بابت جنوری ۱۹۴۹ء) میں اس شعر کے متعلق سخن گسترانہ کہا کہ یہ روایتی نہیں بلکہ واقعاتی ہے:۔

بانگِ درا (حصّہ دوم) کی اس اشارت کو اگر ہم اس عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھیں جو عطیہ بیگم فیضی صاحبہ کے نام اقبال کے خطوط میں اور ان کے متعلق بیگم موصوفہ کی تحریر میں نظر آتی ہے تو اس دور کے اقبال کی زندگی کا یہ رُخ آئینے کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ اچھی عورت کو پانے سے قطعِ نظر، اچھی عورت سے ملنے، اس سے تبادلۂ خیالات کرنے اور اس کی معیّت کا لُطف اُٹھانے کی خواہش (کم سے کم فنکارانہ ذہن و ذوق رکھنے والوں کے لئے) ایک قدرتی سی خواہش ہے جو صدیوں سے مشرقی معاشرے کی عجیب و غریب ہیئت اور پسماندگی کے باعث ایک عیب سمجھی گئی اور ناچار ایک جرم بن گئی۔ اقبال جب تک لاہور کی 'پسماندہ' فضا میں تھے یہ جرم یوں سرزد ہوتا رہا:

کچھ عار اسے حُسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی

لیکن جب وہ یورپ پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ نہ صرف اچھی عورت سے ملنا وہاں کوئی عیب نہیں بلکہ وہاں وہ عورت موجود بھی ہے جس کی پیاس ہر طبّاع اور فطین انسان کا قلب محسوس کرتا ہے۔ تفصیل کے لئے تو بہرحال اس مختصر کتاب کو دیکھنا چاہیئے جو عطیہ فیضی صاحبہ کی علم دوستی کے طفیل انگریزی میں "اقبال" کے نام سے چند سال پہلے شائع ہوئی تھی، میں یہاں صرف ان عورتوں کا ذکر کروں گا جن سے وہ بطورِ خاص متاثر ہوئے تھے۔

جرمنی میں اقبال کی معلّمات

ہائیڈل برگ (جرمنی)، یونیورسٹی میں فلسفہ کی تدریس پر جو دو خاتون پروفیسریں، فراؤ واؤ ناسٹ

اور فراؤ سینے شال مامور تھیں ان کا ذکر کرتے ہوئے عطیہ فیضی لکھتی ہیں: "یہ دو نہایت حسین اور جوان پروفیسریں جن سے اقبال نے فلسفہ کا درس لیا، جرمن، یونانی اور فرانسیسی تینوں زبانیں جانتی تھیں اور علم و معلومات کا بے پناہ خزینہ تھیں" پھر اگست ۱۹۰۷ء کی ایک شام کے ذکر میں لکھتی ہیں: "دن بھر کی تدریس کے بعد ہم لوگ قریب کے ایک دریا کے کنارے ایک کافی ہاؤس میں جا بیٹھے اور طلبا کے ایک گروہ نے اُن اُستانیوں کے ساتھ جرمن، یونانی اور فرانسیسی فلسفہ پر گفتگو شروع کر دی۔ اقبال اس بحث و تمحیص کو بڑے انہماک اور انکسار کے ساتھ سُنتے رہے اور ان پر محویت کا ایسا عالم طاری ہوا کہ بحث ختم ہو جانے پر بھی وہ آس پاس کی خاموشی سے کچھ سیکھتے معلوم ہوتے تھے۔ جب وہاں سے چلنے کا وقت آیا تو ان کی یہ کیفیت تھی جیسے کوئی خواب سے چونک پڑے۔ اقبال کو فراؤ سینے شال کی تدریس میں خصوصی کشش محسوس ہوتی تھی اور وہ اس سے بے حد متاثر تھے۔ جب کبھی وہ ان کے کسی غلط جواب کو نرمی کے ساتھ درست کر دیتیں تو اقبال طفلِ مکتب کی طرح دانتوں میں اُنگلی کاٹنے لگتے جیسے کہہ رہے ہوں، "افسوس میں نے یہ جواب کیوں نہ دیا جو مجھے دینا چاہیئے تھا"۔[۱]

جرمنی میں ہائیڈل برگ کے علاوہ اقبال کو میونک یونیورسٹی کی دلربا اور علم پرور فضا سے فیض اٹھانے کا موقع بھی ملا تھا۔ وہاں اقبال کے تحقیقی کام کی نگرانی شعبۂ فلسفہ کے صدر پروفیسر ران کی نوجوان بیٹی کے سپرد تھی۔ اس نو عمر فاضلہ کا ذکر کرتے ہوئے عطیہ فیضی لکھتی ہیں: "میونک کے اکثر قابلِ دید مقامات دیکھنے کے بعد ہم پروفیسر ران کے مکان پر پہنچے۔ علیک سلیک اور مزاج پرسی کی مختصر کارروائی کے بعد پروفیسر موصوف کی نوجوان و حسین صاحبزادی فراؤلین نے اقبال کا امتحان لینا شروع کر دیا کہ بھلا میونک سے جا کر ہائیڈل برگ میں ان کے علم نے کس قدر ترقی کی ہے (اقبال میونک میں چند قیام کے بعد ہائیڈل برگ گئے تھے) مجھے یہ جان کر حیرت

۱۔ "اقبال" از عطیہ فیضی مطبوعہ بمبئی ۱۹۴۷ء صفحات ۲۳، ۲۴

ہوئی کہ اس کا علم کس قدر وسیع تھا اور میں نے دیکھا کہ اس نے کئی با اقبال کی لغزشِ فکر کی طرف اشارہ کیا اور اُن کو اعتراف کرتے ہی بنی۔ ابھی میں نے اپنی اس حیرت پر قابو نہ پایا تھا کہ یہ پیاری لڑکی اُٹھی اور پیانو پر جا بیٹھی اور کلاسیکی موسیقی کا ایک راگ کمالِ فنی مہارت کے ساتھ بجایا اور اقبال سے پوچھا کہ یہ راگ بھلا کس کا ترتیب دیا ہوا تھا۔ اقبال اس کے سامنے بالکل کھوئے ہوئے تھے اور وہ ہم کو ایک کے بعد دُوسری مسرّت زا حیرت میں ڈالے جا رہی تھی۔ یہ پروفیسر زادی خود ایک کامل نمونۂ تخلیق ہونے کے ساتھ علم کی ہر صنف میں کامل معلوم ہوتی تھی۔ اس کے کمالات کی حیرت زائیاں پورے تین گھنٹے تک جاری رہیں اور مجھے معلوم ہوا اقبال نے اپنا مشہور مقالہ جس پر ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی اس کی نگرانی و رہنمائی میں تیار کیا تھا۔" [۱]

عطیہ فیضی

متعدد یورپی خواتین (طوالت کے خوف سے یہاں صرف تین کا ذکر کیا گیا ہے) کے علاوہ اقبال یورپ کی فضا میں بعض مشرقی خواتین سے بھی متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنے بعض خطوط میں پروفیسر آرنلڈ اور لیڈی آرنلڈ کی خوشگوار گھریلو زندگی کو مثالی قرار دیا ہے۔ کیمبرج میں سیّد علی بلگرامی اور بیگم بلگرامی کی ازدواجی زندگی بھی نہایت خوشگوار اور قابلِ رشک تھی۔ اس بنا پر اقبال لیڈی آرنلڈ کے علاوہ بیگم بلگرامی سے بھی متاثر ہوتے ہونگے۔ خطوط میں کچھ اور ہندوستانی خواتین کا ذکر بھی آتا ہے جن کی دعوتوں میں اقبال شریک ہوتے اور جن کو وہ اپنی دعوتوں میں مدعو کرتے تھے لیکن ان سب میں نمایاں شخصیت خود عطیہ بیگم فیضی کی ہے۔ اقبال ان سے ملنے اور ان کو کیمبرج آنے کی دعوت دینے کے لئے بطورِ خاص کیمبرج سے چل کر لندن پہنچے اور مس بیک (جو ہندوستانی طلبا کی نظر میں بڑی محترم تھیں اور اکثر طلبہ ان کی رہنمائی اور ہمدردی سے فائدہ اُٹھاتے تھے) کے مکان پر ان دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی جو بڑی دلچسپ ہے۔

اور جس سے دونوں کی خود اعتمادی، حاضر دماغی اور شگفتہ طبعی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ پہلی ملاقات کے بعد قدرتی طور پر مراسم بڑھتے ہیں۔ اقبال عطیہ کے لئے اور عطیہ اقبال کے لئے خصوصی دعوتِ طعام اور دعوتِ چائے کا اہتمام کرتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد دونوں شیخ عبدالقادر کی معیت میں کیمبرج جاتے ہیں جہاں عطیہ ایک 'یادگار' دن گذار کر شام کو واپس لندن چلی آتی ہیں۔ مراسم اور بڑھتے ہیں۔ نطشے اور افلاطون کے متعلق دونوں کے نقطۂ نظر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لئے اس موضوع پر خط و کتابت شروع ہو جاتی ہے۔ اقبال نے چند خطوط میں اس اختلاف علمی میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ مس عطیہ نے اپنے دلائل پیش کئے اور یہ تحریری مناظرہ ختم ہو گیا۔ افسوس اس تحریری مناظرہ کی کوئی یادگار باقی نہیں۔"[۱]

اس مشترک علمی ذوق اور ذہنی موافقت نے دونوں کو اور قریب کر دیا۔ اس کے بعد جو ملاقاتیں ہوئیں ان میں اقبال نے اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ عطیہ فیضی کو سنایا اور ان کے بعض مشوروں کو قبول کیا۔ لاہور سے اپنی تصنیف "علم الاقتصاد" منگوا کر بطور ہدیہ پیش کی۔ کچھ عرصے کے بعد جب ان کو کیمبرج سے میونک جانا پڑا اور عطیہ لندن میں رہ گئیں تو دونوں کی پُرخلوص خط و کتابت جاری رہی۔ یہیں سے 'دُور اُفتادہ' اقبال نے وہ نظم ان کو بھیجی تھی جس کا مطالعہ ہم "وصال" کے زیرِ عنوان اوپر کر آئے ہیں۔ اس نظم کے بارے میں دو باتیں یہاں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ نظم کے آخر میں اقبال نے اپنے نام سے پہلے 'دور افتادہ' لکھنا پسند کیا۔ دُوسرے اس نظم کی کوئی نقل وہ اپنے پاس نہ رکھ سکے۔ چنانچہ دو اڑھائی برس بعد لاہور سے (۱۷ جولائی ۱۹۰۹ء) ایک خط میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں:

"کیا آپ مجھے اس نظم کی جو میں نے میونک سے آپکو بھیجی تھی نقل ارسال فرما سکتی ہیں؟ میرے پاس کوئی نقل نہیں اور میں اسے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں"۔ اور جب کچھ عرصے کے بعد نقل موصول

۱۔ اقبال نامہ حصہ دوم: ۱۰۵ مندرجہ بالا معلومات 'اقبال' اور اقبال نامہ حصۂ دوم سے لی گئی ہیں۔

ہوئی تو شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا "نظم کی نقل کے لئے جو آپ نے ارسال فرمائی ممنون ہوں اس کی اشد ضرورت تھی۔ میں نے ہر چند حافظہ پر زور دیا یہ اشعار یاد نہ آتے"۔[1]

دلچسپ محفلیں

اقبال اور عطیہ کے باہمی خلوص اور تعلقِ خاطر پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔ یہاں اس قدر بتانا کافی تھا کہ قیامِ یورپ کے زمانے میں وہ جن مردوں اور عورتوں سے متاثر ہوئے ان میں ایک ہندوستانی مسلمان خاتون بھی تھی جن کے ذوقِ علمی اور مذاقِ سلیم کی وہ بڑی قدر کرتے تھے۔

لیکن آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ان دلچسپ محفلوں اور پُر لطف صحبتوں کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو اقبال کے قیامِ یورپ کی زندگی کا ایک اہم جزو تھیں اور جن سے ہمیں اپنے موضوع کو سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ لاہور سے جب وہ یورپ کی 'مخلوط معاشرت' میں پہنچے تو انہوں نے بہت جلد اپنے آپ کو اس سے مانوس کر لیا اور وہ اس مشرقیت کو چھوڑ کر جس میں محرم و نامحرم کا سوال بڑی اہمیت رکھتا تھا' اس مغربیت کے قریب آ گئے جہاں عورت اور مرد آزادانہ ہی نہیں مساویانہ حیثیت سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ، اور ایک دوسرے کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ انہوں نے کس حد تک اپنے آپ کو اس فضا سے ہم آہنگ کر لیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ وہ اپنی خاتون دوستوں کے لئے بھی بڑے شوق سے دعوتوں کا اہتمام کرتے تھے اور ان کی دعوتوں میں بلا تکلف شریک ہوتے تھے اور ان تمام آدابِ معاشرت اور رسومِ مجلس کا پاس رکھتے جن کا پاس رکھنا وہاں کی مہذب سوسائٹی ضروری خیال کرتی تھی حتیٰ کہ وہ بعض اوقات خواتین کے ساتھ مِل کر کھانا تیار کرتے اور کھانے

۱۔ ـــــــ "اقبال" ص ۱۴۵ ۲۔ ایضاً ، ۱۴۵

کی میز اور کمرے کی آرائش میں بے تکلف ان کا ہاتھ بٹاتے نظر آتے ہیں۔ عطیہ فیضی صاحبہ نے ایسی بیسیوں صحبتوں اور محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ میں یہاں ان میں سے چند کا حال انہی کی زبانی (ترجمے کی صورت میں) پیش کرتا ہوں تاکہ آپ ان کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔

محترمہ عطیہ فیضی لکھتی ہیں: "ایک روز مجھے ایک جرمن خاتون مس شول نے ہندوستانی کھانے کی دعوت بھیجی۔ لندن میں ہندوستانی کھانا کوئی معمولی نعمت نہیں۔ لہٰذا میں نے دعوت قبول کرنے میں تامل نہ کیا اور جب مس شول کے مکان پر پہنچی تو دیکھا کہ اقبال وہاں موجود ہیں اور نہ صرف اس دعوت کا اہتمام ان کے ایما پر ہوا تھا بلکہ کھانے جو خوشبو اور لذت میں واقعی ہندوستانی تھے سب کے سب انہی کی نگرانی اور ہدایت میں تیار ہوئے تھے میں نے جب داد دی تو انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ سبھی ہندوستانی کھانے تیار کروا سکتے ہیں" [1]

"جون ۱۹۰۷ء کو میرے مکان پر ایک دعوت کا اہتمام تھا۔ معزز مہمانوں میں ہندوستانی اور انگریز دونوں شامل تھے۔ ڈاکٹر انصاری نے ہمیں گانا سنایا۔ لارڈ سنہا کی صاحبزادیوں (کرمولا اور رموولا) نے بھی اپنے کمالِ موسیقی سے حاضرین کو محظوظ کیا اور اقبال نے شرکائے مجلس کے متعلق فی البدیہہ ایسے شوخ اور دلچسپ اشعار سنائے کہ سب سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ گئے" [2]

"کچھ دنوں کے بعد اقبال نے لندن کے ایک فیشن ایبل ہوٹل فراسکیٹس میں مجھے شام کے کھانے کی دعوت دی تاکہ میں ان جرمن پروفیسر ولسے مل سکوں جن کے ساتھ وہ تحقیق کا کام کر رہے تھے۔ اس کھانے پر ہر چیز کا انتظام بڑے سلیقے اور قرینے سے کیا گیا تھا اور جب میں نے حسنِ ترتیب کی داد دی تو اقبال نے کہا "میری ذات میں دو شخصیتیں جمع ہیں ظاہری شخصیت عملی اور کاروباری ہے اور باطنی شخصیت ایک فلسفی، صوفی اور خواب دیکھنے والے کی ہے" [3]

۱۔ اقبال، صفحہ ۱۸ ۔۔۔ ۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً صفحہ ۱۵

اس تواضع کے جواب میں میں نے ۱۵ اپریل کو اقبال کی خاطر ایک مختصر چائے کا انتظام کیا جس میں میری بعض فاضل سہیلیاں اور دوست بھی مدعو تھے۔ ان میں مس سلوسٹر اور مس لیوحی جو اپنے ادبی ذوق اور فلسفہ دانی کی وجہ سے لندن بھر میں مشہور تھیں اور چند ممتاز موسیقار بھی شامل تھیں۔ یہ صحبت بڑی دلچسپ رہی اور جب اقبال نے ایک مزاحیہ نظم تیار کر کے سنائی تو خواتین نے بھی اس نظم کا جواب اسی انداز میں دیا۔ میں نے اقبال کی نظم نقل کرنا چاہی تو انھوں نے کہا "یہ اشعار محض اس موقع کے لئے تھے" اور اس صحبت کے ساتھ ہی ان کی وقتی دلچسپی بھی ختم ہو گئی۔ اس محفل کی فضا شروع سے آخر تک شگفتگی اور زندہ دلی سے معمور تھی اور اس صحبت میں گزرے ہوئے تین گھنٹوں کی یاد ہم سب کے دلوں میں تا دیر باقی رہی"[۱]

لندن کی متذکرہ بالا محفلیں بلاشبہ دلچسپ تھیں لیکن ان پر یک رنگی اور یکسانی کا رنگ غالب تھا۔ وہی گھر یا ہوٹل کی دیکھی بھالی فضا اور وہی کھانے یا چائے کی دعوت مگر جب اقبال جرمن یونیورسٹی ہائیڈل برگ پہنچتے ہیں تو ان کی محفلوں میں ایک روح پرور تنوع اور تازگی نظر آتی ہے۔ کبھی کنارِ دریا کی سیر ہو رہی ہے تو کبھی کشتی رانی کا مقابلہ ہے۔ آج تاریخی مقامات کی دید کا اہتمام ہے تو کل فطرت کے دلربا مناظر میں پکنک کا سامان ہو رہا ہے۔ اور اس سیر و تفریح میں فلسفہ و حکمت کے موتی بھی رولے جا رہے ہیں اور شعر و نغمہ کا حسن بھی بکھر رہا ہے۔ ایک ایسی ہی سیر excursion کا ذکر کرتے ہوئے عطیہ فیضی لکھتی ہیں: "ہم اپنے راستے پہ چلتے جا رہے تھے کہ اچانک فراؤ واگنرناسٹ نے ایک تان اڑائی اور وہ ہندوستانی گیت گانا شروع کر دیا جو ایک شام پہلے میں نے اسے سکھایا تھا:

گجرا بجانے والی ناداں! یہ تیر نخرا!

ہم سب گیت میں شامل ہو گئے جس نے جلد ایک کلاسیکی کورس کی صورت اختیار کر لی ہم یہ کورس بھی گائے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ جنگلی پھول توڑ توڑ کر ان کے ہار بھی پرو رہے

۱۔ اقبال صفحہ ۱۵

تھے۔ پھر چلتے چلتے رُک گئے اور بڑی شوخیوں اور شرارتوں کے ساتھ ہم نے وہ ہار اقبال کے گلے میں ڈال کر کہا " تم کسی انجان دیس کے راجہ ہو اور ہم تمہیں تاج پہناتے ہیں " ۔ [۱]

اس طرح کا ایک اور دلچسپ واقعہ سُنیئے : " ایک روز فراؤ واڑ ناسٹ ، سینے شال اور کیڈ ناٹ ثقافت جسمانی کی ورزشیں کر رہی تھیں اور میں ورزش کے قاعدے کے مطابق فراؤ واڑ ناسٹ کا بازو اپنے گرد لئے ہوئے تھی کہ اچانک اقبال اُدھر آ نکلے اور بڑے غور سے ہمیں دیکھنے لگے اور مجسمے کی صورت کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ جب واڑ ناسٹ نے دریافت کیا کہ وہ اس قدر انہماک کے ساتھ کیا دیکھ رہے ہیں تو انہوں نے جھٹ جواب دیا : " مجھ میں اچانک ایک فلکی کی رُوح حلول کر آئی ہے اور میں ستاروں کے جھرمٹ کا نظارہ کر رہا ہوں " ۔ [۲]

ہائیڈل برگ اپنے دس روزہ اس نہایت دلچسپ قیام کے بعد جب عطیہ فیضی وہاں سے رخصت ہونے لگیں تو یہ سب لوگ سپر ہوف کے پھلدار باغ میں جمع ہوتے " ہر ایک نے ایک ایک کھانا تیار کیا۔ اقبال نے ایک ہندوستانی ڈش تیار کی تھی۔ پھر ہر ایک کھانے کی اسکی خوبی یا خامی کی بنا پر تحسین و تنقید کی گئی۔ جب میرے چلنے کا وقت آیا سب نے ایک دائرہ سا بنا کر مجھے اس کے گھیرے میں لے لیا۔ میں حیران تھی کہ اس کا مطلب کیا ہے لیکن مجھے جلد معلوم ہو گیا کہ میرے لئے الوداعی گیت لکھا گیا ہے۔ اقبال نے گیت کی رہنمائی کی اور سب اس کورس میں شریک ہوتے۔ [۳]

مختصراً یہ تھا، وہ پس منظر جس میں اقبال نے پی۔ ایچ۔ ڈی اور بیرسٹری کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کئے۔

۳۔ وطن واپس آکر

یورپ کے اس دلچسپ اور رنگین ماحول میں تین سال گذارنے کے بعد جب اقبال وطن واپس

۱۔ ایضاً صفحہ ۲۵ ۲۔ ایضاً صفحہ ۲۹

۳۔ اقبال ص ۲۹

آتے (جولائی ۱۹۰۸ء) تو وہ دوسرے کئی ہندوستانیوں کی طرح وہاں سے کوئی نئی شادی کر کے کسی کو ساتھ تو نہیں لیتے آتے تھے لیکن وہ ایسا ذہن ضرور لاتے تھے جو انہیں نئی شادی یا نئی ازدواجی زندگی پر مجبور کرے۔ یورپ سے واپس آنے والا اقبال یورپ جانیوالے اقبال سے کئی اعتبار سے مختلف تھا۔ ان کی آرزو مندی، ارادوں کی پختگی اور حوصلوں کی بلندی تو وہی تھی لیکن ان آرزوؤں اور ارادوں کے پیچھے کام کرنے والا ذہن اس دوران میں اپنے ارتقاء کی کئی اور منزلیں طے کر چکا تھا۔ وہ وطنیت کے سیاسی تصوّر کی ہولناکیوں سے آگاہ ہو کر اسلام کے روحانی اور عمرانی نظام کے قریب آچکے تھے اور اب واپس آکر انہیں اپنی شاعری کے لئے ایک نئی منزل (ملتِ اسلامیہ کی بیداری اور اسلامی قدروں کے احیاء کی منزل) کا تعین کرنا تھا۔ پھر وہ ذاتی زندگی کے متعلق اپنے معاش اور معاشرتی مستقبل کے متعلق بھی مختلف طریق سے سوچ رہے تھے۔ سرکاری ملازمت کی نسبتاً آسان اور ہموار راہ چھوڑ کر انہیں وکالت کا آزادانہ مگر پُر خار اور دشوار گذار راستہ اختیار کرنا تھا۔ وطن واپس پہنچ کر چند عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کے بعد انہوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ ان دونوں میدانوں میں اپنی تگ و دو شروع کر دی لیکن انہیں جلد معلوم ہو گیا کہ انکی سعی و تلاش اور شوق و جستجو کا ایک گوشہ اور بھی ہے جسے وہ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اور یہ انکی صنفی محبت اور گھریلو زندگی کا گوشہ تھا۔ یورپ میں وہ عورت کے جن ذہنی اور تہذیبی اوصاف سے آشنا ہوئے تھے ان کو بھول جانا یا ازدواجی اور جذباتی زندگی میں ان کی قدر و قیمت سے انکار کرنا اب ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ انہیں یقیناً رہ رہ کر فراؤ سینے شال کی فلسفہ طرازی واژناسٹ کی نکتہ آفرینی، عطیہ فیضی کی حاضر دماغی اور گذری ہوئی صحبتوں اور بیتے ہوئے دنوں کی یاد آتی ہو گی[1]۔ اور اس کے مقابلے میں جب وہ اپنے گھر کی مالکہ، اپنی رفیقہ حیات

۱۔ ۷ را پریل ۱۹۰۹ء کے خط میں عطیہ کو لکھتے ہیں: "چند روز ہوئے واژناسٹ کا خط آیا تھا جب اسے جواب لکھوں گا تو وہ دن یاد کراؤں گا۔ جب آپ جرمنی میں تھیں (افسوس ہے کہ وہ دن اب ہمیشہ کے لئے گذر گئے)" اقبال نامہ، حصّہ دوم: ۱۳۱

کو دیکھتے ہوں گے جو افلاطون کے فلسفے اور حافظ کی شاعری پر گفتگو کرنا تو درکنار غالباً ان کے نام سے بھی آشنا نہ تھیں[1] تو ان کا دل خون ہو جاتا ہو گا۔ ان کی زندگی پر مایوسی اور اضطراب کے سیاہ بادل چھا جاتے ہوں گے اور مستقبل پر اُن کے پختہ اعتقاد کی بُنیادیں ہل جاتی ہوں گی۔

مَیں نے جس کیفیت کو ابھی ماضی شکیہ میں بیان کیا ہے عطیہ فیضی کے نام اقبال کے خطوط دیکھنے کے بعد اس کی واقعیت میں شُبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس مضمون کے آغاز میں جو چند سطور درج ہیں وہ اسی دور کے ایک خط کا حصّہ ہیں لیکن اس اضطراب اور بے چینی میں ایک سے زیادہ آرزوئیں گڈمڈ نظر آتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جو عاطفہ sentiment اس دَور میں اقبال کی جذباتی زندگی پر غالب ہے اس کے کئی پہلو ہیں، لہٰذا صحت کے ساتھ اس کا تجزیہ آسان نہیں۔ میں بہر صورت اپنی کوشش کرتا ہوں۔

کش مکش کا آغاز

اس اضطراب کا آغاز اس شدید تفاوت کے احساس سے ہوتا ہے جو لندن اور ہائیڈل برگ کی مجلسی زندگی اور لاہور میں اقبال کے گھر کی فضا میں پایا جاتا تھا۔ چُنانچہ وہ اقبال جو عمر بھر اپنے اس شعر پر عمل پیرا رہا :

تری بندہ پروری سے مرے دن گذر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایتِ زمانہ

پہلی بار نہ صرف زمانے کی شکایت کرتا ہے بلکہ پورے معاشرے اور فطرت کیخلاف

۱۔ علامہ اقبال کی پہلی بیگم کی ایک قرابت دار محترمہ بلقیس عابد علی ان کے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں: "اماں مرحوم بہت سیدھی اور نیک دل عورت تھیں ــــــ وہ اپنا نام لکھنے کے سوا پڑھنا لکھنا بالکل نہ جانتی تھیں۔" دیکھیے مضمون "لیڈی اقبال"، مطبوعہ ہفت روزہ صادق لاہور بابت ۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء

اس کے دل میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے صرف یہی نہیں، وہ اپنے والد ماجد کی شان میں، گستاخی تک کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے ـــــ اُس والد کی شان میں گستاخی جس کے لئے اس کے دِل میں بے پناہ محبت و عقیدت تھی اور جس کی نظر میں وہ ایک مثالی فرمانبردار فرزند رہا تھا چنانچہ ۱۹ر اپریل ۱۹۰۹ء (یعنی یورپ سے واپسی کے کوئی آٹھ ماہ بعد) کے خط میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں :

بلاشُبہ چند روز قبل میں نے علی گڑھ کے شعبۂ فلسفہ کی پروفیسری اور گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ تاریخ کی صدارت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، میں دراصل ملازمت میں پھنسنا ہی نہیں چاہتا۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس ملک کو چھوڑ جاؤں۔ اس کی وجہ آپ کو معلوم ہے۔ مجھے صرف اس بات نے روک رکھا ہے کہ میں اپنے بھائی کے احسانات سے بے حد زیر بار ہوں۔ میری زندگی نہایت تلخ ہے۔ یہ لوگ میری بیوی کو زبردستی میرے سر چپکنا چاہتے ہیں۔ میں نے والد ماجد کو لکھ دیا ہے کہ انہیں میری شادی کر دینے کا کوئی حق حاصل نہ تھا خصوصاً جبکہ میں نے اس سے انکار کر دیا تھا۔ میں بیوی کی کفالت پہ ہر وقت آمادہ ہوں لیکن اسے اپنے پاس رکھ کر اپنی زندگی کو عذاب بنانے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں ایک انسان ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی مسرت کا حق حاصل ہے۔ اگر معاشرہ یا فطرت میرے حق سے انکار کریں گے تو میں دونوں کے خلاف بغاوت کروں گا میرے لئے ایک ہی جادۂ کار ہے کہ میں اِس بد بخت مُلک کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ جاؤں یا پھر شراب نوشی میں پناہ ڈھونڈوں کہ خودکشی کا مرحلہ آسان ہو جائے کتابوں کے یہ بے جان اور خشک بوسیدہ اوراق میرے لئے وجۂ مسرت نہیں بن سکتے۔ میری رُوح کی گہرائیوں میں اسقدر آگ بھری ہے کہ میں ان کتابوں کو اور ان کتابوں کے ساتھ سماجی رسم و روایات کو بھی جلا کر خاکستر بنا

سکتا ہوں"۔[1]

یہی نہیں بلکہ اس اضطراب کے ہاتھوں 'خدائے خیر' پر ان کا ایمان بھی محفوظ نظر نہیں آتا۔ اس خط میں ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں :

"آپ کہتی ہیں دُنیا کو ایک خدائے خیر نے پیدا کیا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن زندگی کے حقائق تو کسی اور ہی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ عقلِ انسانی کی رُو سے دیکھا جائے تو یزداں کی نسبت ایک ابدی قادرِ مطلق اہرمن پر ایمان لانا زیادہ آسان نظر آتا ہے۔"[1]

عطیہ فیضی نے جب ان کو ہمدردی کا خط لکھا اور اس یاس پسندی پر غالب آنے کا مشورہ دیا تو اس کے جواب میں ۷ار اپریل کو لکھتے ہیں :

"میرا سینہ غمناک اور یاس انگیز خیالات کا خزینہ ہے۔ یہ خیالات میری رُوح کے تاریک گوشوں سے سانپوں کی طرح نکلے چلے آتے ہیں۔ میرا خیال ہے میں عنقریب ایک سپیرا بن جاؤں گا۔ گلیوں میں پھروں گا اور تماشہ بین لڑکوں کی ایک بھیڑ میرے پیچھے پیچھے ہوگی"۔[2]

مزید دو شادیاں

جیسا کہ ہم اُوپر دیکھ آئے ہیں اس یاس و اضطراب کا ایک سبب انکی ناخوشگوار ازدواجی زندگی تھی لہٰذا بعض عزیزوں کی مخالفت کے باوجود انہوں نے ایک نئی رفیقۂ حیات کی تلاش پر (اس عہد کے رواج کے مطابق یہ فریضہ یا تو والدین و رشتہ دار انجام دیتے تھے یا دوست احباب) دوستوں کو مامور کیا اور ان کی کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک چھوڑ نہیں دو شادیاں اور کرنی پڑیں

۱۔ ایضاً ص ۱۱۹   ۲۔ ایضاً : ۱۳۱

اس دلچسپ واقعہ کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔[1] یہاں اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ اس خاتون کو گھر لے آنے کے بعد جو نکاح کے اعتبار سے دوسری اور رخصتی کے لحاظ سے تیسری بیگم تھیں، ان کا یہ اضطراب گھٹ گیا۔ یہ واقعہ ۱۹۱۳ء کا ہے۔ عبدالمجید سالک مرزا جلال الدین کے حوالے سے لکھتے ہیں :

"چنانچہ ایک مولوی صاحب کو طلب کر کے علامہ کا نکاح اس خاتون سے دوبارہ پڑھایا گیا اور علامہ اس کو ساتھ لے کر سیالکوٹ چلے گئے۔ آٹھ دس دن کے بعد واپس آئے تو بڑی گرمجوشی کے ساتھ مرزا صاحب سے ملے اور فرمایا: اب میں بالکل مطمئن ہوں اور اپنے آپ کو جنت الفردوس میں خیال کرتا ہوں۔ مرزا صاحب کا بیان ہے کہ اس خاتون سے (جو جاوید اور منیرہ کی والدہ ہیں) شادی ہو جانے کے بعد اقبال نے کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ساری رنگ رلیاں ختم ہو گئیں یہ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد اقبال کی زندگی کا اصول کا ملاً بدل گیا۔"[2]

یورپ سے واپس آنے کے کم و بیش پانچ سال بعد (۱۹۱۳ء) اقبال کی زندگی کا اسلوب یقیناً بدل چکا تھا لیکن اس تبدیلی کو جس طریق سے سالک صاحب نے مرزا جلال الدین کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ یہ حقائق کی حد سے زیادہ سادہ تعبیر ہے۔ ازدواجی زندگی کی ناخوشگواری بلاشبہ انسان کو مضطرب خاطر کرنے کے لئے کافی وجہ ہے لیکن جو بے قراری، تزلزلِ ذہنی اور کرب اقبال کے متذکرہ بالا خطوط سے ظاہر ہوتا ہے اس کے لئے محض ازدواجی تلخی کو ذمہ دار ٹھہرانا صحیح نہ ہوگا۔ خصوصاً جب کہ کھاتے پیتے مسلمان مردوں کے لئے دوسری تیسری یا چوتھی شادی کر لینا (جیسا کہ خود علامہ اقبال نے یہ مرحلہ بآسانی طے کر لیا) کچھ مشکل نہیں تھا۔ اگر ان خطوط کو غور سے دیکھا جائے تو ان کے پیچھے بعض پیچیدہ اور دلدوز آرزوؤں کی کسی حد تک انجانی آویزش

۱۔ تفصیل کیلئے دیکھئے "ذکر اقبال" از سالک صفحات ۶۷ تا ۷۱

۲۔ ذکر اقبال : ۷۰

اور شکست دونوں کارفرما نظر آتی ہیں اور ان دو کیفیتوں نے ازدواجی زندگی کی تلخی سے مل کر وہ شدید ہیجان اور آتشیں کرب پیدا کیا جو عطیہ فیضی کے نام خطوط کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آرزوؤں کی انجانی آویزش اور شکست کیا تھی ؟

ذہنی کشمکش اور اس کی عقلی وضاحت

بات یوں ہے کہ جب ایک مخصوص معاشرے میں تربیت پانے والا اور ایک وقت میں اس معاشرے کے رسم و رواج سے مطمئن ہو جانے والا انسان فکر و نظر میں ترقی کرتا ہے اور اپنے آبائی معاشرے سے مختلف معاشروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور ان سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے دل میں بعض ایسی آرزوؤں کا پیدا ہونا ایک فطری اور ناگزیر امر ہے جن کی تکمیل اس کے اپنے معاشرے کے پس منظر میں بسا اوقات ممکن نہیں ہوتی۔ اس سے لامحالہ ذہن ایک کش مکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آرزوئیں خود اس شخص کے بعض تصورات اور نظریات سے کہیں واضح اور کہیں مبہم طور سے ٹکراتی ہوں۔ اس سے کش مکش کی شدت اور بڑھ جائے گی۔ میرا خیال ہے اقبال نے یورپ میں جس عورت کو دیکھا بھالا، اس کے ایک رُخ کو تو انھوں نے بے حد سراہا۔ یہ رُخ اُسکی ذہانت و فطانت، گفتگو اور لب و لہجے کی دلکشی، اس کے علمی و ادبی ذوق کی نفاست اور عام حسن پسندی سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس عورت یا اس کی معاشرت کے بعض پہلو اُن کے اخلاقی اور معاشرتی تصورات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے تھے۔ وطن واپس آنے پر ان کا اپنی پہلی بیوی سے بیزار ہونا ناگزیر تھا ہی، لیکن شاید وہ اپنی نئی رفیقۂ حیات کا کوئی واضح تصور بھی قائم نہیں کر سکتے تھے۔ جس قسم کی عورتوں سے وہ یورپ میں ملے تھے (ان میں بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانی خواتین بھی تھیں)، قرین قیاس یہ ہے کہ وہ ان کے عمدہ اوصاف کو اپنی نئی رفیقۂ حیات میں دیکھنے کے آرزومند ہونگے لیکن ان کے والدین اور عزیزوں کے عام اور سادہ سے رہن سہن میں کسی ایسی عورت کا کھپ جانا انہیں یقیناً ناممکن نظر آتا ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ خود اُن کی مالی

حالت اور معاشرتی حیثیت ابھی نا تسلّی بخش اور غیر مستحکم تھی۔ انہیں اپنی عظمت اور بڑائی کا احساس ضرور تھا، ان کے جاننے والے بھی اس سے بے خبر نہ تھے۔ لیکن اس سدا کے دولت پسند اور اقتدار پرست دُنیوی ماحول میں انہیں اپنے مقام کو پانے اور اپنی برتری کا سکّہ بٹھانے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ ان کی دُنیادارانہ' جدّوجہد کا ابھی آغاز ہی تو تھا۔ اس بنا پر بھی وہ کسی ایسی عورت کو اپنانے سے ہچکچاتے ہونگے۔ اس کے علاوہ ان کے اخلاقی تصورات کا سوال تھا جو اعلیٰ تعلیمیافتہ عورت کے ذہنی ترقی و کمال کی تو قدر کر سکتے تھے لیکن ایسی عورت بالعموم جس قسم کی سماجی آزادیوں کو اپنا حق سمجھتی ہے انکا ساتھ دینے کی گنجائش ان تصورات میں ہرگز نہ تھی۔

اب ایک طرف تو وہ گھر کی پہلے سے موجود فضا سے سخت بیزار تھے، دوسری طرف وہ اس فضا کو اس انداز سے بدلنے کے آرزومند تھے جس سے انہیں حقیقی معنوں میں مسرّت حاصل ہو سکتی (اقبال جیسے انسان کی مسرّت ظاہر ہے کہ محض عورت سے نہیں بلکہ ایک ذہین، خوش ذوق سلیقہ مند اور زندگی کے حقائق و معاملات کا اچھا شعور رکھنے والی عورت ہی کی بدولت ممکن تھی) اور تیسری طرف وہ مشکلات و موانع تھے جس کا مجملاً ذکر میں نے اوپر کیا ہے اور جو ایسی عورت کو اپنا لینے کی راہ میں حائل رہے۔ اس سے جو کش مکش پیدا ہوئی اسکی شدّت اور گہرائی کا کچھ اندازہ تو ہم اوپر کر چکے ہیں۔ جو بات اس ضمن میں مجھے یہاں کہنی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے بعض گوشے ایسے بھی تھے جن کی حقیقت خود صاحب کش مکش کی نظر سے اوجھل تھی اور ان کا واضح تجزیہ اور عقلی توجیہہ خود اقبال جیسے فلسفی اور نفسیات دان کے لئے بھی مُشکل تھی۔ چنانچہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۹ء کے خط میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں:

"بلاشُبہ ہر شخص کے لئے زندگی موت کے انتظار کا نام ہے۔ مَیں بھی اگلے جہان کی سیر کا منتظر و آرزومند ہوں۔ وہاں پہنچ کر چاہتا ہوں کہ اپنے خالق کی زیارت کروں اور اس سے خواہش کروں   کہ میری ذہنی کیفیت کی عقلی وضاحت کیجائے اور یہ کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ آپ مجھے نہ سمجھ سکنے کی شکایت کرتی ہیں حالانکہ میں

خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھ پایا۔ برسوں گذرے میں نے کہا تھا:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے"۱

اس سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ اس دور میں اقبال ایک ایسی ذہنی کیفیت اور نفسی کش مکش میں مبتلا تھے جس کے بعض گوشے ان کے نفسِ لاشعور میں مخفی ہونے کے باعث خود انکی نظر سے پوشیدہ تھے۔ اور وہ ان کو اچھی طرح سمجھنے سے قاصر تھے۔ یہ کش مکش کی انتہا ہے!

ناکامیِ الفت

میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ میں ان کو محبت کی جس واردات کا تجربہ ہوا اس کی خاطر خواہ تکمیل نہ ہو سکی۔ اور جو "گل" "خوبیٔ قسمت سے انہیں آ خرِ مل گیا تھا" وہ ان کا نہ ہو سکا۔ اس ناکامی کی تلخی یا شکستِ آرزو کا احساس ان کے تحت الشعور میں سب سے قوی موجب تھا ان کے کرب و اضطراب کا۔ از بسکہ ایک بڑے انسان کی طرح انہوں نے اس ناکامی کو اپنے علمی و قومی مشاغل کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دیا اور کچھ عرصے کے بعد وہ اس پر غالب بھی آگئے لیکن جس دور کے اقبال کا مطالعہ ہمارے پیشِ نظر ہے وہ اس جذبے سے مغلوب تھے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس جذبۂ غم پر قابو پانے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ اس بات کا ثبوت ان کے کلام اور خطوط دونوں سے مل سکتا ہے۔

اخفائے راز کی کوشش

لیکن اس قسم کا کوئی ثبوت پیش کرنے سے پہلے دو امور کی صراحت یہاں ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ اس دور کی بہت سی نظمیں اقبال نے خود اپنے ہاتھوں تلف کر ڈالیں اور اس خیال سے تلف کیں کہ ان کی نوعیت حد درجہ "پرائیویٹ" تھی۔ اگر یہ احتیاط دامنگیر نہ ہوتی تو

۱۔ اقبال نامہ حصّہ دوم، ص ۱۲۳

(ان نظموں کی مدد سے) زیرِ مطالعہ دور کے اقبال کے احساسات کی شدت اور گہرائی کا ہمیں کہیں بہتر اندازہ ہو سکتا۔ لیکن ان کی اس احتیاط کا حال معلوم ہو جانا بھی خود ایک بہت بڑی شہادت اس امر کی ہے کہ 'کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے'، چنانچہ ۷ر جولائی ۱۹۱۱ء کو ایک خط میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں:

"گذشتہ پانچ سال سے میری نظمیں زیادہ تر پرائیویٹ نوعیت کی حامل ہیں اور میں سمجھتا ہوں پبلک کو انہیں پڑھنے کا حق نہیں۔ بعض تو میں نے خود تلف کر ڈالی ہیں تاکہ کوئی انہیں چُرا کر شائع نہ کرا دے۔"[۱] بعض نظموں کا اس درجہ 'نجی' ہونے کا احساس اور ان کا اتلاف آخر کس بات کا غماز ہے؟

چند نظمیں ایسی ہیں جو انہوں نے یورپ سے واپسی کے کئی سال بعد لکھیں لیکن بانگِ درا شائع کرتے وقت انہیں کتاب کے حصۂ دوم میں درج کروایا حالانکہ اس حصۂ کتاب کو بڑے واضح الفاظ میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء (قیامِ یورپ کا زمانہ) تک کا کلام بتایا گیا ہے[۲]۔ مثلاً ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۱ء کے خط میں 'نوائے غم'، کو "میری تازہ غیر مطبوعہ نظم" بتاتے ہیں[۳]۔ اسی طرح ۱۷ر جولائی ۱۹۰۹ء کے خط میں 'عاشقِ ہرجائی' کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ ابھی نامکمل ہے اور کچھ عرصہ بعد "آپ اُسے مخزن کے اوراق میں لاحظہ فرمائیں گی"[۴]۔ لیکن یہ دونوں نظمیں بانگِ درا

۱۔ اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۱۴۸ ۲۔ دیکھیے بانگِ درا: صفحہ ۱۱۳

۳۔ "اقبال": ۷۵، اقبال نامہ حصہ دوم: ۱۵۰

۴۔ اس نظم کے لکھے جانے کا ذکر کرتے ہوئے محولہ بالا خط میں لکھتے ہیں:

"بہت لوگوں نے میرے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے (یعنی اقبال مجموعۂ اضداد ہے، ایک معمہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ مضمون نگار) اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے تنہائی میں بارہا اپنے آپ پر ہنسی آئی ہے۔ میں اب ان خیالات و بیانات کا ایک قطعی جواب دینے والا ہوں۔ آپ اسے مخزن کے اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گی۔ میں نے نہایت عمدگی سے اپنے متعلق دوسروں کے خیالات کا اظہار کر دیا ہے لیکن جواب ابھی نظم کرنا باقی ہے"۔ "اقبال": ۴۸۔ اقبال نامہ حصہ دوم: ۱۲۳

کے حِصّہ دوم کی زینت ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی احتیاط کا ایک پہلو تھا جو کچھ زیادہ دیر تک کام نہ دے سکا۔

نوائے غم

بانگِ درا کے صفحات ۱۲۶، ۱۲۷ پر نظم 'وصال' درج ہے اور صفحہ ۱۳۲ پر نظم 'نوائے غم' کتاب میں بظاہر ان دو نظموں کے درمیان صرف چار پانچ صفحوں کا فصل نظر آتا ہے لیکن جیساکہ ہم اُوپر دیکھ آئے ہیں ان دو نظموں کے درمیان چار پانچ سال کی مدّت حائل ہے۔ 'وصال' ۱۹۰۷ء میں لکھی گئی اور 'نوائے غم' دسمبر ۱۹۱۱ء میں۔ یہ دو نظمیں اقبال کی داستانِ محبت کے دو رُخوں — پُرنشاط آغاز دردناک انجام — کی مکمل نمائندگی کرتی ہیں۔ 'وصال' کا مطالعہ ہم اُوپر کر آئے ہیں یہاں نظم کا مطلع دوبارہ درج کر دینا کافی ہو گا:

جستجو جس گُل کی تڑپاتی تھی اے بُلبُل مجھے
خوبیِ قسمت سے آخر مِل گیا وہ گُل مجھے

مگر پانچ برس بعد وہ 'نوائے غم' میں کہتے ہیں:

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش
جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش
بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار
جس کے ہر تار میں ہیں سینکڑوں نغموں کے مزار
محشرستانِ نوا کا ہے امیں جس کا سکوت
اور منّت کشِ ہنگامہ نہیں جس کا سکوت
آہ! اُمیدِ محبت کی بر آئی نہ کبھی!!
چوٹ مِضراب کی اس ساز نے کھائی نہ کبھی

اقبال عام غزل کو شاعروں کی طرح بے ربط اور رسماً روایتی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ ابتدائی دور کی چند غزلوں کو چھوڑ کر ان کا سارے کا سارا کلام ان کے اپنے واردات و محسوسات کا بیان ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اگر اس بات پہ غور کیا جائے کہ وہ ایک وقت تو بڑے جوش و خروش کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ انہیں وہ 'گل' مل گیا ہے جس کی انہیں تلاش تھی اور عشق کی گرمی سے ان کے چھالے اب شعلے بن گئے ہیں لیکن دوسرے وقت وہ بڑے دردناک لہجے میں کہتے ہیں :

آہ! اُمید محبت کی بر آئی نہ کبھی

چوٹ مضراب کی اس ساز نے کھائی نہ کبھی

اس کے معنے اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ محبت کی جس واردات کا آغاز بیحد جذبات انگیز اور زندگی بخش تھا۔ آگے چل کر اس نے کوئی اور صورت اختیار کر لی اور اس کا انجام اپنے آغاز سے اسقدر مختلف نکلا کہ شاعر کو سرے سے 'حادثۂ عشق' ہی سے انکار ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور رہے کہ اس کے سازِ دل نے مضرابِ محبّت کی چوٹ کبھی کھائی ہی نہیں۔ بیان کا یہ تضاد صرف ناکامیٔ محبت ہی کی دلیل ہو سکتا ہے۔[۱]

جیساکہ میں نے اُوپر بیان کیا ہے 'نوائے غم'، دسمبر ۱۹۱۱ء میں لکھی گئی۔ اس زمانے کی ایک اور نظم 'پھول کا تحفہ عطا ہونے پر' ہے۔ اس میں بھی شاعر اپنے دل کی وہی کیفیت بیان کرتا ہے جو 'نوائے غم' کا موضوع ہے۔ کسی حسینہ نے شاعر کو ایک خوبصورت پھول پیش کیا۔ اس واقعہ سے اس کے ذہن و تخیّل کو ایک عجیب تحریک ہوتی ہے۔ پہلے تو وہ پھول کو اس کی خوش بختی پر گویا مبارکباد دیتا ہے :

وہ مستِ ناز جو گلشن میں جانکلتی ہے

۱۔ یہاں یہ بتادینا بے محل نہ ہوگا کہ 'وصال' کی طرح 'نوائے غم' بھی طبع ہونے سے بہت پہلے عطیہ فیضی صاحبہ کو بھیج دی گئی تھی۔ دیکھیئے "اقبال"، صفحہ ۳۱ اور ۷۶

کلی کلی کی زباں سے دُعا نکلتی ہے
"الٰہی پھولوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے
کلی سے رشکِ گلِ آفتاب مجھ کو کرے"
تجھے وہ شاخ سے توڑیں زہے نصیب ترے
تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب ترے
اٹھا کے صدمۂ فرقت وصال تک پہنچا
تری حیات کا جوہر کمال تک پہنچا

شاعر کی نظر میں جوہرِ حیات کی تکمیل اس بات میں مضمر ہے کہ اسے حسن یا دُوسرے لفظوں میں حسنِ محبوب کا قرب حاصل ہو جائے لیکن یہ نعمت جو اس پھول کو میسّر آ گئی۔ شاعر اس سے کوسوں دُور ہے۔ چنانچہ نظم کے بقیہ اشعار میں وہ اپنی اس محرومی کا اظہار بڑے دلدوز انداز میں کرتا ہے:

مرا کنول کہ تصدّق ہیں جس پہ اہلِ نظر
مرے شباب کے گلشن کو ناز ہے جس پر
کبھی یہ پھول ہم آغوشِ مدّعا نہ ہوا
کسی کے دامنِ رنگیں سے آشنا نہ ہوا
شگفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اسے
فسردہ رکھتا ہے گلچیں کا انتظار اسے [1]

۱۔ اس نظم کا ذکر کرتے ہوئے ۷ جولائی ۱۹۱۱ء کے خط میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں: "میں نے اپنے دوست سردار امراؤ سنگھ کو (جنہیں اُمید ہے آپ بھی جانتی ہونگی) لکھا ہے کہ مجھے ان اشعار کا انگریزی ترجمہ بھیجیں جو میں نے شہزادی دلیپ سنگھ کی ایک سہیلی مس گوسٹن کے لئے اس وقت لکھے تھے جب انہوں نے شالامار باغ سے ایک خوبصورت پھول توڑ کر مجھے پیش کیا تھا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اصل میرے پاس محفوظ نہیں لیکن آپ کے لئے تلاش ضرور کروں گا۔" اقبال نامہ حصّہ دوم: ۱۴۹

ذرا غور کرنے پر یہ امر واضح ہو جائے گا کہ ناکامیٔ اُلفت کے جس احساس نے 'نوائے غم' میں ان سے چوٹ مضراب کی اس سازنے کھائی نہ کبھی، لکھوایا تھا وہی احساس اب 'کسی کے دامنِ رنگیں' سے آشنا ہونے کی آرزو بن گیا ہے اور اسی آرزو کی شکست انہیں گلچیں کے انتظار میں افسردہ رکھتی ہے۔

اس دَور کی کئی اور نظمیں بھی ان کے اس جذبۂ غم کی مظہر ہیں[1]۔ لیکن طوالت کے خوف سے انہیں یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جو بات مجھے یہاں کہنا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف 'وصال'، اور 'حسن و عشق' اور دوسری طرف 'نوائے غم' اور 'پھول کا تحفہ عطا ہونے پر' سامنے رکھی جائیں تو بھی اس حقیقت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس دَور میں اقبال کا کرب و اضطراب دراصل ایک ناکامِ محبت اور تشنۂ محبت دل کا کرب و اضطراب ہے۔ ان کے خطوط بھی دبی زبان میں اس بات کی تائید کرتے ہیں۔

۵۔ محبّت اور جنس

لیکن قبل اس کے کہ ہم خطوط کا مطالعہ کریں۔ میں محبّت کی نفسیات کے بارے میں دو ایک امور کی وضاحت کرنا یہاں مناسب خیال کرتا ہوں۔ دوسرے ممالک کی طرح ہمارے ملک کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت بھی غالباً یہ خیال کرتی ہے کہ جذبۂ محبت دراصل جنسی جذبے ہی کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے۔ یہ نظریہ جسے مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ نے آج سے چالیس پینتالیس برس اُدھر پیش کیا تھا۔ بظاہر بہت صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن یہ جس قدر مقبول ہے حقیقت میں اسی قدر غلط ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ فرائڈ کا یہ خیال درست مان لیا جائے تو دُنیا بھر کے عظیم شاعروں اور ادیبوں نے محبّت کے جو گیت گائے ہیں اور اس کے ساتھ انسان کی اخلاقی اور

۱۔ مثلاً 'فلسفۂ غم' 'ذرات اور شاعر'، مؤخرالذکر نظم کا آخری شعر ہے:

ضبطِ پیغامِ محبت سے جو گھبراتا ہوں میں
تیرے تابندہ ستاروں کو سُنا جاتا ہوں میں

رُوحانی بلندی کو جس طرح وابستہ بتایا ہے اور اسے ایک مقدس آسمانی جذبہ کہا ہے وہ سب کا سب باطل قرار پاتا ہے۔ خود فرائڈ کے ساتھیوں اور شاگردوں نے اپنی بعد کی تحقیق سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کا نظریہ بعض غلط فہمیوں کی بنا پر قائم ہُوا تھا۔ اور اس کے سامنے حقائق کی ایک اُلجھی ہُوئی تصویر تھی یا تصویر کا صرف ایک ہی رُخ تھا۔ فرائڈ نے جنسی جذبے کو جس طرح بڑھا چڑھا کر اور اس کے دائرہ عمل و اثر کو پھیلا کر پیش کیا۔ اس کی مؤثر تردید ایک تو اتنے ہی بلند پایہ مشہور ماہرِ نفسیات ولیم میکڈوگل کی تحریروں میں ملتی ہے[1]۔ لیکن یہاں میں جس عالم کا خصوصی ذکر کرنے والا ہوں وہ ایک ایسا شخص ہے جو کم و بیش تیس برس تک فرائڈ کے ساتھ بطور شاگرد اور ساتھی کے کام کرتا رہا اور اس کے جانشینوں میں بڑے مرتبے کا مالک ہے۔ میرا مطلب تھیوڈور ریک theodorreik سے ہے اس نے اپنی تصانیف، محبت ایک ماہرِ نفسیات کی نظر میں[2]، اور جنسی تعلقات کی نفسیات[3] میں فرائڈ کے جنسی نظریئے کی محکم دلائل سے تردید کی ہے اور محبت اور جنس کو ان کی اصل کے اعتبار سے دو بالکل جداگانہ جذبے (جبلتیں) ثابت کیا ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے:

"محبت اور جنس کے درمیان اختلافات کی نوعیت ایسی قطعی ہے کہ ان کے ماخذ اور اور ماہیت کو ایک قرار دینا، جیسا کہ ہمارے ماہرین تجزیہ نفس کرتے ہیں، بڑی عجیب بات ہے ان اختلافات کی حقیقت اس وقت روشن ہوتی ہے، جب ان دونوں کے جذبات کا ان کی خالص ترین صورت میں باہمی مقابلہ کیا جائے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں: جنس ایک حیاتیاتی تقاضا ہے جس کا تعلق جسم کی کیمیا سے ہے۔ محبت ایک جذباتی لگن ہے جو انفرادی تخیل سے

1. CF. especially Mc Dougall's Social Psychology p.30th Ed. London 1950,pp.331-363 and his abnormal Psychology 6th Ed. London 1948. pp. 557-566.
2. A Psychologist looks at love,farrar and Rinchart New York, 1944.
3. Psychology of sex relations, Rinchart and Co., New York,1945.

پیدا ہوتی ہے۔ جنس میں ایک جسمانی تناؤ سے نجات مقصود ہوتی ہے۔ محبت میں اپنی کمی کے احساس سے بچنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جنس کا تعلق بدن کے انتخاب سے ہے، محبت کا تعلق شخصیت کے انتخاب سے۔ جنس ایک عام بات ہے، محبت ایک خصوصی تجربہ، پہلی فطرت کی حاجت ہے، دوسری تہذیب و شائستگی کا اقتضا۔ جنس انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ہے۔ محبت اور رومان کا سلیقہ انسانوں کو ہزاروں سال میں حاصل ہوا ہے اور آج بھی لاکھوں انسان اس سے محروم ہیں۔ جنس ایک فرد اور دوسرے فرد میں تمیز نہیں کرتی۔ محبت ایک خاص شخص کو مرکزِ توجہ بناتی ہے۔ ایک اعصاب کو سکون بخشتی ہے، دوسری شخصیت کو بیدار کرتی ہے پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ جنسی لحاظ سے کوئی مطمئن شخص محبت کا پیاسا ہو۔ جنس کا جوش ایک عمل میں سرد پڑ جاتا ہے، اس کی حقیقت بس ایک تناؤ، ایک تشنج اور ایک افاقہ ہے۔ لطف اندوزی کا یہ عمل بعد میں یاد نہیں کیا جا سکتا جس طرح کسی خاص کھانے کا ذائقہ واضح طور پر ذہن میں تازہ کرنا ممکن نہیں۔ محبت کی صورت اس سے جداگانہ ہے۔ محبوب کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک ادا بڑے لطف و انبساط کے ساتھ یاد کی جاتی ہے۔ جنس ایک کھیل ہے، محبت ایک نغمہ ہے۔ جنس میں فریقِ ثانی کی چاہت ہیجان کے عارضی وقفے تک محدود ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ناپسندیدہ دکھائی دیتا ہے۔ محبت میں تعلقِ خاطر کو قرار حاصل ہے۔"[1]

اپنے اس نظریے کو ایک اور جگہ اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے تھیوڈور لکھتا ہے:

"جنس کا رشتہ جسم کے ساتھ ہے اور محبت کا رشتہ اس پُراسرار شے سے ہے جسے ہم روح کہتے ہیں، جنس کا مقصود جسمانی تسکین ہے، محبت کا مقصود شخصیت کی توسیع و تہذیب۔"[2]

اور یہ وہ خیال ہے جو صدیوں سے دنیا کے عظیم شعرا، روحانی پیشوا اور بالخصوص

۱۔ جنسی تعلقات کی نفسیات، صفحات ۱۷، ۱۸

۲۔ ایضاً صفحہ ۵

مشرق کے صوفیا پیش کرتے آئے ہیں۔ تھیوڈور کے تصوّرِ محبت میں ہمارے لئے خاص دلچسپی کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس نظریے کے لئے عہد جدید و قدیم کے کسی ماہر نفسیات یا فلسفی کا ممنون خیال نہیں کرتا البتہ شعرا کو اس بارے میں اپنا پیش رو مانتا ہے اور مولانا رومی کا ذکر خاص طور سے کرتا ہے جن کی بعض غزلوں کا جرمن ترجمہ اس نے بچپن میں پڑھا تھا اور جو اس کے حافظے کے کسی گوشے میں اس وقت تک محفوظ تھا جب اُس نے تصوّرِ محبت پر کتاب لکھی ۔۱

اس موضوع پر کسی تفصیلی گفتگو کا یہ موقع نہیں۔ ایک مشہور ماہرِ نفسیات کی مدد سے یہاں یہ دکھانا مقصود تھا کہ محبت کا جذبہ ناگزیر طور پہ جنسی جذبے کے ساتھ بندھا ہوا نہیں ہے بلکہ انسان کے نفسی نظام میں اس کا اپنا ایک مقام ہے جو جنس سے مختلف بھی ہے اور ارفع بھی۔ محبت بلاشبہ جنسی جذبہ میں گڈمڈ اور لبا اوقات مدغم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ جنس سے الگ ایک جذبہ ہے اور اسے الگ رکھا جا سکتا ہے اپنی غیر ملوث صورت میں محبت اعلیٰ ترین اور مقدس ترین انسانی جذبات میں سے ہے جس کی بدولت روح میں نکھار اور اخلاق میں بلندی پیدا ہوتی ہے اور انسان کی خفتہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔

محبّت اور شخصیّت

دوسری بات مجھے یہ کہنا ہے کہ یہ جو انگریزی میں ایک مقولہ ہے، جنگ اور محبت میں سبھی کچھ جائز ہے، اس کی بُنیاد بھی غلط بنی پہ ہے۔ جس طرح سچّے مذاہب (مثلاً اسلام)، اور بعض انسان دوست تحریکوں نے جنگ میں "سبھی کچھ" جائز نہیں رکھا۔ اسی طرح اچھے اور بڑے انسان

۱۔ مولانا رومی کا ذکر اور یہ اعتراف اس نے اپنی ایک اور کتاب The innerexperience of a psychoanalyst, Allen and un-win, London, 1949. میں خاصی تفصیل کے ساتھ اور بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۷۸ تا ۸۹

محبّت میں سب کچھ روا نہیں رکھتے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جنگ اور محبت ہی کے میدان میں انسان کے ظرف اور ذوق کا حال کھلتا ہے اور اسکی سیرت بے نقاب ہوتی ہے۔ محبّت انسانی شخصیت کے لئے میزانِ عدل اور عیارِ کامل ہے جس میں اس کا کھرا کھوٹا چھن کر سامنے آجاتا ہے۔ معمولی ذہن اور عامیانہ تربیت کا انسان ان آزمائشوں میں پڑ کر جلد بے قابو اور از خود رفتہ ہوجاتا ہے لیکن حقیقی معنوں میں بڑا انسان وہ ہے جو ہر حال میں اپنے ذہنی توازن کو قائم رکھے اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں اور ذاتی وقار کے رشتے کو ہاتھ سے جانے نہ دے ہمارے بعض مشاہیر کے ایسے خطوط بھی شائع ہوئے ہیں جن کو محبّت کے خطوط کہا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر نے اظہار کا ایسا کھلا ڈلا پیرایہ اختیار کیا جس سے معمولی پڑھا لکھا قاری بھی یہ اندازہ کرے گا کہ لکھنے والے کی شخصیت پگھل کر جذبات کے تیز دھارے پہ بہہ رہی ہے[۱] ان حضرات نے الفاظ سے نہ صرف جذبات کا اظہار کیا ہے بلکہ الفاظ کی مدد سے جذبات کی کیفیت کو بڑھایا اور چمکایا بھی ہے۔ اس کے برعکس اقبال ان لوگوں میں سے ہیں جو الفاظ سے جذبات کو چھپانے اور دبانے کا کام بھی لینا جانتے ہیں۔ خطوط کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس نکتے کا بیان ضروری تھا کیونکہ جہاں اور مشاہیر اپنے خطوط میں والہانہ محبّت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں وہاں اقبال کے قلم سے براہِ راست محبّت کا نہیں بلکہ ایسے احساسات کا اظہار ہوتا ہے جو بغیر محبّت ممکن نہیں ہوتے اور اس پر دلالت کرتے ہیں مختصراً ان کے خطوط محبّت کا بیان نہیں محبّت کے غماز اور اس کی دلیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس حصّۂ مضمون میں ہمیں ایک خاص نوع کا استدلالی اسلوب اختیار کرنا پڑے گا۔

۱۔ مثلاً حضرت داغ دہلوی کا ایک خط بنام منی بائی حجاب ملاحظہ ہو:

"دل دار و دل نواز! کیا غضب ہے، آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی وہ سب قول و قرار یکلخت فراموش کر دیئے۔ خط روانہ کیا تھا۔ وہاں کی دلچسپیوں میں اتنی محو ہو کر جواب دینا محال۔ اس خط کا جواب جلد نہ آیا تو خود بازار جا کر زہر لاؤں گا اور بے موت مر کر دکھا دونگا۔" تفصیل کے لئے دیکھئے "نگار" لکھنؤ بابت مارچ ۱۹۵۷ء۔

انتساب کی آرزو

مثال کے طور پر اس بات کو لیجئے کہ وہ اپنا مجموعۂ اشعار جلد سے جلد مرتب کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے پیچھے جو جذبۂ کارفرما ہے وہ ایک 'انتساب' کا شوق ہے۔ اس نفسیاتی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جن جذبات کے تحت شاہجہان نے تاج محل تعمیر کیا تھا، نوجوان شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے وہ جذبات 'انتسابات' کا پیرایہ ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ ۱۳ر جنوری ۱۹۰۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"غزلوں کا مجموعہ جلد شائع کرنے کا آرزو مند ہوں۔ یہ مجموعہ ہندوستان میں طبع ہوگا جرمنی میں جلد بندھے گی اور ایک "ہندوستانی خاتون" کے نام سے فخرِ انتساب حاصل کرے گا"[۱]

یہ مجموعہ کبھی شائع نہ ہوا۔ ممکن ہے مرتب بھی نہ ہو سکا ہو لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ ایک وقت یہ آرزو بڑی شدید اور سچی تھی۔ یہ آرزو وقت کے ساتھ ساتھ جن مرحلوں سے گذری اس کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ محولہ بالا خط کے سوا سال بعد اقبال یوں محسوس کر رہے تھے جیسے ؎ اب وہ رعنائیِ خیال کہاں، اس کے باوجود وہ پیشِ نظر مجموعے کی اشاعت اور اسکی عمدہ جلد بندی کے ارادہ سے دست بردار نہ ہوئے تھے۔ ۷ر اپریل ۱۹۱۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"نظموں کی اشاعت کے لئے مختلف حصصِ ملک سے تقاضے آ رہے ہیں۔ ایک صاحب نے جنہیں آپ سے ملاقات حاصل ہے' اپنی خدمات اس سلسلہ میں پیش کی ہیں۔ وہ خود مقدمہ لکھیں گے۔ ہندوستان کے بہترین مطبع میں اسے زیورِ طبع سے آراستہ کرائیں گے اور جرمنی میں اسکی جلد بندھوائیں گے۔ لیکن مجھ

۱۔ اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۱۱۷   ۲۔ ایضاً ، ۱۴۲

میں اب شاعری کے لئے کوئی ولولہ باقی نہیں رہا۔ ایسا محسوس کرتا ہوں کسی نے
میری شاعری کا گلا گھونٹ دیا ہے اور میں محروم تخیّل کر دیا گیا ہوں"۔[1]

لیکن ایک سال مزید گذر جانے پر ان کے دل کی کیفیت یکسر بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے
اڑھائی تین سال پہلے کے شوق و آرزو نے واضح طور پر درد و یاس کا رنگ اختیار کر لیا ہے
اور مجموعے کی اشاعت دور کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ۷ر جولائی ۱۹۱۱ء کے خط کا یہ حصّہ ملاحظہ ہو:

"نظموں کا مجموعہ بخوشی ارسال کرونگا۔ ایک دوست نے میری نظموں کی ایک
بیاض ارسال فرمائی ہے۔ کاتب انہیں خوشخط لکھ رہا ہے۔ جب کتابت ختم
ہو چکے گی تو نظرِ ثانی کرونگا۔ جو نظمیں اشاعت کے قابل سمجھی جائیں گی انہیں دوبارہ
لکھاؤں گا اور ایک نقل آپ کی خدمت میں بھی پیش کرونگا۔ ممنونیت کا تو سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا آپ کی مسرت ہی میرا صلہ ہے۔ بلکہ اس تحسین و ستائش کے لئے جس کا
میں مستحق نہیں ہوں، میں خود آپ کا احسانمند ہوں۔ لیکن یہ تو ارشاد ہو کہ یہ مجموعہ جو ایک
دلِ خونچکاں کے نوا ہائے غم کے سوا کچھ نہیں آپ کے کس مصرف کا، ان میں
زندہ دلی نام کو بھی نہیں"۔[2]

جنجیرہ آنے کی دعوت

پھر اس بات کو لیجئے کہ ان کو جنجیرہ آنے کی دعوت دی جاتی ہے لیکن بعض ناگزیر حالات
کی بنا پر وہ اس دعوت کو قبول نہیں کر سکے جس کا انہیں خود بھی بڑا قلق ہے۔ اس دعوت
اور اس کے عدم قبول میں جو جو پہلو پیدا ہوئے اور جس جس طرح ایک طرف سے شکوہ و
ملامت اور دوسری طرف سے معذرت خواہی کی صورتیں پیش آئی ہیں وہ باہمی خلوص اور
تعلق خاطر کا بیّن ثبوت ہیں۔ جنجیرہ آنے کی دعوت کا سلسلہ جو ایک سے زیادہ موقعوں پر

۱۔ ایضاً صفحہ ۱۴۲   ۲۔ ایضاً صفحات ۱۴۷، ۱۴۸

دہرائی گئی) ۱۹۰۹ء کے اوائل سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سال ۱۴ر جنوری کے خط میں لکھتے ہیں :

"جنجیرہ آنے کی دعوت کے لئے آپ کا، نواب صاحب[1] اور بیگم صاحبہ کا ممنونِ احسان ہوں، یہ دعوت میرے لئے مسرت و منفعت کی سرمایہ دار تھی لیکن آپ جانتی ہیں میں نے حال ہی میں اپنا کاروبار شروع کیا ہے اور اسی لئے میری یہاں موجودگی اشد ضروری ہے۔ افسوس ہے مجھے دوسروں کی خاطر آپ کے لطفِ محبت سے محروم ہونا پڑ رہا ہے[2]۔"

اس خط میں آگے چل کر اقبال یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ستمبر کی تعطیلات میں جب چیف کورٹ بند ہو ان کے لئے جنجیرہ آنا ممکن ہو گا۔ اس کے باوجود جب وہ اگلے سال کے شروع (مارچ ۱۹۱۰ء) میں حیدر آباد گئے اور اس موقع پر بمبئی سے ان کو جنجیرہ آنے کی دعوت دی گئی تو وہ جب بھی اپنی اس خواہش کی تکمیل نہ کر سکے۔ اب دعوت دہندہ کو 'شکایت' اور 'ملامت' کا جائز طور پر حق حاصل تھا۔ چنانچہ ۳۰ر مارچ ۱۹۱۰ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"ملامت نامہ کے لئے جس سے میں بے حد لذت اندوز ہوا سراپا سپاس ہوں ایک دوست کی ملامت سے زیادہ لطف کسی دوسری چیز میں نہیں ہز ہائی نیس کا دعوت نامہ حیدر آباد ہی میں موصول ہوا تھا۔ میں نے فوراً بعد آپ کو لکھا کہ جنجیرہ آنا میرے لئے کیوں ممکن نہیں۔ کل واپسی پر آپ کا لطف انگیز ملامت نامہ موصول ہوا۔ میں نے ہز ہائی نس کو تار دے دیا تھا کہ میں کالج کی مصروفیت کی وجہ سے جو بارہا میرے لئے ایک بار ثابت ہوئی ہے، شرفِ

۱۔ بمبئی کے پاس چھوٹی سی ریاست جنجیرہ کے والی اور محترمہ عطیہ بیگم فیضی کے بہنوئی ہز ہائی نیس نواب سید احمد خان۔

۲۔ ایضاً، ۱۱۶

حاضری سے محروم رہ گیا ہوں"۔[1]

اسی خط میں آگے چل کر لکھا :

"شومیٔ قسمت سے میں اپنے تعلقِ خاطر کے اظہار و اعلان کا عادی نہیں لیکن اسی عدمِ اظہار کی بدولت میرے تعلقِ خاطر میں ایک گہرائی اور گرمجوشی پائی جاتی ہے مگر دُنیا یہ سمجھتی ہے کہ میں ایک بے حس انسان ہوں"۔[2]

ایسا معلوم ہوتا ہے اس قدر معذرت خواہی کے باوجود ان کی طبیعت مطمئن نہیں ہوتی اور ان پر فراموشگاری اور وعدہ خلافی کا جو الزام عاید کیا گیا تھا اسکی چبھن ان کے دل میں باقی تھی لہٰذا خط کے آخر میں معذرت اور صفائی کے لئے ایک اور پیرایہ اختیار کرتے ہیں :

"میرے طور طریقے انوکھے ہو سکتے ہیں لیکن اس دُنیا میں ایسوں کی کیا کمی ہے جن کے اطوار مجھ سے بھی حیرت انگیز ہیں۔ موقع ہی انسان کی فطرت کا حقیقی معیار ہے۔ اگر کبھی وقت آیا تو آپ کو دکھا دُونگا کہ مجھے اپنے احباب سے کس قدر تعلقِ خاطر ہے اور ان کے لئے کس قدر دل سوزی مجھ میں پائی جاتی ہے زندگی کسے پیاری نہیں! لیکن اپنے آپ میں اس قدر قوت ضرور پاتا ہوں کہ جب ضرورت پڑے اسے دوسروں پر نثار کر دوں۔ فراموشگاری و ریاکاری کو اشارۃً کنایتہً بھی مجھ سے منسوب نہ کیجئے گا کہ اس سے میری رُوح کو اذیت ہوتی ہے۔ میری فطرت کے متعلق آپ کی ناواقفیت پر لرز جاتا ہوں۔ کاش میں اپنا باطن آپ پر عیاں کر سکتا تاکہ میری رُوح پر فراموشگاری کا جو حجاب آپ کو نظر آتا ہے دُور ہو جاتا"۔[3]

ان معذرت خواہیوں کا اثر خاطر خواہ نہ ہوا اور غلط فہمیاں بدستور قائم رہیں تو، اپریل ۱۹۱۰ء کے خط میں پہلے تو ایک ماہر وکیل کی طرح ان تمام واقعات و مشکلات کو خالص منطقی

۱۔ ایضاً : ۱۳۴ ۲۔ ایضاً : ۱۳۶ ۳ ایضاً صفحات ۱۳۷، ۱۳۸

انداز میں دہراتے ہیں جن کی بنا پر وہ جنجیرہ نہ جا سکے تھے اور پھر لکھتے ہیں :

"مجھے اندیشہ ہے کہ آپ میری نیت اور میرے عمل کے متعلق ایک افسوسناک غلط فہمی میں مبتلا ہیں اس کا تدارک بلا ملاقات ممکن نہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے تعلقات کے پیش نظر اب ہماری ملاقات لابد ہو چکی ہے لہٰذا میں اس کے لئے ضرور وقت نکالوں گا۔" [1]

پھر نواب صاحب اور بیگم صاحبہ تک اپنی معذرت پہنچانے کی درخواست کرتے ہوئے لکھا :

"ان دنوں کی یاد میں جو بیت چکے ہیں مگر جن کی یاد میرے قلب میں تازہ ہے، نواب صاحب اور بیگم صاحبہ تک میرا پیغام پہنچا دیجئے اور ان سے کہئے کہ میری فروگذاشت کو لاپروائی پر محمول نہ فرمائیں۔" [2]

وجوہ خواہ کچھ بھی تھے، ایک سے زیادہ بار دی جانے والی دعوت کا قبول نہ کیا جانا عزت نفس کا سوال سامنے لے آتا ہے اور بسا اوقات دلچسپ انتقامی کارروائی پر آمادہ کرتا ہے۔ چنانچہ ان سے اس قسم کا انتقام روا رکھا گیا جس کا ذکر انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"میری مایوسی کا اندازہ کیجئے، جب مجھے دوسروں سے معلوم ہوا کہ لاہور آپ کے قدوم میمنت لزوم سے متفخر ہونے والا ہی نہیں بلکہ ہو چکا ہے۔ آپ نے دو حرفی اطلاع تک سے دریغ کیا۔ آپ سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی اور اس سے میرے قلق میں مزید اضافہ ہوا۔ میری رائے میں ان امور پر گفتگو ملاقات ہی پر اٹھا رکھنی چاہئے۔"

ذمہ داری کس پر ؟

خطوط میں بعض جملوں سے باہمی اعتماد و احترام کا خصوصی اظہار ہوتا ہے مثلاً "آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کوئی بات چھپاتا نہیں، ایسا کرنا گناہ سمجھتا ہوں"۔ (اقبال نامہ حصہ دوم، ص ۱۲۹)

۱۔ صفحہ ۱۳۹   2 ایضاً : ۱۴۵

"آپ کی خواہشات کا احترام میں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔" (ایضاً ص ۱۴۷) "ممنونیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کی مسرت ہی میرا صلہ ہے۔" (ایضاً ص ۱۴۸) "ان دنوں کی یاد جو بیت چکے ہیں لیکن جن کی یاد میرے قلب میں تازہ ہے۔" (ایضاً ص ۱۴۵) "کاغذ جذباتِ انسانی کا کب متحمل ہو سکتا ہے اور کئی امور ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن کا ضبطِ تحریر میں لانا مناسب نہیں ہوتا" (ایضاً ص ۱۴۲)۔ ان میں ایک خاص نوع کی دلسوزی ہے اور کہیں کہیں بے تکلفی اور خوش دلی بھی۔[۱]

جو بلاشبہ اس بات کی دلیل ہے کہ لکھنے والے ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں لیکن ہر جگہ قلم ایک خاص ضبط و احتیاط کا پابند نظر آتا ہے۔ تمام خطوط میں فقط ایک مقام ایسا ہے جہاں اس نے اس وضع احتیاط سے ہلکی سی بغاوت اختیار کی اور ایک ایسی بات کاغذ پر لے آیا جسے اس ضمن میں حرفِ آخر کہنا چاہیئے۔ ایک اطالوی شہزادی کے خط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ابھی چند روز ہوئے مجھے ایک اطالوی شہزادی کا خط آیا تھا جس میں اس نے میری چند نظمیں معہ انگریزی ترجمہ کے طلب کی تھیں۔ لیکن شاعری کے لئے میرے دل میں کوئی ولولہ موجود نہیں اور اس کی ذمہ داری آپ پر عاید ہوتی ہے"۔[۲]

۱۔ بانگِ درا کی ایک نظم ہے 'سیرِ فلک'۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ شاعر خواب میں دوزخ و جنت کی سیر کرتا ہے۔ جنت کو دیکھ کر تو اسے کوئی اچنبھا نہیں ہوتا کیونکہ وہ جیسی سُنی تھی ویسی ہی ہے لیکن دوزخ کا انتہا درجے کا سرد مقام دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوتی ہے۔ اس پر فرشتے اسے بتاتے ہیں کہ دوزخ کی کوئی گرمی نہیں، یہاں آنے والا ہر گناہگار اپنی آگ ساتھ لاتا ہے

اہلِ دنیا یہاں جو آتے ہیں — اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

اپنے اس 'خواب' کی سرگزشت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں "میں بھی اس سفر میں امکان بھر کوئلہ جمع کرنے کی فکر میں ہوں لیکن یہاں کوئلہ کی کانوں کی بہت قلت ہے"۔ ایضاً ص ۱۳۰

۲۔ ایضاً ص ۱۴۱

ایک اور شہادت

ابھی ایک دلیل ہمارے پاس اور ہے۔ محترمہ عطیہ فیضی نے خطوط شائع کرنے اور یورپ میں اقبال کی زندگی کے متعلق بیش قیمت معلومات فراہم کرنے کے علاوہ اپنی مختصر کتاب کے آخر میں ان کی زندگی اور شخصیت پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ اقبال کی فکر و شخصیت پر بڑے بڑوں نے اظہارِ خیال کیا ہے اور آئندہ صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن جس انداز سے اور جس زاویے سے محترمہ عطیہ فیضی نے یہ تبصرہ انجام دیا ہے اس کا شاید کسی اور کو حق نہ پہنچتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے علاوہ کسی نقّاد یا سوانح نگار نے اس گوشے پر روشنی نہیں ڈالی جس کی طرف انہوں نے توجہ دلائی ہے۔ عطیہ فیضی وہ تنہا تبصرہ نگار ہیں جنہوں نے اقبال کی زندگی کو ایک "المیہ" قرار دینے کی جسارت کی ہے اور بہت سیدھے سادے اور دلنشین انداز میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کی دقیانوسی فضا میں ان کو اپنی آرزو کے مطابق ازدواجی زندگی بسر کرنے کا موقع نہ ملا تھا اور اس ناکامی نے ان کے دل و دماغ کو بے حد متاثر و مجروح کر رکھا تھا۔ وہ اپنی کتاب "اقبال" کے آخری پیراگراف میں لکھتی ہیں :

"ہمارے ملک میں رسم و رواج کو بے انتہا اہمیت حاصل ہے اور اگرچہ ان کا مذہب سے حقیقتاً کوئی تعلق نہیں پھر بھی ان کو ایسا رنگ دیا گیا ہے کہ کوئی شخص خاندان کی مرضی اور خواہش سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ اس روش نے بیسیوں مردوں اور عورتوں کی زندگی تباہ کر ڈالی ہے اور اقبال کی زندگی بھی ایسے ہی ایک سفّاکانہ المیہ کی مثال ہے جو خاندان والوں کی ہٹ دھرمی سے رُونما ہوا۔ جس اقبال کو میں یورپ میں جانتی تھی اس شخصیت کو میں نے ہندوستان میں کبھی نہ دیکھا اور جن لوگوں کو یہ موقع نہیں ملا کہ وہ اقبال کو اس کے اوائل میں دیکھتے وہ ہرگز اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ کس درجہ کی ذہانت و فطانت کے مالک تھے۔ ہندوستان

ہیں انکی طبیعت کا جوہر ماند پڑ گیا اور وقت کے ساتھ اس احساس کی تلخی ان کے شعور میں سرایت کرتی گئی۔ وہ عمر بھر پژمُردہ اور دل گرفتہ رہے کیونکہ انہیں خوب معلوم تھا کہ وہ "کیا ہو سکتے تھے"! میں جب یہ سطور لکھ رہی ہوں میرے ذہن میں دو تین ہندوستانی لڑکیوں کا خیال آ رہا ہے جن کی اعلیٰ اور نفیس ذہنی صلاحیتیں ان کو درجۂ کمال تک پہنچا سکتی تھیں لیکن خاندان کی خواہش آڑے آئی جو اُن کو کسی شخص کے ساتھ بیاہ دینے اور ان سے سبکدوش ہونے کیلئے بے قرار تھا کیونکہ اسے فکر تھی تو صرف اس بات کی کہ وہ سوسائٹی میں جلد ایک معزز خاتون کہلانے لگے۔ اس بے چاری کی زندگی کی اپنی تو کوئی قیمت ہی نہیں ہوتی۔ اصل قیمت اس بات کی ہے کہ وہ دُوسروں کے نزدیک معزز ٹھہرے اور جاہل لوگوں کو بات کرنے کا موقع نہ ملے۔ اقبال کا المیہ دیکھ چکنے کے بعد میں اپنی قوم سے اپیل کرتی ہوں کہ وہ اس سے متنبہ ہو اور نوخیز زندگیوں میں دخل دینے سے پہلے سنجیدگی کے ساتھ غور کر لیا کرے"!

جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے اُوپر کی رائے سے اتفاق یا اختلاف کرنا کچھ ایسی اہمیت نہیں رکھتا۔ جس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ محترمہ عطیہ فیضی صاحبہ کے ذہن میں اقبال کی 'ناکام گھریلو زندگی' کا احساس اس وقت بھی شدید تھا جب انہوں نے ۱۹۴۷ء کے قریب اپنے قیمتی مقالے کو سطور بالا پر ختم کیا۔ یہ احساس غلط ہو یا صحیح، نفسیاتی اعتبار سے اس کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ جس صورتِ احوال کا مولانا سالک نے (مرزا جلال الدین کے حوالے سے) علامہ اقبال کے 'جنت الفردوس' میں ہونے سے تعبیر کیا ہے، یہ باور کرنا مشکل ہے کہ محترمہ عطیہ فیضی اس سے ناواقف ہوں گی۔ اسکے باوجود انہوں نے علامہ مرحوم کی زندگی کو بے تکلف ایک 'سفاکانہ المیہ' قرار دیا ہے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ حیرت کی بات جب ہوتی اگر وہ اس تعلق خاطر کے باوجود جو علامہ

کو ان سے اور ان کو علامہ سے تھا وہ کوئی ایسا بیان دیتیں جو سالک صاحب کے بیان سے ملتا جلتا ہوتا۔

مضمون کے آغاز میں ہم نے جو سوالات اُٹھائے تھے، ان میں ایک تو زیرِ نظر روداد میں اقبال کی عام قلبی و ذہنی کیفیات سے تعلق رکھتا ہے اور دُوسرا ان اثرات سے جو بہ حیثیت مجموعی اُن کی شاعری اور زندگی نے ان واردات سے قبول کیے۔ پہلے سوال سے جس حد تک بحث ممکن تھی وہ اُوپر آ چکی ہے۔ اب ہم دُوسرے سوال کو لیں گے اور طوالت کے خوف سے اس کو بہ اختصار نپٹانے کی کوشش کریں گے۔

شخصیت و شاعری پر اثرات

محبت یا محبت میں ناکامی کے اثرات مختلف لوگوں پر مختلف ہوتے ہیں۔ بعض لوگ عمر بھر کے لئے یا ایک مدت تک مایوسی و افسردگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میر تقی میر کی یاس پسندی و دردمندی کے پیچھے ان اثرات کی کارروائی سے انکار ممکن نہیں۔ جدید اُردو شاعری کی تاریخ میں اختر شیرانی اور مجاز لکھنوی کی زندگی بھی انہی اثرات کی مثالیں ہیں[۱]۔ اقبال کے مزاج اور شخصیت میں خود اعتمادی اور توازن پسندی کی جو شان تھی اس نے ان کو یاس اور احساسِ نامرادی کی تلخیوں اور تاریکیوں سے بچا لیا۔ اس کی بجائے ان میں ایک خاص نوع کی دلسوزی اور دردمندی اُبھر آئی جو اپنے سوز و گداز اور درد و داغ کے باوجود صحت مند اور رجائیت پسند تھی۔ یہ صحتمند گداز جو اقبال کی شخصیت اور شاعری کا مایۂ امتیاز ہے اور جس کی بدولت ان کے فکر کو جذبہ کا

۱۔ اُردو ادب کی حالیہ تاریخ میں اختر شیرانی، مجاز، چراغ حسن حسرت اور منٹو کی بے وقت موت کو ان کی کثرتِ مے نوشی کا نتیجہ ٹھہرایا جا سکتا ہے، لیکن جہاں حسرت اور منٹو کے لئے مے برائے مے کی صورت تھی وہاں مجاز اور اختر کی مے نوشی «غمِ جاناں» غلط کرنے کا ایک ذریعہ بھی تھی میراجی کو بھی مو خر الذکر گروہ میں شامل کر لینا چاہیئے۔

رنگ و آہنگ نصیب ہوا، اگرچہ اور سرچشموں سے بھی فیضیاب ہوتا رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے عشق رسول ؐ، عشقِ ملت، عشقِ انسانیت اور عشقِ باری تعالےٰ کی تمام ضروری اور حیات بخش منزلیں طے کیں اور ان کا قلب ان تمام اعلیٰ لطیف اور نازک کیفیات سے آشنا ہوا۔ جنہیں بجا طور پر انسانیت کی ایک معراج قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس جذبے کا ابتدائی دھارا انہی واردات و معاملات کے منبع سے پھوٹا جن کا مطالعہ ہم نے اُوپر کیا ہے اور جنہیں عرفِ عام میں عشق مجازی کا نام دیا جاتا ہے۔

اس دور سے پہلے بھی اقبال کے یہاں سوز و گداز کی ایک کیفیت موجود تھی لیکن اس کا تعلق وارداتِ عشق سے کم اور حب الوطنی کے جذبات اور مجرد فکر سے زیادہ تھا یہی وجہ ہے کہ اس میں وہ شدت اور گرمی نہیں جو (مثال کے طور پر) "حسن و عشق" "نوائے غم" اور اس عہد کی دوسری نظموں کی خصوصیت ہے۔ یہاں سے اقبال کا عشق اور غم عشق انسانی حسن و شباب سے آشنا ہو کر حقیقت پسند بنتا ہے اور اس میں وہ گہرائی اور تاثیر پیدا ہوتی ہے جو پہلے ان کی یہاں موجود نہ تھی۔

اقبال نے اس حادثۂ غم کو کس نظریے سے دیکھا اور کس سلیقے سے برداشت کیا اسکے جواب میں دو باتوں پر زور دیا جا سکتا ہے۔ اوّل یہ کہ ایسے شخص کی طرح جو حالات کی سنگینی پر بلبلا اُٹھنے کی بجائے ان کو ناگزیر جان کر اپنے قلب و جگر میں ان کی برداشت کا حوصلہ پیدا کر لیتا ہے۔ انہوں نے پیش آمدہ صورتِ احوال کو بڑی حد تک خندہ پیشانی اور خوش اسلوبی سے قبول کیا۔ اس کا ثبوت "بانگ درا" کے حصہ سوم کی ایک نہایت اثر انگیز نظم "دو ستارے" سے ملتا ہے جو اسی زمانے کی یادگار ہے (اور اگست ۱۹۰۹ء کے 'مخزن' میں شائع ہوئی تھی)[۱] اس کا موضوع یہ ہے کہ دو ستارے قران میں آئے تو ان میں یہ قدرتی تمنا پیدا ہوئی کہ ان کا

۱۔ مطالبِ بانگِ درا از غلام رسول مہر ص ۱۶۷

یہ ملاپ مستقل صورت اختیار کر لے[1] لیکن جونہی اس خواہش نے جنم لیا وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے:

لیکن یہ وصال کی تمنا — پیغامِ فراق تھی سراپا
گردش تاروں کا ہے مقدر — ہر ایک کی راہ ہے مقرر

اور اس سے ناگزیر طور پر جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے:

ہے خواب ثباتِ آشنائی — آئینِ جہاں کا ہے جدائی

جو شخص اس حقیقت سے واقف ہے کہ شاعری بنیادی طور پہ ایک تمثیلی فن ہے اور یہاں مشاہدہ حق کی گفتگو بادہ و ساغر کہے بغیر نہیں بنتی اس کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اس نظم میں "ستاروں" سے کیا مراد ہے اور ان کی جدائی کس بات پر دلالت کرتی ہے۔ "دو ستارے" دراصل جدائی کے متعلق اقبال کے اپنے اندازِ نظر کی تلخیص ہے جس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اس صدمے کو آئینِ جہاں سمجھ کر ضبط و حوصلے کے ساتھ برداشت کیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان کی نظر غم کی تلخیوں پر ہی نہیں، اس کی فیض رسانیوں پر بھی تھی انہیں جلد معلوم ہو گیا تھا کہ غم (غمِ عشق) انسان کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور اس کی فطرت کو نکھارنے اور پاکیزہ بنانے کا بہت عمدہ نسخہ ہے اور اس کی بدولت اسے وہ مقام نصیب ہوتا ہے جو اس کے بغیر ممکن نہیں۔ غم ہمارے اندر ادراکِ حقیقت کی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور روحانی ترقی کی راہیں کھولتا ہے۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار یوں تو انہوں نے زندگی بھر کیا ہے اور اس موضوع پر "زبورِ عجم" اور "بالِ جبریل" میں خصوصیت سے بعض نہایت عمدہ اشعار ملتے ہیں لیکن اس کا پہلا اور واضح اور پرزور اعلان بھی انہوں نے اسی زمانے میں کیا جس کا مطالعہ ابھی ہمارے پیش نظر تھا۔ "فلسفۂ غم" جو سر فضل حسین کے والد ماجد کے انتقال پر بطورِ تعزیت نامہ

۱۔ تھوڑا سا جو مہرباں فلک ہو
ہم دونوں کی ایک ہی چمک ہو

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

محبت کے آغاز میں جوش و مسرت کا اظہار بھی فطری ہے اور اس میں ناکامی یا تشنہ کامی پر کرب و ملال کا احساس بھی فطری اور ان امور میں اقبال عام آدمیوں سے مختلف نہیں۔ لیکن جسطرح اظہارِ محبت اور اندازِ محبت میں انکی انفرادیت مسلم ہے، اسی طرح اس میں ناکامی یا تشنہ کامی کو برداشت کرنے اور انسانی نفسیات پر اس کے عمیق اور صحتمند اثرات کو جاننے پہچاننے میں وہ منفرد ہیں۔ اس حادثۂ عشق کا آغاز اگر جذبات انگیز تھا تو اس کا انجام بصیرت افزا اور نظر افروز ثابت ہوا اور اس کی بدولت اُردو شاعری کو فکر و جذبہ کی وہ ندرت اور ثروت نصیب ہوئی جو اسے میر و غالب کے ہاتھوں کبھی میسّر نہ آسکتی تھی۔

سلیم اختر

اقبال کا نفسیاتی مطالعہ

"آپ میرے بارے میں کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں اور ایسا ظالمانہ طرزِ عمل اختیار نہ کریں۔ جیسا کہ آپ نے میری توقعات کے خلاف اپنے آخری خط میں اختیار کیا ہے۔ آپ نے ساری باتیں ابھی تک نہیں سنیں۔ آپ میری تکالیف سے واقف نہیں۔ جو ایک بڑی حد تک میرے طریقۂ عمل کی تشریح کر دیں گی۔ آپ کے متعلق میرے طرزِ عمل کی مکمل تشریح کیلئے ایک غیر ضروری طور پر طویل خط درکار ہوگا ــــــ شاید ایک سے کہیں زیادہ خطوط۔ مزید براں الفاظ کی حقیقی آواز کاغذ پہ اُن آوازوں کی نقل سے بہت زیادہ یقین دلانے والی ہوتی ہے۔ کاغذ میں ہمدردی کا احساس نہیں ہوتا اور ایسی بھی باتیں ہوتی ہیں جن کا اظہار کاغذ پہ نہیں ہونا چاہئیے۔ اس لئے میرے منشا کا اندازہ کرنے میں اسقدر عجلت سے کام نہ لیں۔ آپ مجھے الزام دیتی ہیں کہ میں بھاڑے کا ٹٹو اور عملی آدمی بن گیا ہوں۔ شاید اس میں صداقت کا عنصر موجود ہو لیکن جب آپ تمام حالات سے باخبر ہو جائیں گی اُس وقت اس کے لئے کچھ نہ کچھ وجۂ جواز ضرور پائیں گی۔ دوسرے امور میں میں ابھی تک خواب دیکھنے والا شخص ہوں اور خوبصورت خیالات کا خواب دیکھنے والا . . . . . "

(اقبال بنام عطیہ بیگم)

مشرق کے آداب شرافت میں شخصیت پرستی کو بلا وجہ جو اساسی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اس کے مضر اثرات نے شخصیت نگاری کو بالخصوص اور تنقید کو بالعموم متاثر کیا ہے۔ جس کی وجہ سے تحریر میں سیرت بھاری سنہری ملبوسات میں لپٹی خوش رنگ اور خوش نظر تو معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت کے رنگ و بو سے عاری رہتی ہے۔ اسکی بنیادی وجہ ایک خاص تورع کے خوف میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ یہ خوف ہے حقیقت کا۔ حقائق سے آنکھیں چراتے ہوئے یہ باور کر لینا کہ بس حقیقت کا وجود معدوم ہو گیا۔ یا پھر حقائق کو اپنی سہولت یا ضرورت کے مطابق توڑ موڑ کر حسب منشا نیا پیکر عطا کر کے مطمئن ہو جانا ـــــــــ یہ انداز ہمارا قومی نشان بن چکا ہے۔ ہم اُس پجاری کی مانند ہیں جو بت کو خدا تو بنا سکتا ہے لیکن اُسے بت کے روپ میں دیکھنے کی جرأت نہیں رکھتا۔

ہمارے شخصیت نگار کیوں ۱۸۹۴ء سے آگے نہ بڑھ سکے؟

کم از کم اقبال کے معاملے میں تو ایسے محسوس ہوتا ہے گویا چند استثنائی مثالوں سے قطع نظر بیشتر ٹھنڈے پانی سے خوفزدہ ہیں۔ اقبال کیونکہ شاعرِ مشرق مفکرِ اسلام اور حکیم الامت ہے۔ اس لئے اُس کے بارے میں ہرگز ہرگز کوئی ایسی بات نہ لکھی جائے جس سے وہ انسان بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ مرد ثابت ہو سکے۔

پاکستان بننے سے پہلے بھی اقبال پر اہلِ قلم خامہ فرسائی کرتے رہے تھے۔ لیکن گذشتہ ربع صدی میں تو اقبال سدا بہار موضوع کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ چنانچہ اقبالیات اب ایک مستند اصطلاح ہی نہیں بلکہ اس ذیل میں آنے والی کتب بارِ شتر سے کم نہ ہوں گی، لیکن حالت یہ ہے کہ تنقید کے نام پر لکھی گئی بیشتر تحریریں محض تشریحی نوعیت کی ہیں اور یوں اُنکی حیثیت کالج نوٹس سے زیادہ نہیں (بعض تو واقعی کالج نوٹس ہیں) شاید اسی لئے اقبال کے صاحبزادہ جاوید اقبال کو لکھنا پڑا۔

"جہاں تک تعداد کا تعلق ہے، تو جتنا زیادہ اقبال پر لکھا گیا اُتنا اور کسی بھی مسلمان شاعر پر

نہیں لکھا گیا۔ تاہم ابھی تک ایسا مواد دستیاب نہیں جس میں اس انسان کی پُرپیچ شخصیت اور انسانیت سے انصاف کرتے ہوئے یہ اُجاگر کیا گیا ہو کہ اقبال نے کس طرح گہری وابستگی سے اپنے گرد و پیش پھیلی دُنیا کی مُردنی کے مقابلے میں حیات بخش ردِ عمل کا اظہار کیا" لے

میرا یہ مقصد نہیں کہ اقبال (یا اس لحاظ سے کسی بھی عظیم شخصیت) پر ضرور کیچڑ اُچھالی جاتے، صرف اختراع پردازی اور الزام تراشی سے شخصیت اُجاگر ہو سکتی ہے اور ہم اُنہیں صرف گندگی کے حوالے سے ہی انسان تسلیم کر سکتے ہیں، ایسا نہیں اور نہ ہی ایسا ہونا چاہئیے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ حقائق سے چشم پوشی نہ ہو۔ اس نوع کی باتوں (بلکہ "معلومات") سے اُس وقت فرق پڑتا ہے جب اُن کی روشنی میں فن کار کی شخصیت میں کوئی نمایاں تغیّر یا انقلاب رُونما ہوتا ہو یا اُن سے اُس کے فن کی نئی جہت سامنے آتی ہو یا پھر بعض فن پاروں پر نئے زاویے سے یُوں روشنی پڑے کہ اُن کے معانی میں وُسعت یا مفہوم میں گہرائی پیدا ہوتی ہو۔ اگر شراب نوشی سے فن متاثر نہیں ہوتا تو آج کے ناقد کے لئے اُس پہ زور دینا بے معنی ہے۔ جب کہ سوانح نگار کے لئے یہ ایک عام دلچسپی کی مگر ثانوی اہمیت والی معلومات ہوگی۔ ہم لوگ خاموشی کی سازش کے ماہر ہیں اس لئے اخفا سے کام لینا فطرتِ ثانیہ ہے جس کے نتیجے میں اقبال کو شاعری کا کمپیوٹر سمجھ لیا گیا ہے۔ ایسا کمپیوٹر جس نے "الہام" کے بٹن پر اُنگلی رکھی اور کھٹ سے ایک بلند پایہ نظم (مثلاً مسجدِ قرطبہ) باہر آگئی۔

عطیہ بیگم فیضی اُردو ادب میں ایک legend کی سی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ یہ تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ واقعی شبلی کے لئے فیٹی براں اور اقبال کے لئے بیٹرس تھی لیکن اتنا یقینی ہے کہ اُردو کے اِن دو عظیم ادیبوں نے عطیہ کی شخصیت سے بہت گہرے اثرات قبول کئے۔

Stray Reflections (Introduction page xxiv) - لے

کشمیری النسل اقبال کا معاملہ جُدا گانہ تھا، کہ رگوں میں پنجابی خُون دوڑ رہا تھا۔ لیکن وہ کِس قسم کا جوان تھا۔ اُس کی جذباتی ساخت کیا تھی۔ بحیثیت ایک مرد اُسکی پسند و ناپسند کیا تھی اِس ضمن میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ تو اس لئے کہ ہمارے سوانح نگاروں نے ان اُمور کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور کچھ اس لئے بھی کہ اقبالؒ نے اپنی تحریروں میں دانستہ (یا نادانستہ) طور پر اِس نوع کے اشارات سے احتراز کیا۔ اقبال نے بھی غالب کی مانند بے شمار خطوط لکھے اُن میں مداحوں ناقدوں اور پرستاروں کے علاوہ بے تکلف اور مشفق احباب بھی شامل تھے۔ لیکن سوانحی مواد کے لحاظ سے ان خطوط کی اہمیت برائے نام ہے۔ ان میں فلسفہ، تصوّف، اسلام، خودی، ادب و فن غرض کہ زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن ان خطوط میں اگر کوئی اصل اقبال کی تلاش کرے تو یہ سعی لاحاصل ہو گی۔ جب کہ غالب نے اپنے خطوط میں خود کو عریاں کر دیا۔ اس لئے غالب کی زندگی اور فن پر ایک سے زائد نفسیاتی مقالات لکھے جا سکتے ہیں جب کہ اقبال کے بارے میں اس جرم کا ارتکاب کرنے کے لئے تو ڈھنگ کے حوالے بھی نہیں ملتے۔ اگر عطیہ بیگم کے خطوط اور ڈائری سے اقتباسات نہ طبع ہوتے تو اقبال اور اُن کے ساتھ شبلی کی زندگی کے یہ اہم ترین موڑ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے اوجھل رہتے۔

اقبال کو ایک مفکر مصلح اور فلسفی کے رُوپ میں پیش کرنے والے یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ کبھی وہ بھی جوان ہو گا اور قلب و نظر اور ذہن متنوع اثرات کی آماجگاہ بھی بنے ہوں گے چنانچہ اگر غلطی سے کوئی چونکا دینے والی بات سامنے آجائے تو ذہن کو گویا ۴۴۰ وولٹ کا جھٹکا لگتا ہے۔ مثلاً اقبال کی یادداشتوں پر مشتمل نوٹ بک Stray Reflections (مرتبہ جاوید اقبال) میں اقبال نے ایک موقع پہ یہ بتاتے ہوئے کہ اُس کی زندگی میں ہیگل، گوئٹے، غالب، بیدل اور ورڈزورتھ کے افکار و نظریات اور شاعری نے کیا کردار ادا کیا۔ اس امر کا بھی اعتراف کیا کہ ورڈزورتھ نے "زمانہ طالب علمی میں مجھے دہریت سے بچایا (ص۵۴) یہ اعتراف اتنا خطرناک نہیں جتنا بظاہر لفظ "دہریت" سے معلوم ہوتا ہے اور اسے اقبال کے افکار و نظریات

کے ارتقائی مدارج میں خصوصی اہمیت بھی نہیں دی جاسکتی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس سے اقبال کے ذہن کے ایک خاص رُخ کا اندازہ یقیناً لگایا جاسکتا ہے۔ جاوید اقبال نے اس کی توجیہہ یوں کی ہے "زمانۂ طالب علمی کی یہ دہریت اُس کے ذہن کے متجسسانہ رویّہ اور استفسار پسندی کی غماز ہے۔ وہ اُن میں سے نہیں تھا جو دُوسروں پر انحصار کرتے ہوئے کسی بھی شے کو تسلیم کر لیتے ہیں"۔

یہ توجیہہ کچھ غلط نہیں اور مشرقی روایات اور مذہبی عقائد میں پروان چڑھے ذہن نے مغرب کے فلسفے اور سائنس کے تجزیاتی انداز سے پہلی مرتبہ رُوشناس ہونے پر یقیناً اعتقاد کی بُنیادوں کو متزلزل پایا ہوگا۔ لیکن میرے خیال میں بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ یہ "دہریت" اعتقادی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص ذہنی رویّے کی بھی غماز ہے اور وہ ہے انتہا پسندانہ رویّہ۔ یہ انتہا پسندی ہی تھی جس نے پہلے اقبالؔ میں دہریت کو اُبھارا اور پھر اُس کے ردِّ عمل میں وہ تمام عمر ہر نوع کی بُت پرستی کے خلاف جہاد کرتا رہا۔

اقبالؒ نے مشرقی روایات کے حامل ایک دیندار مُسلم گھرانے میں جنم لیا۔ ابتدائی تعلیم اور سیالکوٹ میں ایف اے پاس کرنے تک یہ اثرات کسی ذہنی مزاحمت کے بغیر عمل پیرا رہے۔ لیکن سیالکوٹ (جو اُس وقت محض ایک قصبہ تھا) سے نکل لاہور ایسے بڑے شہر میں آکر اور گورنمنٹ کالج میں فلسفے کی تعلیم نے ذہن میں بھونچال پیدا کیا ہوگا۔ جس کا علاج ورڈز ورتھ کی فطرت پرستی میں تلاش کیا۔ یہ عارضی دور ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ فلسفے کی دہریت کا علاج ــــــ علاج بالمثل کے مصداق ــــــ بھی فلسفے ہی میں تلاش کیا۔ جیسے جیسے اقبال کے فلسفیانہ مطالعے کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا ویسے ویسے ہی وہ فلسفیانہ تضادات کو فلسفے سے ہی دُور کرنے میں کامیاب ہوتا گیا۔ شاید اسی لئے وہ نِطشے کو بھی لفظ دہریہ کے عام مفہوم میں دہریہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس لئے کہ اس نوع کی دہریت خود اُس میں بھی چھپی رہی۔

یہی انداز اُسکی جذباتی زندگی میں بھی کارفرما نظر آتے گا۔ پہلی شادی سے اقبال خوش نہ تھا۔ یورپ میں عطیہ سے ملاقات ہوئی اور ہم مذاقی اور ہم مشربی کو اُس نے جذباتی ناآسودگی کے لئے باعثِ تسکین بنانے کی سعی کی۔ لیکن بہ وجوہ بات نہ بن سکی۔ اُس کی وجہ اقبال تھا یا عطیہ؟ —— اِس ضمن میں وثوق سے اب کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ علاج بالمثل کے طور پر مزید دو شادیاں ضرور کیں۔ اسی نوٹ بک میں حقیقی شادی کے بارے میں اقبالؒ کی یہ رائے بھی قابلِ غور ہے۔

"حُسنِ فطرت کے اثرات کا صرف ایک محبوب کی آنکھ سے ہی خود میں انجذاب ممکن ہو سکتا ہے اور اسی میں حقیقی شادی کی اہمیت مضمر ہے۔" (ص: ۱۳۳)

اقبال نے عام روائتی انداز میں میاں بیوی کو دو ہستیے قرار دیکر شادی کو جھگڑے میں تبدیل نہ کیا بلکہ اُسے حسنِ فطرت سے ہم آہنگ کر کے اُس کے لئے ایک وسیع تر تناظر ہی مہیا نہ کیا بلکہ فطرت کے حوالے سے اس رشتے کی جڑیں بھی انسانی فطرت میں پیوست کر دیں۔ اس کا حوالہ ایک فلسفیانہ مقولے کے طور پر نہیں دیا گیا۔ نہ ہی اسے ملفوظاتِ اقبال کے طور پر پیش کیا گیا۔ بلکہ اس امر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ ایک ناکام شادی اور یورپ میں پُربہار زندگی کے بعد اٹھائیس سالہ اقبال شادی کو کیا سمجھتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا (۱۹۱۰ء) جب اقبال کی جذباتی ناآسودگی عروج پر تھی۔ لیکن شادیاں ہو جانے اور زندگی میں ایک بلند مقام حاصل کر لینے کے بعد اقبال نے شادی کے بارے میں بالکل عملی قسم کا تصوّر پیش کیا۔ چنانچہ سر راس مسعود کو ایک خط میں یوں لکھا:

"شادی کا بنیادی مقصد، صالح توانا اور خوش شکل اولاد پیدا کرنا ہے اور رُومان کا اس میں دخل نہ ہونا چاہیئے۔"

۱۔ جب میں اُنہیں خط لکھوں گا تو اُنہیں اُن دنوں کی یاد دلاؤں گا جب کہ آپ جرمنی میں تھیں۔ آہ وہ دن جو پھر کبھی نہ آئیں گے۔" (اقبال از عطیہ بیگم ص ۵۶)

——— حُسنِ فطرت کی جگہ حسنِ اولاد نے کیوں لے لی ؟

کیا یہ اعترافِ شکست ہے یا اقبالؔ کی نفسیاتی ساخت ہی ایسی تھی۔ اس سوال کے جواب کے لئے آخری وقت کے اقبال سے قطع نظر کر کے یورپ کے قیام کے زمانے کی طرف لوٹنا ہوگا۔ اس لئے کہ وہ تین سال کا عرصہ حیاتِ اقبال کا اہم ترین موڑ ثابت ہوتا ہے شاعرانہ اور فلسفیانہ لحاظ سے بھی اور جذباتی لحاظ سے بھی۔ ہرچند کہ اقبالؒ نے بعد میں یہ دعویٰ بھی کیا :

"میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو اوروں کے لئے سبق آموز ہو سکے"[۱]

لیکن حیاتِ اقبال کا جائزہ لینے پر ایک سے زائد واقعات نظر آجاتے ہیں۔

اقبال کی پہلی شادی ایف اے کا امتحان دینے کے بعد ہوئی، بلکہ بقول "سالک" جب بارات سیالکوٹ سے گجرات جانے کے لئے تیار ہوئی تو سہرا باندھا گیا۔ اقبال گھوڑے پر سوار ہو گئے تو پاس ہونے کی خوشخبری کا تار آیا۔[۲] باالفاظ دیگر یہ ایک کامیاب شادی کا شگون تھا۔ اور دُلہن کے بھاگوان ہونے کی نشانی۔ پھر یہ شادی کیوں ناکام ثابت ہوئی ؟ کیا اقبالؔ نے شادی سے کچھ ایسے تقاضے وابستہ کر رکھے تھے جن کی تسکین اس شادی سے نہ ہو سکی ہمارے ملک میں شادی ایک طرح کا جبر اور لاٹری کا کھیل بن چکی ہے۔ والدین اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق جو رشتہ طے کرتے ہیں اُن کی کامیابی کے بارے میں اُن کے صرف اندازے ہوتے ہیں۔ خود دولہا دلہن کو بھی یہ علم نہیں ہوتا کہ ہماری کیسے گذرہو گی۔ ایک ایف اے کا طالب علم جس نے ابھی تک نہ تو زندگی کے گرم سرد تجربات حاصل کئے تھے نہ تلخ تُرش حوادث سے دوچار ہوا۔ ابھی زندگی میں اُسکا کوئی مقام بھی متعین نہیں ہوا بلکہ وہ تو خود بھی یہ نہیں جانتا کہ اُسے کونسا مقام حاصل کرنا ہے۔ ان حالات میں ایک ناتجربہ کار

۱۔ مکتوب بنام عشرت رحمانی۔ اقبال نامہ ص ۴۲۶

۲۔ ذکرِ اقبال ص : ۱۵

Teenager کا والدین کے حکم کی تعمیل میں دولہا بننا اور بات ہے اور پڑھ لکھ کر اور یورپ کی آزاد فضا دیکھ کر اس دلہن سے نباہ کرنا قطعی جداگانہ بات ہے شادی کی کامیابی میں کئی پیچیدہ عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ جن میں سے طبیعتوں کی ہم آہنگی کو غالباً سرِفہرست قرار دیا جا سکتا ہے اسی سے دونوں میں وہ ذہنی مطابقت پیدا ہوتی ہے کہ شادی دوستی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس لئے بیوی کی صورت، سیرت، دولت حشمت نسب اور شرافت کے باوجود بھی شادی ناکام ہو سکتی ہے اور ایسی صورت میں دونوں بے قصور رہ سکتے ہیں۔ وجوہات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں یہ واضح ہے کہ اقبال کی پہلی شادی ناکام رہی۔ عطیہ بیگم کے نام ۹ راپریل ۱۹۰۹ء کے مکتوب میں بہت تلخ لہجہ میں اقبال نے اپنی شادی کا ذکر کیا ہے:

"ہاں! میں نے علی گڑھ کی فلسفہ کی پروفیسری قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور چند دن ہوئے لاہور گورنمنٹ کالج میں تاریخ کی پروفیسری قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے میں کسی قسم کی ملازمت کرنا نہیں چاہتا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ میں جلد سے جلد اس ملک سے بھاگ کر کہیں چلا جاؤں۔ آپ کو اس کی وجہ معلوم ہے۔ میں اپنے بھائی کا ایک قسم کا قرضدار ہوں اخلاقی قرضدار، اور یہی چیز مجھے روک رہی ہے۔ میری زندگی سخت مصیبت بنی ہوئی ہے وہ مجھ پر کوئی سی بھی بیوی زبردستی منڈھ دینا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنے والد کو لکھ دیا ہے کہ انہیں میری شادی ٹھہرانے کا کوئی حق نہ تھا۔ بالخصوص جب کہ میں نے اس قسم کے تعلق میں پڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اسکی کفالت کرنے پر بالکل رضامند ہوں لیکن میں اسے اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی کو اجیرن بنانے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے مجھے مسرت اور خوشی حاصل کرنے کا حق ہے۔ اگر سوسائٹی مجھے وہ حق دینے سے انکار کرے تو میں دونوں کا کھلم کھلا مقابلہ کرونگا۔ واحد علاج یہ ہے کہ میں اس بدبخت ملک کو چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں یا پھر شراب نوشی میں پناہ لوں جو خودکشی کو آسان

بنا دیتی ہے۔ کتابوں کے یہ مُردہ بنجر اوراق مجھے مسّرت نہیں دے سکتے۔ میری رُوح بجلی کی آگ پنہاں ہے جو اُنہیں جلا سکتی ہے اور تمام سماجی رسُوم کو بھی آپ کہیں گی کہ ایک اچھے خدا نے یہ تمام چیزیں پیدا کی ہیں، ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر اس زندگی کے واقعات ایک مختلف نتیجہ کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ کسی اچھے خدا کی بجائے کسی قادرِ مطلق شیطان پر یقین لے آنا زیادہ آسان ہے۔ براہِ کرم اِن خیالات کے اظہار کے لئے معاف کیجئے گا۔ مَیں ہمدردی کا خواستگار نہیں ہوں۔ میں تو صرف اپنی رُوح کے بوجھ کو اُتار دینا چاہتا تھا۔ آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں اور اسی وجہ سے میں نے اپنے خیالات، کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی جُرأت کی ہے۔ آپ سمجھ گئی ہونگی کہ مَیں نے ملازمت سے کیوں انکار کیا ہے[2]

یہ خط اقبالؒ کی شدید ترین جذباتی کشمکش کا آئینہ دار ہے۔ اگر اس خط کا تحلیلی مطالعہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل امُور واضح ہوتے ہیں:

۱۔ "اس مُلک سے بھاگ کر کہیں چلا جاؤں"۔

۲۔ "اپنے بھائی کا ایک قسم کا اخلاقی قرضدار ہوں"۔

۳۔ "شادی کے ضمن میں اس قسم کے تعلق میں پڑنے سے انکار کر دیا تھا"۔

۴۔ "کسی قادرِ مطلق شیطان پر یقین لے آنا زیادہ آسان ہے"۔

اس خط میں مُلک سے فرار کا جو شدید جذبہ موجزن ہے وہ دراصل شادی کی پیدا کردہ جذباتی اُلجھنوں کی بنا پر ہے۔ گو اقبالؔ نے سب کچھ واضح الفاظ میں تو نہیں لکھا۔ لیکن اس

۱۔ اس کے برعکس، ۲۰ مئی ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر عباس علی خان کو یہ لکھا "انسان صرف جویائے محبت اور اپنے یارِ حقیقی کی دھن میں لگا ہے۔ باقی تمام عبث اور خیال دُنیا کا بے ہُودہ فلسفہ ہے ہم اسکو ڈھونڈھتے رہیں جو ہم کو ڈھونڈھنا چاہتا ہے۔ اُس کو ڈھونڈھیں خوب ڈھونڈھیں اور اتنا ڈھونڈھیں کہ اپنے آپ کو پالیں"۔ (اقبال نامہ ص ۲۹۷)

۲۔ اقبال از عطیہ بیگم ص ۵۱-۵۲

میں جو اشارات ہیں اُن سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ اقبال نے اس شادی سے انکار کیا تھا یا کم از کم اپنے والدین کو یہ ضرور احساس کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ فی الحال شادی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ ۱۸۹۳ء میں ایک نوخیز نوجوان اپنی پسند و ناپسند کو زیادہ شدید لہجے میں جارحانہ انداز سے اپنے والدین پر نہ ٹھونس سکتا تھا۔ اگر اقبالؔ عام انسانوں کی مانند ہوتے فلسفہ نہ پڑھتے۔ یورپ نہ جاتے تو شاید نباہ ہو جاتا لیکن یورپ سے واپسی کے بعد گھٹن کا احساس کچھ زیادہ ہو گیا۔

اقبال کے محولہ بالا خط کا آخری حصّہ نفسیاتی لحاظ سے بے حد دلچسپ ہے گو خُدا پر شیطان کو ترجیح دینا اُس اعصابی تناؤ اور ذہنی پژمُردگی کی بنا پر ہے جسکے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ملک سے فرار چاہتے تھے۔ لیکن اُس کے ساتھ زمانۂ طالب علمی کی "دہریت" کے اعتراف کو ملحوظ رکھ کر اتنا اندازہ تو لگایا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ نے خدا کے روایتی تصوّر کو کبھی بھی دل سے نہ قبول کیا ہو گا۔ اُسکی وجہ یہ ہے کہ ہمیں دُکھوں اور پریشانیوں کو حکم خدا سمجھ کر سرِ تسلیم خم کرنے کی تلقین کی جاتی رہی ہے۔ لیکن اقبالؒ نے اسے تسلیم نہ کیا۔ اُن کا یہ کہنا کہ "ایک اچھے خدا کی بجائے کسی قادرِ مطلق شیطان پر یقین لے آنا زیادہ آسان ہے"، جہاں اس شدید نفسی کرب کا غماز ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان خدا کو گالیاں دینے تک پر اُتر آتا ہے۔ وہاں تقابل کے لئے شیطان کو قادرِ مطلق قرار دینا بذاتِ خود ایک اہم نفسیاتی اشارہ ہے۔

اس اشارے سے وابستہ امکانات پر مزید روشنی ڈال کر بات کو اور بھی پھیلایا جا سکتا ہے۔ اقبال کے ذہنی رجحانات اور مخصوص شخصی میلانات کے بارے میں ہمیں کوئی خاص معلومات حاصل نہیں ہیں لیکن اتنا ہے کہ بعض امور میں تو اقبالؒ خود اپنے اِس مصرعے کی تفسیر معلوم ہوتا ہے۔ ع

قلب او مومن دماغش کافر است

اس خط سے وابستہ جذبات اور تلازمات کے تناظر میں اقبالؒ کے تصورِ ابلیس کا مطالعہ کریں تو کیا اقبال اُس سے مرعوب نظر نہیں آتا۔ جبریل اور ابلیس کے مکالمے میں اقبال نے ابلیس کو ہر طرح سے فوقیت دی ہے۔ چنانچہ جبریل کے اس سوال:

ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بُو

کے جواب میں ابلیس کا یہ کہنا:

ع سوز و ساز و درد و داغ و جستجوئے و آرزو

اور پھر یوں طعنہ زن ہونا:

مَیں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تُو فقط اللہ ہُو، اللہ ہُو، اللہ ہُو!

ان اشعار کے ساتھ ساتھ اگر خدا کے بارے میں کہے گئے اشعار بھی پیشِ نظر رکھیں تو شکوہ شکایت سے قطع نظر خدا کی ہمسری:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

کے ساتھ ساتھ تسخیرِ خدا کا جذبہ بھی ملتا ہے۔ ع

یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

یہ اور اسی نوع کے اشعار کے پیچھے کہیں ۱۹۰۹ء کی جذباتی ناآسودگی اور اُس سے وابستہ حسرت و یاس کا شدید ردِ عمل تو کارفرما نہیں؟

اب بات خدا والی چلی ہے تو اس ضمن میں ڈاکٹر محمد اجمل صاحب نے ایک نئے ہی زاویے سے اقبال کی شخصیت کو اپنے ایک مضمون "اقبال کے ہاں خدا کا تصوّر" میں اُجاگر کیا ہے۔ اُن کے بقول "اقبال خود عورت ہے اور خدا اُسکا مرد، اقبال اپنی دلبری اپنے رقص و رامش سے خدا کا دل برماتا ہے۔ کبھی اُسکی فرقت میں وہ جاں گداز نوحہ و فغاں

کرتا ہے کہ شیریں فرہاد کے لئے کیا روتے گی اور کبھی عالم وصل میں اُس اختلاط اور اُس سُرور کا اظہار کرتا ہے کہ عشق میں سرشار الیفرڈ ڈانٹے بھی کیا کرے گی۔ اور کبھی کبھی ایک غیر مطمئن بیوی کی طرح اپنے شوہر (خدا) سے یُوں بھی خطاب کرتا ہے:

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

جب کائنات اور انسانیت کی ذمہ داری کا ذکر آتا ہے اقبال خُدا سے تکرار کرتا ہے کہ یہ خدا کا فرض ہے کہ وہ انسانوں کی تقدیر سنوارے اور اُسکا لہجہ ہمیشہ ایک زبان دراز عورت کا ہوتا ہے جو نہایت خود پسند، خود سر اور خود آرا ہے۔ کبھی تو وہ خدا کو ہی طعنہ دیتی ہے:

چُناں خود را نگہداری کہ با ایں بے نیازی ہا
شہادت بر وجودِ خُود ز خُونِ دوستاں خواہی

یا کبھی للکار کے انداز میں خدا پر حکم نافذ کرتی ہے:

یا جہانِ تازہ یا امتحانِ تازہ
می کنی تا چند با ما آں چہ کردی پیش ازیں
با چُناں کُن یا چُنیں

خدا کے ساتھ تقریباً ہر مکالمے میں اقبال کا رویّہ یہی ہے۔ وہی کچھ جو ایک محبوبہ وقتاً فوقتاً اپنے عاشق سے کیا کرتی ہے۔ اقبال خُدا سے کہہ ڈالتے ہیں۔ اُن کے تنازعے کی نوعیت بھی اسی قسم کی ہوتی ہے:

بحضورِ تُو اگر کسے غزلے زمن سراید
چہ شود اگر نوازی بہمیں کہ داشم او را "۱

۱۔ راوی صد سالہ خاص نمبر

ڈاکٹر محمد اجمل مانے ہوئے ماہرِ نفسیات ہیں لیکن افسوس کہ اُنھوں نے اپنے استدلال کو مزید وسعت نہ دی ورنہ وہ بآسانی ہماری رہنمائی اُن نفسی محرکات تک کر سکتے تھے۔ جو بالآخر ایک "خود پسند، خود سر اور خود آرا" عورت ایسے لہجے اور انداز پر منتج ہوئے۔ اگر اسی نقطۂ نظر ہی سے اقبال کے کلام کو دیکھیں تو اُس کے ہاں تسخیرِ خدا کی جو شدید خواہش ملتی ہے یعنی یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ۔ کہیں وہ اسی عورت پن کا ردِ عمل تو نہیں؟ ——— اقبال کے ہاں قوت پرستی نے جو ایک قوی رجحان کی صورت اختیار کی تو کیا اسے بھی ایک کمپو فلاج قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کے اشعار تو بہت مقبول ہیں یہاں اُس کی نوٹ بک Stray Reflections سے کچھ اقتباسات درج کئے جاتے ہیں جن کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کے لئے اُسکی کتنی اہمیت تھی۔

۱۔ "قوی شخص ماحول ساز ہوتا ہے جبکہ کمزور اُسکے مطابق خود کو ڈھالتا ہے"

۲۔ "قوت نے کذب کو چھوا اور دیکھو وہ صداقت میں منتقل ہو گیا۔"

۳۔ "تہذیب۔ قوی انسان کی ایک سوچ!"

۴۔ "قوتِ مجسم مہدی کا انتظار چھوڑ دو۔ جاؤ اور خود اُسے تخلیق کر دو!"

۵۔ "مسیحیت میں خدا محبت ہے تو اسلام میں قوت۔ ہم اپنے تاریخی تجربات کی بنا پر تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ قوت کے روپ میں خدا کی پیش کش بہتر ہے۔"

۶۔ "صداقت کے مقابلے میں قوت زیادہ ربانی ہے۔ خدا قوت ہے لہٰذا تمہیں بھی اپنے آسمانی باپ کی مثل ہونا چاہیئے۔"

یہ اور اس نوع کی دیگر آرا اس لحاظ سے اہم ہیں کہ جب اقبال نے ۱۹۱۰ء میں اس نوٹ بک میں اپنی "آوارہ سوچ" مقید کرنی شروع کی تو یہ ایک ہیجان انگیز وقت تھا۔

۱۔ یہ امر باعثِ دلچسپی ہے کہ اقبال نے اس نوٹ بک کو پہلے Stray Thoughts کا نام دیا لیکن بعد میں Thoughts کو Refelcts سے تبدیل کر دیا۔

اُس زمانے کے عطیّہ کے نام لکھے گئے خطوط شدید مایوسی پریشان خیالی اور دُنیا اور دُنیا والوں سے بے زاری کے غماز ہیں۔ شادی ایک وجہ ہو گی لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ابھی تک ہمارے ناقدین اور شخصیت نگاروں نے اس نوٹ بک کی نفسیاتی اہمیت کو نہیں سمجھا ہے۔ یہ دُرست ہے کہ اپنے نام کی مناسبت سے یہ محض Stray Reflections ہی ہیں۔ کوئی باضابطہ فلسفیانہ مضامین یا علمی مقالات نہیں۔ مزید براں یہ بغرضِ اشاعت نہ تھی اس لئے اقبال نے اپنی مختلف ذہنی کیفیات اور جذباتی مدوجزر کے تحت انتہائی بے تکلفی سے اپنی سوچ کو قلمبند کیا اور یہی بے تکلفی آج ان کی اہمیت کا جواز قرار پاتی ہے۔

اس پریشانی کے دَور میں جب کہ اقبال شعر گوئی کا بھی نہ رہا تھا۔ جاوید اقبال کے بقول:

"۱۹۱۰ء میں اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں کوئی نظم بھی نہ پڑھی حالانکہ اقبال کی بعض شاہکار نظمیں اسی کے سالانہ جلسوں کے لئے لکھی گئی تھیں" گویا اس کے تخلیقی اُبال اور جذباتی بھونچال دونوں کے لئے اس نوٹ بک نے سیفٹی والو کا کام کیا ہو گا اور اسی لئے میں نے اس نوٹ بک کی نفسیاتی اہمیت کی طرف توجہ دلاتی تھی۔ اسی نقطۂ نظر سے قوّت کے بارے میں اقبال کے اقوال کا مطالعہ کرنے پر کیا یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ایک بے بس اور کمزور شخص اُس صفت کے بارے میں سوچ رہا ہے جس سے وہ خود عاری ہے یا کم از کم خود کو (وقتی طور پر ہی سہی) عاری محسوس کر رہا ہے۔ خاص طور سے ۱ور ۲ اور ۲ میں کیا وہ اپنی حالت بیان کرتا نہیں محسوس ہوتا؟

اس ضمن میں یہ امر ذہن نشین رہے کہ یہ نوٹ بک اقبال کی پرائیویٹ ڈائری نہ تھی اور نہ ہی یہ آراء کسی طرح کے "اعترافات" ہیں۔ اس لئے ان میں ظہور پذیر ہونے والی سوچ خالص اعترافات کے برعکس ارتفاع یافتہ ہے اور اسی انداز سے اس کا مطالعہ سُود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک بابت اور ——— اقبال کی غیر مطبوعہ تحریر ہونے کی بنا پر تو اس نوٹ بک کی قدر ہمیشہ ہی رہے گی۔ لیکن ۱۹۱۰ء میں لکھے جانے کی وجہ سے

اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس ضمن میں جاوید اقبال کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے:۔

"یوں محسوس ہوتا ہے گویا اپنے ماحول کی پیدا کردہ پژمردگی اور نامحرمی کے باعث اُس سال تخلیقی کارکردگی رُکی رُکی سی رہی۔ اس کا امکان ہے کہ عدم شعر گوئی کی بنا پر وہ ان نوٹس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس لئے یہ نوٹ بک ۱۹۱۰ء کی اہم کارگذاری قرار دی جاسکتی ہے"۔

——— عطیہ بیگم نے اپنی ڈائری میں اقبال سے ملاقاتوں کی جو دلچسپ تفصیلات بیان کی ہیں اُن میں بعض ایسے اشارے بھی ہیں جن سے اقبال فہمی میں بھی خاصی مدد لی جاسکتی ہے۔ مثلاً ڈائری کی رُو سے اقبال سے پہلی ملاقات لندن میں یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو ہوئی تھی۔ اسکا احوال یوں قلمبند کیا گیا ہے:

"آج مس بیگ نے مجھے خاص طور سے یہ کہہ کر مدعو کیا کہ ایک ہوشمند پروفیسر جن کا نام اقبال ہے آپ سے ملنے کی غرض سے کیمبرج آرہے ہیں۔ میں گئی اور اقبال تشریف لاتے۔ میں نے اُنہیں بہت ہی فاضل شخص پایا۔ عربی، فارسی، سنسکرت سب بخوبی جانتے ہیں بہت ہی ظریف اور باتونی واقع ہوئے ہیں . . . . میں نے پوچھا "آپ کس غرض سے لندن آئے ہیں"۔ کہا کہ "فلسفے کا مجھے زیادہ شوق ہے۔ یورپ میں جو کچھ میسّر ہے اُسے حاصل کرونگا۔ جرمنی اور فرانس بھی جاؤنگا۔ وہاں بہت کچھ ہے جو یہاں پر نہیں ہے" حافظ کے زیادہ شائق معلوم ہوتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ حافظ کے حافظ تھے۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ "جب حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں اُس وقت اُن کی سپرٹ مجھ میں آجاتی ہے اور میں خود تھوڑی دیر کے لئے حافظ بن جاتا ہوں"۔ (ص ۹۷-۹۸)

اس ڈائری کی یہ خصوصیت تو خیر واضح ہی ہے کہ اس میں اقبال کے بارے میں نجی قسم کی ایسی یادداشتیں اور واقعات محفوظ ہیں جن کی روشنی میں اقبال کی نظر افروز شخصیت کی نہایت ہی دلکش جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ایک خصوصیت اس کے علاوہ ہے اور وہ یہ کہ

عطیہ بیگم اپنے تیز مشاہدہ کی بنا پر پہلی ہی ملاقات میں ملنے والے کی شخصیت کے اہم رجحانات دریافت کر سکتی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی ملاقات میں انہوں نے اقبال کی شخصیت کے ان تین پہلوؤں کو اہم ترین سمجھتے ہوئے بطورِ خاص اُن کے تذکرے کی ضرورت سمجھی:

۱۔ علمی فضیلت ۲۔ ظرافت اور ۳۔ حافظؔ کا حافظ ہونا۔

علمی فضیلت میں تو خیر شک کی گنجائش نہیں۔ اقبالؔ کی ظرافت اس لئے قابلِ لحاظ ہے کہ جو شخص ۱۹۰۷ء میں "بہت ہی ظریف اور باتونی" تھا وہ ۱۹۰۹ء میں شراب نوشی سے خود کشی کرنے کی سوچ رہا تھا۔ باقی رہا "حافظ کا حافظ ہونا" تو نفسیاتی لحاظ سے یہ بہت اہم نکتہ ہے کیونکہ بعد میں اقبالؒ نے حافظ پر دل کھول کر تنقید کی۔ اتنی کہ قوم کی ناراضگی کی بنا پر "اسرارِ خودی" کے دوسرے ایڈیشن سے حافظ کے بارے میں اشعار حذف کرنے پڑے لیکن خطوط میں کسی کا ڈر نہ تھا۔ سو اقبالؔ نے ایک سو سے زائد خطوط میں حافظ پر کڑی تنقید کی۔ لیکن یہ ۱۹۱۰ء کے بعد کی بات ہوگی کیونکہ اپنی نوٹ بک میں حافظ کے بارے میں یوں لکھا:

"حافظؔ نے ترشے ہوئے نگینوں ایسے الفاظ میں بلبل کی شیریں لاشعوری روحانیت پیش کی"

لیکن بعد میں بلبل اور اس کی شیریں لاشعوری روحانیت سے کوئی دلچسپی نہ رہی کیونکہ تصوف کی بنا پر اقبالؔ نے حافظ پر شدید اعتراضات کئے۔ سراج الدین پال کے نام اپنے مکتوب (۱۴ر جولائی ۱۹۱۶ء) میں ایک انگریز مصنف کلارک کے حوالے سے یہ بھی لکھا "حافظ کے چچا سعدی (یہ شیخ سعدی نہیں ہیں) نے اس سے کہا کہ تمہارے کلام کے پڑھنے والوں پر دیوانگی اور لعنت ہوگی۔ یہ واقعہ لکھ کر حاشیے میں مصنف نوٹ دیتا ہے کہ قسطنطنیہ کے شیعوں کا اب تک یہ عقیدہ ہے کہ حافظ کا کلام پڑھنے والوں پر جنون کا مرض لاحق ہو جاتا ہے"۔[1]

۱۔ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطا اللہ ص ۳۹

اس کے برعکس اسی اقبال کا لندن میں یہ عالم تھا کہ بقول عطیہ بیگم فلسفے پر ایک بحث کے دوران اقبال "بیچ بیچ میں تقابل کی غرض سے حافظ کی طرف اشارہ کرتے رہتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اقبال پر فارسی کے کسی دوسرے شاعر کے مقابلے میں حافظ کا رنگ زیادہ چڑھا ہوا ہے اس لئے کہ وہ کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے جس میں وہ اُن کے خیالات کو پیش کر کے دوسرے فلسفیوں کے ساتھ اُن کا مقابلہ نہ کرتے ہوں"۔ (صہ ۲۸)

——— یہ تضاد کیوں ؟

اقبال اُن شاعروں میں سے ہے جن کا فکر و شعور ہمیشہ ارتقا پذیر رہا۔ اسی لئے بعض نظریات و تصورات کے ضمن میں اقبال کے ہاں فکری بُعد بھی ملتا ہے۔ جسے بعض ناقدین نے تضاد سے تعبیر کیا۔ اگر حافظ کوئی فلاسفر ہوتا اور اُس نے زندگی کے بارے میں ایک واضح قسم کا نظامِ فلسفہ ترتیب دیا ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ اقبال ایک وقت میں اُس کے فلسفے سے متاثر رہے، اور بعد میں نہ رہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ دراصل حافظ سے اقبال کا تعلق فکری نہیں بلکہ جذباتی تھا۔ بلکہ اُس کا یہ کہنا "میں جب حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں اُس وقت اُن کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت شاعر کی شخصیت میں گُم ہو جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں"۔ (اقبال از عطیہ بیگم صہ ۲۷)

بھی اس امر کا غماز ہے کہ اقبال نے حافظ سے اپنی "تطبیق" (Identi fication) کر لی تھی۔ لیکن اقبال ایسے فن کار کے لئے تطبیق ناول کے ہیرو کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کر کے ——— VicARIOUS مسرت یا اندوہ کے حصول کا معاملہ نہ تھا۔ اس لئے جب وہ اس مقصد کیلئے حافظ کا انتخاب کرتا ہے تو حافظ کی شاعری کے نمایاں ترین پہلو ——— رندی و سرمستی اور اُسکی شخصیت کی اہم ترین خصوصیت ——— آزادی و قلندری ——— کو اساس بنا کر ہی اقبال کی تطبیق اور اُس کے نفسی مضمرات سمجھے جا سکتے ہیں۔

پنجاب کے گھٹن والے ماحول سے نکل کر جب اقبال یورپ جاتا ہے تو یہ محض دو

ممالک کے جغرافیے کا فرق نہ تھا بلکہ دو تہذیبوں، اندازِ زیست اور روایات و مسلمات کا ٹکراؤ بھی تھا۔ اقبال کی ذہانت اور جمالیاتی حس کی تسکین کے لئے عطیہ بیگم کے علاوہ اُسکی جرمن معلّمات فراؤ ویگے ناست[1] اور فراؤ سینے شال بھی تھیں۔ اس ضمن میں بنیادی اہمیت کا یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ مردوں کی اکثریت کے لئے عورت کی ذہنی مطابقت اساسی اہمیت نہیں رکھتی بلکہ وہ جلد سے جلد جسمانی قربت کے مراحل طے کر کے آسودگی کے خواہاں ہوتے ہیں یہ عام مردوں کی بات ہے لیکن اقبال ایسے فلسفی مرد کا معاملہ اتنا سیدھا اور اقبال ایسے شاعر کا عورت کے بارے میں رویّہ اتنا دوٹوک نہیں ہو سکتا۔ عورت سے ذہنی مطابقت جس نفسی آسودگی کو جنم دیتی ہے اور اُس کے مثبت اثرات جس طرح شخصیت کو متاثر کرتے ہیں جسمانی قربت اور اُسکی عارضی تسکین اُس کے سامنے ہیچ ہے۔ ان معلّمات بلکہ خود عطیہ بیگم کے بارے میں بھی اقبال کا رویّہ ذہنی رفاقت سے حصولِ تسکین کا معلوم ہوتا ہے۔ اِس تسکین کو سہ آتشہ کرنے کے لئے کیا حافظ کا کلام واقعی شراب کا کام نہ کر سکتا تھا۔ عدمِ وصل سے شخصیت میں ایک لطیف اضطراب اور پُر کیف بے کلی سی پیدا ہوتی ہے تو کیا ایسے میں ـــــ ملنے اور نہ ملنے ـــــ کے درمیانی فاصلے کو حافظ سے کام گار نہ بنایا جا سکتا تھا۔ جو شخص شعوری طور پہ رندی و سرمستی سے احتراز کر رہا ہو تو کیا اُس کے لئے حافظ کی رندی و سرمستی ذہنی ترنگ کا باعث نہیں بن سکتی؟ الغرض حافظ ممنوعہ لذات کی علامت بنا تو عدمِ تسکین کے خلجان سے چھٹکارے کا ذریعہ۔ اس سلسلے میں میں یہ اعتراف کرنے کی جرأت رکھتا ہوں کہ میرا استدلال ناقص اور اُس سے اخذ شدہ نتائج غلط بھی ہو سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس امر پہ زور دیئے بغیر نہ رہونگا کہ ہندوستان واپس آکر حافظ کی مخالفت اور اُس

۱۔ "دو تین ہفتے ہوئے میرے پاس آپ کی دوست لڑکی ویگے ناست کا خط آیا تھا میں اُس لڑکی کو بیحد پسند کرتا ہوں۔ وہ کس قدر اچھی اور سچی ہے" (اقبال اور عطیہ بیگم صـ ۵۳)

پر شدید قسم کے اعتراضات بظاہر فلسفیانہ نوعیت کے تھے اور مقصود قومی فلاح۔ لیکن اُس کے پیچھے کوئی مخصوص قسم کی نفسی واردات یقیناً ہو گی جو اقبال ۱۹۰۷ء میں اُسکی روح میں خودی کے حلول ہونے اور خود کو حافظ محسوس کرنے کا دعویٰ کرے وہی بعد میں اُسے مسلم قوم کے لئے مضرِ صحت سمجھے۔ یہ اتنا بڑا انقلاب محض خشک افکار سے وقوع پذیر نہ ہو سکتا تھا۔ اُس کے پیچھے آتش جذبات بھی تھی۔ اگر نفسیاتی لحاظ سے دیکھیں تو حافظ کی مخالفت ایک طرح کی Rationalization قرار دی جا سکتی ہے حافظ سے بعض خوشگوار یادیں وابستہ تھیں جن کے تلازمات اب باعثِ اذیت تھے۔ حافظ جس رِندی و سرمستی کی علامت تھا اقبال کے لئے وہ اب کابوس بن چکی تھی۔ حافظ جس خودفراموشی کا مظہر تھا وہ اب ناقابلِ برداشت تھی اور اسی لئے باطنی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے اقبال جب اپنے خلاف صف آرا ہوا تو اُس نے حافظ کو بھی اپنا حریف جانا۔

عطیہ بیگم کی ڈائری میں ۹ اپریل ۱۹۰۷ء کے مطابق اقبال نے اپنے بارے میں یہ کہا تھا: "میں دو شخصیتوں کا مجموعہ ہوں، ظاہری شخصیت ہر اُس چیز کی قدردان ہے جس کی قدر کرنی چاہیئے اور جو کارآمد اور عملی ہے۔ دوسری اور باطنی شخصیت خواب دیکھنے والے فلاسفر اور صوفی کی سی ہے" (ص ۹۸)

لندن میں فلاسفر اور صوفی غالب تھا اور اقبال نے وہاں واقعی جاگتے میں بھی سپنے دیکھے جن میں سے ایک کو عطیہ بیگم نے ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔ "ہائیڈل برگ۔ ۲۲ اگست ۱۹۰۷ء آج علی الصبح ہم سب تیار ہو کر جمع ہوئے دیکھا تو اقبال ندارد ہیں۔ سب اِدھر اُدھر دیکھنے لگے گاڑی کا وقت ہوا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک خادمہ چلاتی ہوئی آئی اور کہا کہ معلوم نہیں ہیر پروفیسر کو کیا ہو گیا ہے۔ اُن کے کمرے میں گئے دُور سے دیکھا کہ بتی جل رہی ہے اور اقبال ایک ہاتھ سر پر رکھے ہوئے بیٹھے ہیں۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور دو چار کھلی ہوئی کتابیں میز پر پڑی ہیں جب زور زور سے اُنہیں پکارا تو بھی جواب ندارد۔ آگے بڑھنے کی کسی میں ہمت نہ ہوئی۔ فراہیرن

نے آخند کار مجھ سے کہا کہ آپ ہی اندر جا سکتی ہیں۔ خیر میں آہستہ آہستہ گئی، پکارا۔ جواب ندارد زور سے آواز دی پھر صدائے بر نخواست۔ غور سے دیکھا تو سانس چل رہا تھا مگر خلا میں کچھ دیکھ رہے تھے۔ خیر میں نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں جھنجھوڑا اور اقبال اقبال کہہ کر پکارا تو تھوڑی دیر کے بعد وہ ہوش میں آئے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہاں ہیں۔ پھر کچھ یاد کر کے کہا کہ "میں عالمِ بالا میں چلا گیا تھا ..." میں نے اقبال سے کہا "یہ کیا شعبدہ بازی تھی؟" انہوں نے جواب دیا "میں فلاں فلاں کتابیں رات کو پڑھ رہا تھا۔ اِتنے میں خیال میرے جسم سے الگ ہو گیا اور میں عالمِ بالا میں چلا گیا اور وہاں پہنچ کر بھی میری حالت پریشان تھی کہ اتنے میں آپ نے مجھے نیند سے جگا دیا۔" میں چُپ چاپ سُنتی رہی اور وہ رفتہ رفتہ اپنی اصلی حالت پر آ گئے۔" (ص ۱۰۹-۱۱۰)

یہ ہے خواب دیکھنے والا اقبال۔

لیکن یہ خواب یورپ کی فضاؤں میں مُنتشر ہو کر رہ گئے۔ البتہ شدید استغراق تخلیقی عمل کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا اور شعر گوئی کی کیفیات پر منتج ہوا۔

ہندوستان واپس آکر شادی سے وابستہ بے کیفی معاشی اُلجھنوں اور پختہ سے پختہ تر ہوتے ہوئے قومی شعور نے اقبال کو پھر خواب دیکھنے کی مہلت نہ دی اور یوں رفتہ رفتہ اُسکی شخصیت کا دُوسرا رُخ یعنی عملی پہلو نمایاں سے نمایاں تر ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ اُس نے بیمار قوم کو مصافِ زلیست میں سیرتِ فولاد پیدا کرنے کی راہیں سُجھانی شروع کیں۔ اب ظاہر ہے کہ اُسکی شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں کی کشاکش میں حافظ سے والہانہ شیفتگی کی گنجائش نہ نکل سکتی تھی۔ اس لئے اس سارے قضیے میں حافظ بے چارا مُفت میں "ویلن" بن گیا:

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار

رہنِ ساقی خرقۂ پرہیز او مے علاجِ ہولِ رستا خیز او

نیست غیر از بادہ در بازار او — از دو جام آشفتہ شد دستار او

گوسفند است و نوا آموخت است — عشوۂ ناز و ادا آموخت است

ضعف را نامِ توانائی دہد — سازِ او اقوام را اغوا کند[1]

"پرائیویٹ"

؎ عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہیئے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

بمبئی، ۱۰ستمبر ۱۹۳۱ء — محمد اقبال"[2]

اقبال نے یہ معنی خیز شعر اُس وقت لکھا جب لندن اور ہائیڈل برگ میں عطیہ بیگم کے ساتھ گذرے لمحات کو تقریباً ربع صدی بیت چکی تھی وہ لمحات کیسے تھے؟ اُن کی شاہد عطیہ بیگم کی ڈائری ہے۔ وہ لمحات کس حد تک دُور رس ثابت ہوئے اس کا اندازہ عطیہ کے نام اقبال کے مکاتیب سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن درحقیقت تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس ضمن میں صرف قیاسات سے ہی کام لیا جا سکتا ہے لیکن ایسے معاملات میں قیاسات بعض اوقات تارِ عنکبوت سے بھی نازک ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً اس سلسلے میں ایک بُنیادی سوال کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ کیا اقبالؔ عطیہؔ سے شادی کے خواہاں تھے؟ لیکن اس کا جواب واضح نہیں ہے۔ چنانچہ پروفیسر محمد عثمان نے عطیہؔ کے نام لکھے گئے خطوط کی بنا پر "حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور" میں (ص ۸۹) عطیہؔ کا نام لئے بغیر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اقبالؔ عطیہؔ سے شادی کے خواہاں تھے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اقبالؔ کے رشتے دار خالد نظیر صُوفی نے اسکی جذباتی انداز میں تردید کی ہے:

۱۔ "اسرارِ خودی" کی دُوسری اشاعت میں یہ اشعار حذف کر دیئے گئے تھے۔

۲۔ اقبالؔ، از عطیہ بیگم (ص ۸۴)

"یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ علّامہ اقبال عطیہ بیگم کو ایک علمی دوست کی حیثیت سے تو پسند کر سکتے تھے لیکن بیوی کے رُوپ میں وہ اُن کے لئے ناقابلِ قبول تھیں، کیونکہ وہ جس قسم کی بیوی کے خواہشمند تھے وہ عطیہ بیگم سے مُختلف تھی۔ عطیہ بیگم نے خود اور نواب آف جنجیرہ نے علامہ اقبال کو یُورپ سے واپسی کے فوراً بعد جنجیرہ آنے کی متعدّد دعوتیں دیں لیکن اُنھوں نے ہر بار مصرُوفیت کا عُذر کر دیا، آخر کیوں؟ صاف ظاہر ہے کہ اقبال عطیہ کی دیرینہ خواہش (شادی) کو پُورا کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔" لہ

خالد نظیر صُوفی کا ان امُور میں انداز دفاعی ہے اس لئے اُسے استدلال نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ عطیہ بیگم کے نام لکھے گئے مکاتیب میں اقبال کی شخصیت کا ایک نیا اور انوکھا رُوپ نظر آتا ہے۔ اس میں اچنبھا تو نہ ہونا چاہیئے کہ اقبال بھی انسان تھا۔ لیکن قوم نے چُونکہ یہ فراموش کر دیا کہ اقبال اَور سب کچھ ہونے کے علاوہ مرد بھی تھا اس لئے ان خطوط کی تیز جذباتیت اور یاس سے دھیمے دھیمے سُلگنے کی کیفیت متعجّب کرتی ہے۔ جس اقبال نے قوم کو یہ تلقین کی :

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمّت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمانِ خوش آہنگ
دُنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لئے تنگ
چیتے کا جگر چاہیئے، شاہیں کا تجسّس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ

ہمّتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبُول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تک

وہی اقبال ۱۹۰۹ء میں یہ سطریں لکھ رہا تھا :

"آج کل میں دوسروں سے زیادہ بات چیت نہیں کرتا۔ میری اپنی بدنصیب ذات مصیبت انگیز خیالات کی کھان بنی ہوئی ہے۔ جو سانپ کی طرح میری روح کے عمیق اور تاریک سوراخوں سے باہر نکلتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں سپیرا بن جاؤنگا اور بازاروں میں پھرتا پھرونگا اس طرح سے متجسس لڑکوں کی ایک جماعت میرے پیچھے ہوگی۔ یہ خیال نہ کیجئے گا کہ میں یاس پسند ہوں، میں آپ سے کہتا ہوں کہ تکلیف نہایت ہی لذیذ چیز ہے اور میں اپنی بدقسمتی سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور اُن لوگوں پر ہنستا ہوں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ خوش و خرم ہیں آپ دیکھتی ہیں کہ میں اپنی مسرت کس طرح چھپ چھپا کر حاصل کر لیتا ہوں"۔ (ص ۵۶)

یہ خود ترسی ہے۔ واضح اور دو ٹوک قسم کی۔ ایسی خود ترسی جس میں لذتِ آزار Masochins کی آمیزش بھی ہے۔

یورپ میں اقبال نے آزادی اور بے فکری کی جو زندگی بسر کی وہ اپنی جگہ پر بذاتِ خود ایک لذت رکھتی تھی۔ اُس پر مستزاد ہم ذوق اور ہم خیال خواتین کی صحبت۔ یورپ کی خنک آب و ہوا میں اقبال کا گرم پنجابی خون اور حسن کی رنگ افروز کیفیات کو جذب کرنے والی شاعرانہ آنکھ۔ عطیہ کی ڈائری کے بعض واقعات سے اقبال کی حسن پرستی کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ عطیہ نے ایک سے زائد مواقع پر اقبال کے باتونی ہونے اور بذلہ سنجی کی تعریف

ا۔ ہائیڈل برگ ۳ ستمبر ۱۹۰۷

اقبال کی ظرافت اور حاضر جوابی بے مثل ہے چونکہ کوئی بج ہے لہٰذا ہم سب کھڑے کھڑے بات چیت کر رہے تھے۔ فرالائن ویگے ناسٹ، سینے شل اور کاڈسینا میرے گرد و پیش تھیں اور اقبال سامنے کھڑے ٹکٹکی لگائے بت بنے دیکھ رہے تھے۔ اس پر فرا پروفیسر شیرر نے کہا کہ اقبال کیا دیکھ رہے ہو تم مبہوت سے نظر آتے ہو۔ اقبال نے برجستہ جواب دیا میں یکایک ہیئت دان کی صورت میں تبدیل ہو گیا ہوں۔ میں ستاروں کے اس جھرمٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں" (ص ۱۱۹-۲۰)

کی ہے وہی اقبال یاس پرست کیوں بنا ؟

اسکی بُنیادی وجہ اُس جذباتی گھٹن میں تلاش کی جاسکتی ہے جو بالعموم اس انداز کی زندگی بسر کرنے کے بعد حقائق کو مزید تلخ بنانے کا باعث بنتی ہے اس سے قبل پہلی شادی کی ناپسندیدگی کے شواہد نہیں ملتے۔ لیکن یورپ سے واپسی کے بعد بیوی تمام گذشتہ صحبتوں سے محرومی اور بیتے لمحات کی پژمُردگی کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے لئے کچھ معاشی پریشانیاں بھی ہونگی لیکن مرد ایسی پریشانیوں سے عہدہ برا ہو جاتے ہیں۔ البتہ جذباتی اُلجھنیں زیادہ تکلیف دہ ہوا کرتی ہیں اور اُن سب کا ہدف بیوی بنی، چنانچہ ۱۹۱۱ء تک یہی عالم تھا۔ "میری بدقسمتی ایک وفادار کُتے کی طرح میرا پیچھا کر رہی ہے اور میں نے اُس خاتون کو پسند کرنا سیکھ لیا ہے بہ سبب اسکی نہ تھکنے والی وفاداری کے جو اُسے اپنے بدنصیب اور ناشاد بادشاہ سے تھی" (ص۵۲)

سوال یہ ہے کہ اقبال اس حالت کو کیوں پہنچا ؟

ابتدا میں مندرج خط میں جس یاسیت اور آزار پسندی کا تذکرہ کیا گیا۔ وہ کیفیت اقبال کے لئے عارضی نہ تھی۔ عطیہ کے نام خطوط سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دو تین سال تک تو اقبال اسی پژمُردگی کے عالم میں رہا۔ جذباتی ناآسُودگی کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان ذات کے خول میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں اقبال کی تخلیقی صلاحیتیں کُند ہو رہی تھیں جسکا اعتراف خُود اقبال نے بھی کیا ہے :

"میرے دل میں اب شاعری کا کوئی ولولہ باقی نہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے میری شاعری کی خوبصورت دیوی کو قتل کر دیا ہے اور مجھ سے میرا سارا تخیل چھین کر مجھے ٹنڈ منڈ بنا دیا ہے"۔ (ص ۷۳)

"شاعری کے متعلق میں اپنے دل میں کسی قسم کا ولولہ محسوس نہیں کرتا۔ اور آپ ہی اس کی ذمہ دار ہیں۔" (ص ۶۹)

ب ـــــ یہ دونوں اقتباسات ۱۹۱۰ء کے ایک ہی مکتوب سے ہیں ۔

جذبات کے بھنور میں گھرا اور ذات کے حصار میں بند اقبال جس اندرونی آگ میں جل رہا تھا اُسکی بنا پر وہ، وہ کچھ لکھنے پر قادر نہ رہا جو وہ اب تک لکھتا رہا تھا یا زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ لکھنا چاہتا تھا۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ اس دور میں عام جذبات پسند شعراء یا رُومانی شاعروں کی مانند اقبال نے بھی ذاتی جذبات کی آسودگی کے لئے شاعری کو استعمال کرتے ہوئے "پرائیویٹ" قسم کی نظمیں تحریر کیں۔ یہ نظمیں کس حد تک پرائیویٹ تھیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس عہد کا بہت سا کلام تلف کر دیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں اقبال نے لکھا "گذشتہ پانچ چھ سال کے دوران میں میری نظمیں زیادہ تر پرائیویٹ نوعیت کی رہی ہیں اور میرا خیال ہے کہ پبلک کو ان کے پڑھنے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ ان میں سے بعض کو تو میں نے کُلیتاً تلف کر دیا ہے ۔ اس ڈر سے کہیں کوئی اُنہیں چرا کر نہ لے جائے اور شائع نہ کر دے" (ص ۷۹)

ـــــ لیکن جب خود اقبال اس دور سے گذر گیا اور اپنے جذبات کا "ترفع" کر لیا تو ہمعصر ادبیات پر یوں تنقید کی ہے

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیّل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں رُوح کے خوابیدہ بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اس سے بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کیا اقبال کے اعصاب پر کوئی عورت سوار تھی؟ اس کا جواب واضح ہے بھی اور نہیں بھی۔ اقبال کی شاعری قومی اور ملی موضوعات کے

لحاظ سے بنجر نظر آتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنے افکار کی دُنیا سے عورت کو جلا وطن کر دیا کہ سانپ اور ترغیب کا قصہ ہی ختم ہو جاتے۔ شاید اس لئے اقبال کے ہاں خالص عورت نظر نہیں آتی۔ بلکہ اگر کہیں عورت کا ذکر کیا بھی تو تمسخر اُڑانے کے انداز میں ڈاکٹر محمد اجمل نے بھی عورت کے سلسلے میں یہی کچھ محسوس کیا۔ چنانچہ وہ مقالہ" اقبال کے ہاں خدا کا تصور" میں یوں رقمطراز ہیں۔" عورت کافی حد تک اُن کے کلام میں مفقود ہے جہاں کہیں اتفاقاً موجود ہے وہ مرد کی روحانی تربیت کا فقط ایک ذریعہ ہے اور کچھ نہیں۔

؎ تو می دانی کہ سوزِ قرأت تو   دگرگوں کرد تقدیر اُمم را

گویا اقبال کے جذباتی کلام میں بھی عورت مرد کی رُوحانی ممکنات کی تکمیل کا فقط ایک وسیلہ ہے۔ عورت اپنی حیا۔ وفا۔ حجاب اور عبادت کی بدولت شاہیں صفت مرد کے بے پناہ تجسس میں اُس کا ہاتھ بٹا سکتی ہے، جس طرح ٹینس کھیلتے ہوئے کوئی کھلاڑی کو گیند پکڑاتا ہے۔ وہ بذاتِ خود اس تجسس میں شریک نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اُس کی اہل نہیں عورت کا یہ تصور انفرادیت کے تصور سے ایسا دُور ہے کہ ہم عورت اور انفرادیت دو متناقض تصورات کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ عورت ایسی ہے جو پارسائی کی سند تو حاصل کر سکتی ہے۔ جذبات کو آگ نہیں لگا سکتی۔ وہ جوش اور تندی جو اقبال کے جذبات میں موجود ہے۔ وہ اس قسم کی عورت پیدا ہی نہیں کر سکتی۔ اس میں نہ دلبری ہے نہ دلِ رُبائی نہ حرص و ہوس نہ رنگ و بُو نہ رقص و رامش۔ یُونان کی دیویوں سے منسوب کرتے ہیں اور جو مردوں کے دلوں کو پامال کرتے تھے۔ یعنی اقبال کے ہاں آدم تو ہے لیکن حوا نہیں جو سانپ کے فریب میں آکر لغزش کرتی ہے۔ شجرِ ممنوعہ چکھتی ہے، آدم کو چکھواتی ہے اور آدم کی پُرسکون زندگی میں گناہ و ثواب کا ایسا ہیجان پیدا کرتی ہے کہ وہ بے چارا جنت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے اس کیفیت سے جُدا گانہ نتیجہ برآمد کیا۔ جبکہ میری ذاتی رائے یہ

ہے کہ اقبال آدم کے رُوپ میں تو پہلے ہی جنّت سے محروم ہوچکا تھا۔ وہ جنّت سے شجرِ ممنوعہ کی بنا پر نہ نکلا تھا بلکہ حوّا سے محرومی کو اُس کا المیہ قرار دیا جاسکتا ہے اور عطیہؔ کے نام خطوط میں فردوسِ گمشُدہ کو گذشتہ ایام کی یاد میں تلاش کرنے کی کاوش بھی ہے۔

۱۔ "اُن دنوں کی یاد دِلا دُونگا جب کہ آپ جرمنی میں تھیں ـــــ آہ وہ دن جو پھر کبھی نہ آئیں گے"۔ (ص ۵۶)

۲۔ اُن دنوں کی خاطر جب آپ مجھ پر اسقدر اعتماد کرتی تھیں اور میرا لحاظ کرتی تھیں" (ص ۱۷)

۳۔ اُن دنوں کی یاد میں ـــــ دِن جو فطرت میں مُردہ ہوچکے ہیں، لیکن میرے دِل کی دُنیا میں زندہ ہیں"۔ (ص ۲۷)

ـــــ دل کی دُنیا میں اور کیا کچھ زندہ رہا؟

اس کا بھی کسی حد تک ان خطوط میں مُنتشر کیفیات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کیونکہ خُود اقبال نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔

"آپ لکھتی ہیں کہ آپ مجھ سے بہت سے سوالات پُوچھنا چاہتی ہیں تو پھر آپ پُوچھتی کیوں نہیں اور آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپایا کرتا اور میرا اعتقاد ہے کہ ایسا کرنا گُناہ ہے"۔ (ص ۵۵)

عطیہؔ بیگم کے نام ان خطوط کا مطالعہ دو جہات پر کیا جا سکتا ہے ایک تو یہ کہ ان سے اقبال اور عطیہ بیگم کے تعلقات کی نوعیت کا کسی نہ کسی حد تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور دُوسرے خُود اقبال نے اپنے ذاتی میلانات اور شخصیت کے بعض رجحانات پر بھی لکھا۔

خُود عطیہ بیگم کے بارے میں لکھتے وقت تو شعاعِ ستر حجابات میں سے گذرتی محسوس ہوتی ہے اور اُسکی وجہ بھی اقبال نے بیان کر دی ہے۔

"آپ آگاہ نہیں ہیں کہ آپ نے میرے ساتھ کیا بھلائی کی ہے۔ یہ سچ بھی ہے اور اس لئے بہتر بھی ہے۔ آپ خود بھی اس سے آگاہ نہیں ہو سکتیں۔ میں اس سے آگاہ ہوں لیکن اسے بیان نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس موضوع کو جانے دیجئے۔ میرے لئے کسی ایسی چیز کو بیان کرنا بے کار سا ہو گا جو ناقابلِ بیان ہے۔" (ص ۵۹)

حالانکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اقبال عطیہ سے دُکھ سُکھ کہے بغیر نہ رہ سکتا تھا جیسا کہ اس خط میں لکھا: "مجھے ڈر ہے کہ میں وہ باتیں لکھ رہا ہوں جو صرف گفتگو کے لئے محفوظ رہنی چاہیئے تھیں۔ میں اس کے متعلق اور کچھ نہیں لکھونگا اس لئے کہ مجھے ترغیب ملتی ہے کہ میں اپنے دل کی ساری باتیں کہہ ڈالوں۔ اور بہت سی دوسری باتیں بھی کہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اسی نوعیت کی ہوں جنہیں میں کاغذ پر لانا نہیں چاہتا۔" (ص ۷۱)

لیکن جب اقبال اپنے بارے میں لکھتا تو کیونکہ ناگفتنی کے گفتنی بننے کا خدشہ نہ تھا بلکہ بعض اوقات تو یہ احساس ہوتا ہے گویا یہ سب کچھ عطیہ ہی کو خود سے متعارف کرانے کے لئے لکھا جا رہا تھا۔ چنانچہ ایک موقعے پر اقبال نے یوں لکھا۔" میں اس خیال سے کانپ اُٹھتا ہوں کہ آپ میری فطرت سے ناواقف ہیں۔ کاش میں اپنے دل کو اندر سے دکھا سکتا تاکہ آپ بہتر طریقے سے میری رُوح کا مشاہدہ کر سکتیں" (ص ۶۷)

اسی لئے اقبال بے تکلفی سے لکھتا ہے اور پھر اپنے بارے میں ایک مخصوص انداز کے اظہار اور اپنے غموں اور دُکھوں پر ایک خاص زاویے سے روشنی ڈالنے میں جہاں خود آسودگی تھی وہاں مخاطب سے داد طلبی اور اس سے وابستہ نفسی محرکات کو کُلیتہً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کے ایک خط میں یہ معنی خیز فقرات توجہ طلب ہیں۔

"گذشتہ رات میں بہشت میں جا پہنچا اور دوزخ کے دروازوں میں سے گذرنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے اس جگہ کو خوفناک طریقے پر سرد پایا۔ جب فرشتوں نے مجھے متعجب دیکھا تو اُنہوں نے کہا کہ یہ جگہ اپنی فطرت کے اعتبار سے سرد ہے لیکن وہ شدت سے گرم ہو جاتی

ہے اس لئے کہ ہر ایک شخص اپنے انگارے اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس مُلک میں جہاں کوئلے کی کانیں بہت زیادہ ہیں جتنے انگارے جمع کرنے ممکن ہیں مَیں اُن کے جمع کرنے کی تیاری میں مصروف ہوں۔" (ص ۵۵)

ان پریشان حالات میں کہ وہ شراب کو ذریعۂ خودکشی بنانے کی سوچ رہا تھا۔ انگارے جمع کرنا خاصا معنی خیز ہے۔ ؎۱

اقبال نے ان خطوط میں اپنی ذات کے بارے میں جن امور پر بطورِ خاص زور دیا ان میں ریاکاری سرِ فہرست ہے، بقولِ اقبال:

"میں سیدھی سادی دیانت دارانہ زندگی بسر کرتا ہوں میرا دل اور میری زبان ایک دوسرے کے ساتھ کُلیتاً ہم نوا ہیں لوگ ریاکاری کا احترام کرتے ہیں اور اس کی تعریف بھی! اگر ریاکاری سے مجھے شہرت، احترام اور تعریف حاصل ہوتی ہے تو میں اسے پسند کروں گا کہ میں ایسی حالت میں مر جاؤں جب کہ مجھے جاننے والا اور میرا ماتم کرنیوالا کوئی بھی نہ ہو" (ص ۶۱)

"مجھے بے پروا یا ریاکار نہ کہیئے۔ کتا بتاً بھی نہیں! اس لئے کہ اس سے میری روح کو تکلیف پہنچتی ہے"۔ (ص ۶۷)

"مجھ میں خامیاں ضرور ہیں لیکن ریاکاری اور بے اعتنائی مجھ میں نہیں ہے" (ص ۶۶)

اقبال نے دو مقامات پر اپنی شخصیت کے بارے میں جو لکھا وہ متناقض معلوم ہوتا ہے اور اگر ایسا نہیں تو بین السطور کچھ اور بھی کہا گیا ہے:

۱۔ معلوم ہوتا ہے اقبال کو دوزخ کا یہ تصور بہت بھایا کیونکہ بعد میں اسے منظوم بھی کیا۔ یہ نظم "سیرِ فلک" کے عنوان سے "بانگِ درا" میں شامل ہے:

یہ مقام خنک جہنم ہے	نار سے نُور سے تہی آغوش
شعلے ہوتے ہیں مستعار اس کے	جن سے لرزاں ہیں مردِ عبرت کوش
اہلِ دُنیا یہاں جو آتے ہیں	اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

Anjuman Taraqqi Urdu Hind

"بلاشبہ ہر ایک شخص آرام کی جگہ کا صبر کے ساتھ انتظار کر رہا ہے، میں تو خود اس جگہ جانے کے لئے بے تاب ہوں اس لئے کہ میں اپنے خالق سے ملنا چاہتا ہوں اور اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے میری قلبی کیفیت کی معقول تشریح بتائے۔ اور میرا خیال ہے اس کے لئے ایسا کرنا آسان نہ ہوگا میں خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکا آپ کو اس کی شکایت نہ کرنی چاہیئے۔ کئی سال ہوئے میں نے یہ شعر کہا تھا:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے (ص ۶۱)

لیکن اس کے بعد ایک اور خط میں یوں لکھا:

"شاید آپ یہ کہنا چاہیں کہ میں (خود اپنے لئے بھی) ایک راز ہوں لیکن یہ "راز" ایسا ہے جس کا علم سب کو ہے:

وہ راز ہوں کہ زمانہ پر آشکار ہوں میں (ص: ۶۶)

—— یہ "راز" زمانہ پر آشکار تھا یا نہیں تھا اس کے بارے میں تو کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن خطوط سے یہ واضح ہے کہ اقبال نے عطیہ کو کیا درجہ دے رکھا تھا:

"آپ کہتی ہیں کہ میرے دل میں آپ کی خواہشات کا احترام نہیں ہے بلاشبہ یہ چیز عجیب و غریب ہے اس لئے کہ ہمیشہ سے میری یہ عادت رہی ہے کہ میں آپ کی خواہشات

۱۔ ۲۰ مئی ۱۹۳۷ء تک اقبال کے خیالات اسی نہج پر تھے:

"حقیقت یہ ہے کہ یہ دُنیا عجیب قسم کی فرضی کامیڈی کا ٹریجیڈی پر مبنی انجام ہے جس ڈرامہ کی ایکٹنگ ہم آپ جیسے انسان انجام دے رہے ہیں اس کے ڈائریکٹر کی انسان نوازی پر فخر کرنا چاہیئے کہ اس نے اپنے ڈرامے کی شوٹنگ کے لئے انسان کو تخلیق فرمایا۔"

(مکتوب بنام ڈاکٹر محمد عباس علی خان "اقبالنامہ" ص: ۲۹۷)

کا مطالعہ کروں اور آپ کو ہر ممکن طریقہ سے خوش کروں ... میں ہر وہ کام کرنے کے لئے تیار ہوں جس سے آپ خوش ہوں۔ دُنیا میری پرستش نہیں کر سکتی نہ میں یہ خواہش رکھتا ہوں کہ میری پرستش کی جائے اس لئے کہ میری فطرت ہی ایسی ہے کہ میں پرستش کا موضوع نہیں بن سکتا۔ میرے رگ و ریشے میں تو پرستش کرنے والے کا فطری رجحان اسقدر گہرے طریقے سے پیوست ہو چکا ہے۔" (ص: ۶۲، ۶۱)

یہ منہ بولتی سطریں آپ اپنی وضاحت ہیں۔

عطیہ نے جنجیرہ آنے کی دعوت دی تو سفر کی دِقتیں گنواتے ہوئے لکھا:

"... اور یہ حقیقی ہفت خواں ہیں جو مجھے رُستم کی شہرت دے دیں گے اگر میں ان کو عبور کر لوں گا۔ رُستم کا انعام بہت بڑا تھا اور مجھے یقینی طور پر معلوم نہیں کہ میرا انعام کیا ہو گا؟" (ص: ۵۹)

یہ انعام کیا ہو سکتا تھا —؟ سوال اہم بھی ہے اور خطرناک بھی!

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

خالد نظیر صوفی

بے داغ ہے مانندِ سحر اُس کی جوانی

کسی ادب کی جو قسمت بگڑتی ہے اقبالؒ
تو پہلے ہوتے ہیں نادان نکتہ چیں پیدا

تنقید اگر کسی فن پارے کے تجزیے یا کسی شخصیت کو سمجھنے کے لئے اس کے مختلف پہلوؤں کی پُرخلوص تفہیم تک محدود رہے تو قابلِ اعتراض نہیں، لیکن جہاں نقاد ذاتی تعصبات کے باعث محض دُوسروں پر کیچڑ اُچھالنے یا اپنی شخصیت کی نُمائش کے لئے کسی فن پارے میں صرف بُرائیاں تلاش کرنے کا عمل اپناتا ہے، وہاں تنقید اپنے منصب سے گر جاتی ہے ایسے نقادوں سے حکیم الاُمت علامہ اقبالؒ کی شخصیت بھی محفوظ نہیں رہی۔

حکیم الاُمتؒ کی عظمت اور شہرت سے کون آگاہ نہیں، حضرت علامہ کی زندگی میں بھی ان پر کئی دفعہ غلط الزامات[1] تراشے گئے لیکن اُنہوں نے کبھی انہیں درخورِ اعتنا نہ جانا اور وہ الزامات اپنے خالقوں سمیت اپنی موت آپ مرگئے۔ آج بھی ان لوگوں کی کمی نہیں جو شاعرِ مشرق کی شرافت اور نیک طبیعت کی قسم کھاتے ہیں۔ لیکن اب چونکہ ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو نکتہ چینوں کی وضع کردہ باتوں کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اسلئے

---

[1] لیکن اُن کے اخلاق کو کبھی ہدفِ تنقید بنانے کی کسی کو بھی جرأت نہ ہوئی۔ (مصنف)

ان غلط اندیشوں کا میٹھا زہر بڑی خاموشی سے ناپختہ ذہنوں میں سرایت کرتا جا رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج اقبالؒ کے کلام پر اتنی توجہ نہیں دی جاتی جتنے ان نقادوں کے مفروضے پسند کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اس صورتِ حال پر بہت خوش ہیں کہ علامہ اقبالؒ کو شرابی، رنگ رلیاں منانے والا اور قیامِ یورپ میں معاشقے لڑانے والا ثابت کیا جا رہا ہے مقامِ افسوس ہے کہ اس عظیم مفکر کو، جس نے اپنی ساری زندگی قوم کے لئے وقف کر دی قوم یہ انعام دے رہی ہے اور اس کے حیات افروز پیغام سے فیض یاب ہونے کی بجائے اس کی ذات میں کیڑے نکالنے اور اسے عیاش تک ثابت کرنے میں خوشی ہی نہیں بلکہ فخر محسوس کر رہا ہے۔ پیشتر اس کے کہ حقائق کی روشنی میں علامہ اقبالؒ پر عائد کردہ ان الزامات کو باطل ثابت کیا جائے، مناسب ہو گا کہ ایک نظر اس ماحول پر ڈال لی جائے جس میں شاعرِ مشرق نے پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے ایک انتہائی دین دار اور باشرع گھرانے میں جنم لیا، جس میں نیکی، پارسائی، عفت اور پاکیزگی کی بلند قدریں تھیں۔ ان کے والد گرامی صوفی منش اور بڑے متقی و پرہیزگار بزرگ اور ان کی والدہ ماجدہ پابند صوم و صلوٰۃ اور بڑی صالح خاتون تھیں۔ پاکباز و پرہیزگار والدین کے علاوہ اقبالؒ کو سب سے پہلے شمس العلماء سید میر حسن شاہ صاحب جیسے اعلیٰ صفات و ارفع عادات بزرگ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ ان تمام بزرگوں نے یقیناً علامہ اقبالؒ کو نیکی اور بدی کا فرق اور اچھے بُرے کی تمیز سب سے پہلے اور اچھی طرح ذہن نشین کرائی ہو گی اور انہیں کم از کم اسلام کے بنیادی اصولوں سے ضرور روشناس کرایا ہو گا۔ حلال و حرام کی تمیز اسلام کے بنیادی اصولوں کی بھی بنیاد مانی جاتی ہے تو کیا یہ مان لیا جائے کہ اقبالؒ تمام عمر اس بنیادی اور زریں اصول سے ناواقفیت کا شکار رہے؟ علامہ اقبالؒ کی زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے ہی شعائرِ اسلام سے انکی بے پناہ محبت اور خدا اور رسولِ مقبولؐ سے والہانہ عشق کا کافی اندازہ ہو جاتا ہے

لیکن اگر ذرا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ان کی تمام زندگی پر یہ محبت اور عشق حاوی نظر آتے ہیں۔ کیا یہ اُس ابتدائی تعلیم کا اثر نہیں تھا؟ یہ ایک فطری اصول ہے کہ جو بات اور عادت بچپن میں ذہن نشین اور پختہ ہو جائے وہ کبھی فراموش نہیں ہوتی۔ اس لئے جس شخص کو بچپن ہی میں انتہائی پاکیزہ ماحول اور نیکی سے بھرپور فضا میسّر آئی ہو اور انتہائی نیک اصحاب نے تربیت دی اور پروان چڑھایا ہو، اس سے شراب نوشی اور رنگ رلیاں منانے جیسی لغزشوں کی اُمید ناقابلِ یقین ہی نہیں بلکہ ناقابلِ فہم بھی ہے۔

میری والدہ محترمہ حلفیہ بیان فرماتی ہیں کہ "حضرت علامہ نے کبھی شراب سے شغف نہیں رکھا"۔ وہ اتنا طویل عرصہ ان کے پاس رہیں لیکن ان کے مشاہدے میں کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں آیا جس سے یہ شبہ بھی ہو سکتا کہ علامہ صاحب شراب کا شوق کرتے تھے۔ اور نہ ہی کبھی علامہ صاحب کی بیگم صاحبہ (والدہ جاوید) نے کوئی ایسا اشارہ کیا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے، میرے خیال میں کسی قسم کے پردے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جبکہ والدہ صاحبہ فرماتی ہیں کہ وہ بلا روک ٹوک حضرت علامہ کے کمرے میں چلی جایا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ اُن کے باہر جانے کے بعد ان کے کمرے کی پوری طرح تلاشی لیا کرتی تھیں تاکہ کوئی ایسی کتاب مل جائے جو ابھی پڑھی نہ ہو۔ ان حالات میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت علامہ روزانہ سونے سے پیشتر رات کو ایک بوتل شراب پیا کرتے تھے تو وہ خالی بوتل آخر کیا ہوتی تھی؟ آدمی خواہ اتنی ہی احتیاط برتے کسی نہ کسی وقت تو بے احتیاطی ہو ہی جاتی ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی کہ علامہ صاحب کے پاس کون ساجن تھا جو رات کو سونے سے پہلے ان کو شراب پیش کرتا تھا اور پھر خالی بوتل اپنے ہمراہ لے جاتا تھا۔

اس بہتان کی نفی میں میری والدہ محترمہ ایک واقعہ یوں بیان فرماتی ہیں: "ایک روز نشست گاہ میں محفل جمی ہوئی تھی۔ چچی جان (والدہ جاوید) اور میں اس وقت ملحقہ کمرے میں تھیں دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ تھا جس سے بند ہونے کے باوجود تمام گفتگو بآسانی سُنی جا

سکتی تھی۔ چچا جان اس وقت اپنے حیدر آباد (دکن) کے حالاتِ سفر بیان فرما رہے تھے۔ اس دوران اُنہوں نے بتایا کہ "ایک روز حیدر آباد کے وزیرِ اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد کے ہاں رات کے کھانے کی دعوت تھی، کھانے کے بعد ناچ گانا شروع ہوا اور جام چھلکنے لگے۔" چچا جان اتنا ہی کہنے پاتے تھے کہ حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا: "کیا آپ نے بھی شوق فرمایا؟" چچا جان نے بلا تامل اور بڑی ملامت سے جواب دیا: "نہیں بھائی! میں محفل سے اُٹھ گیا۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی۔" حضرت علامہ کے مندرجہ بالا بیان کو جھٹلانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ آخر انہیں غلط بیانی کی کیا ضرورت تھی۔ اگر وہ شراب پینے کے گنہگار ہوتے تو یقیناً خاموش رہتے اور کبھی بلا تامل اور اتنی جرأت سے بھری محفل میں انکار نہ فرماتے۔ ایک ایسی شخصیت پر، جس کی تمام شاعری زندگی کی سچائیوں کی بُنیاد پر استوار ہے اور اُن اُن مٹ اصولوں کی مظہر ہے جو نوعِ انسانی کی نجات کا ذریعہ ہیں، دروغ گوئی کا شُبہ قرینِ انصاف ہے۔

اس کے علاوہ اس بات سے سب آگاہ ہیں کہ شاعرِ مشرق کو ایک دفعہ دردِ گردہ کی شدید تکلیف ہوگئی۔ ڈاکٹروں نے نہ معلوم کس بنا پر کھانے کے بعد "برانڈی کا ایک پیگ" بطور دوا تجویز کیا لیکن حضرت علامہ نے اس سے صاف انکار کر دیا اور فرمایا: "قیامِ یورپ کے دوران بھی جس چیز کو میں نے کبھی منہ نہیں لگایا، اب اس معمولی سی تکلیف کے لئے کیسے استعمال کر سکتا ہوں، اور میں تو موت سے بچنے کے لئے بھی کسی حرام چیز کا سہارا لینے کا روادار نہیں ہو سکتا۔" اس کے بعد وہ کافی عرصے تک دردِ گردہ کی شدید تکلیف برداشت کرتے رہے لیکن کبھی بھی "برانڈی کے پیگ" کا نسخہ استعمال کرنے کا خیال تک نہ آیا۔ آخر حکیم نابینا کے علاج سے گردوں کی پتھری پیشاب کے ساتھ تھوڑی تھوڑی کر کے خارج ہو گئی۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ اگر علامہ اقبالؒ شراب کے عادی تھے تو بطورِ علاج استعمال سے انہیں انکار کیوں تھا۔

حکیم الامت کا دیرینہ خادم علی بخش بیان کرتا ہے: "ایک دفعہ ایک سکھ، علامہ صاحب سے ملنے آیا اور میں نے اسے علامہ صاحب کے پاس پہنچا دیا کیونکہ ان کے پاس ہر قسم اور ہر مذہب

کے لوگ آتے تھے۔ کسی کو روک ٹوک نہ تھی۔ بیٹھتے ہی اُس سکھ نے ایک گلاس مانگا، میں نے اس کے ارادے سے ناواقفیت کی بنا پر گلاس لا کر دے دیا۔ اُس سکھ نے ایک دم اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے بوتل نکالی اور گلاس میں شراب اُنڈیل کر غٹاغٹ چڑھا گیا۔ یہ دیکھ کر علامہ صاحب کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا اور مجھے گرجدار آواز میں ڈانٹا: علی بخش! تم نے اس کم بخت کو گلاس کیوں دیا اور جب یہ شراب پینے لگا تھا تو اسے منع کیوں نہیں کیا؟ اب یہ گلاس باہر پھینکو اور اس بدتمیز کو یہاں سے نکال دو۔ میں نے خاموشی سے ان کے احکامات پر عمل کیا لیکن باقی سارا دن ان کی طبیعت مکدر رہی اور اس روز پہلی دفعہ، مجھے دو تین بار جھڑکیاں سُننی پڑیں۔" یہ واقعہ اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے کہ خود شراب پینا تو درکنار، علامہ صاحب کسی دوسرے کو بھی اپنے سامنے پینے کی اجازت نہیں دیتے تھے، یعنی دوسرے الفاظ میں وہ شراب سے انتہائی درجے کی نفرت کرتے تھے۔ علی بخش ان کے پاس انگلستان جانے سے پہلے سے ملازم رہا مگر اس نے انہیں کبھی بھی شراب سے شغل فرماتے نہیں دیکھا۔

لبعض غیر محتاط افراد اپنے آپ کو علامہ اقبالؒ پر متخصص ثابت کرنے کے شوق میں بے سروپا بیانات اور بے بُنیاد واقعات کا سہارا لینے سے بھی نہیں چُوکتے اور بغیر سوچے سمجھے سنسنی خیز افواہیں وضع کرتے اور پھیلانے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ میں خود حضرت علامہ کو شراب پیش کیا کرتا تھا، تو دوسرا کہتا ہے کہ میں بازار سے خرید کر لایا کرتا تھا۔ کچھ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انہوں نے شاعرِ مشرق کو شاعری سکھائی تھی۔ لیکن جب اس قسم کے اصحاب پہ دو ایک سوال کیے جاتے ہیں تو علامہؒ سے ان کے قرب کا پول کھل جاتا ہے اور وہ آئیں بائیں شائیں، کر کے رہ جاتے ہیں۔ دراصل ان لوگوں کا مقصد صرف حضرت علامہؒ کی شہرت سے ناجائز فائدہ اٹھانا اور خود کو ان کا مصاحب خاص ثابت کرنا ہوتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک ایسے ہی ڈاکٹر صاحب سے "اقبال لائبریری" سیالکوٹ میں ملاقات ہوئی۔ لائبریرین صاحب[1] نے تعارف کراتے ہوئے میرے

۱۔ جناب ریاست علی چودھری

متعلق انہیں بتایا کہ یہ آج کل حیاتِ اقبال پر ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ چنانچہ موضوعِ سخن حیاتِ اقبال کی طرف مڑ گیا اور مذکورہ بالا ڈاکٹر اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے لگے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کافی عرصہ علامہ اقبالؒ سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں لیکن دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انہوں نے علامہ صاحب کو کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ دورانِ گفتگو لائبریرین صاحب نے ان سے پوچھا: "لوگ کہتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ شراب پیتے تھے، آپ کا کیا خیال ہے؟" تو انہوں نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا۔ "ہاں! علامہ اقبالؒ شراب پیتے تھے، میرے پاس اسکا ثبوت موجود ہے۔" وہ رعب جمانے کے لئے بات تو کر گئے لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ جھوٹ کا پول فوراً ہی کھل جائے گا۔ میں بڑی دیر سے خاموشی کے ساتھ ان کی بے سر و پا باتیں سُن رہا تھا۔ اب میں نے بڑی آہستگی سے انہیں بتایا کہ میرے پاس اس کے حتمی اور قابلِ یقین ثبوت موجود ہیں کہ حکیم الامتؒ نے کبھی شراب سے شغف نہیں رکھا۔ اور دریافت کیا کہ کیا آپ اپنے بیان کردہ ثبوت سے آگاہ فرمائیں گے؟ تاکہ اس کی روشنی میں کوئی صحیح فیصلہ کیا جا سکے؟ لطف کی بات یہ ہے کہ مذکورہ ڈاکٹر صاحب کو میرے متعلق یہ معلوم نہیں تھا کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ سے میرا کوئی رشتہ ہے، لیکن پھر بھی اس سوال پر وہ بغلیں جھانکنے لگے اور جواب میں ایسی بات کہہ ڈالی کہ جس سے ثابت ہو گیا کہ جھوٹ کے واقعی پاؤں نہیں ہوا کرتے۔ ان کا جواب تھا: "دیکھئے جناب! اس وقت مجھے کچھ یاد نہیں رہا اور دوسرے آپ کو میری بات کا یقین بھی نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ میرا بیان اس سلسلے میں Authentic نہیں ہے۔" غور کا مقام ہے کہ جس ثبوت کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب موصوف لاف زنی فرما رہے تھے وہی انہیں یاد نہ تھا اور ساتھ ہی وہ خود اپنی بات کی 'صحت' سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ مجھے ان کی اس بوالعجبی پر بڑی ہنسی آئی کہ یہ عجیب قسم کے "ڈاکٹر" ہیں جو اپنی باتوں تک کی صحت کی پروا نہیں کرتے مریضوں کی صحت کا خاک خیال فرماتے ہونگے۔

برسبیلِ تذکرہ یہاں اسی قسم کے افراد کے متعلق ایک لطیفہ بیان کر دینا تفننِ طبع کا باعث رہے گا جو علامہ اقبالؒ سے خواہ مخواہ اپنی قربت کا اظہار کرتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں

میرے والد گرامی سے 'یوپی' کے ایک صاحب کی ملاقات ہوئی باتوں باتوں میں وہ صاحب کہنے لگے کہ مجھے علامہ اقبالؒ کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جن دنوں علامہؒ صاحب "علی گڑھ یونیورسٹی" میں پڑھایا کرتے تھے میں وہاں ان سے درس لیتا رہا ہوں۔ اب انہیں کون یہ باور کراتا کہ علامہ اقبالؒ نے تو اپنی زندگی میں کبھی علیگڑھ میں درس و تدریس کا کام کیا ہی نہیں اس کے علاوہ سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ ان صاحب کی عمر بمشکل چالیس یا پینتالیس برس رہی ہو گی اور علامہ اقبال کو فوت ہوئے تیس برس گزر چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب حضرت علامہ فوت ہوئے تو صاحب موصوف زیادہ سے زیادہ ۱۵ برس کے ہونگے اس قسم کے متفنی اصحاب سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم وقت کا ہی تھوڑا احساب کر لیا کریں۔

آمدم برسرِ مطلب، شاعرِ مشرق اپنے ایک خط میں جو عطیہ فیضی کو تحریر کیا گیا لکھتے ہیں: "اس لئے اب واحد علاج یہ ہے کہ میں اس بدبخت ملک کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں یا پھر شراب نوشی میں پناہ ڈھونڈوں کہ خودکشی کا مرحلہ آسان ہو جائے"[1] یہ خط انگلستان سے واپسی کے بعد ۱۹۰۹ء میں لاہور سے لکھا گیا اور اس خط سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۰۹ء تک علامہ اقبالؒ ہرگز شراب نوش نہ تھے بلکہ شراب نوشی کو خودکشی کے مترادف قرار دیتے تھے۔ یہاں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ قیامِ یورپ کے تین برسوں میں اور بعد میں بھی جب کبھی وہ یورپ گئے انہوں نے گوشت بالکل استعمال نہ کیا، چہ جائیکہ شراب، واپس آ کر وہ اکثر بتایا کرتے تھے کہ وہاں کوئی گوشت مسلمان کے کھانے کے قابل نہیں ہوتا کیونکہ غیر اسلامی طریق سے ذبح شدہ جانوروں اور سؤر کا گوشت ہر جگہ موجود ہوتا ہے[2]۔ ان کا یہ عمل حرام چیزوں سے ان کی بے پناہ نفرت

۱۔ "اقبال" از عطیہ بیگم، صفحہ ۳۷۔

۲۔ روایت ہمشیرۂ اقبالؒ محترمہ کریم بی بی صاحبہ۔

کی عیاں دلیل ہے ۔ اس کے علاوہ جب وہ "یورپ گئے تو عام ہندوستانی طلباؔ کی طرح وہاں کے چار تحائف : خمر و خنزیر و روزنامہ و زن سے مرعوب نہ ہوئے ۔ برخلاف اس کے اُن پر ان کا برعکس اثر پڑا[۱]۔" اس سے یہ حقیقت کُھل کر سامنے آجاتی ہے کہ قیامِ یورپ کے دوران انہوں نے ہر اُس چیز سے پرہیز کیا جو اسلام کی رُو سے حرام ہے ۔ تو آخر اپنے مُلک میں وہ کیوں ان سے دُور نہ رہے ہوں گے ؟ یورپ کے مسموم ماحول میں، جہاں بڑے بڑے پارساؤں کی پارسائی پانی کا بلبلہ ثابت ہوتی ہے، علامہ اقبالؒ جب ہر طرح ثابت قدم رہے تو پھر ہندوستان کے بدرجہا بہتر ماحول میں ان کے مضبوط قدم آخر کس طرح ڈگمگا سکتے تھے !

اقبال اکادمی کراچی کے سہ ماہی مجلے "اقبال ریویو" کے شمارہ جنوری ۱۹۶۹ء میں خواجہ عبدالوحید صاحب کا ایک مضمون "میری ذاتی ڈائری میں ذکرِ اقبال" شائع ہوا ہے اس میں خواجہ صاحب نے بھی علامہ اقبالؒ پر شراب نوشی کے الزام کی اس طرح نفی فرمائی ہے :

"میں نے حضرتِ علامہ کو شروع سے لے کر ان کی وفات تک (تقریباً تیس برس) حُقہ پیتے دیکھا اور کبھی یہ نہیں سُنا کہ اُنہوں نے اس تمام زمانے میں شراب کو ہاتھ لگایا ہو[۲]" خواجہ صاحب کے مندرجہ بالا بیان کے مطابق انہیں تقریباً تیس برس علامہ کو قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا، یعنی وہ علامہ صاحب کو ۱۹۰۸ء میں[۳] انگلستان سے واپسی کے فوراً بعد سے جانتے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں علامہ صاحب کی عمر ۳۴، ۳۵ برس[۴] تھی ۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ علامہ علیہ الرحمہ عالمِ شباب میں بھی شراب نوشی سے محفوظ تھے ۔ خواجہ عبدالوحید صاحب کا بیان میری

۱۔ "اقبالؒ کی پیش گوئیاں" از ڈاکٹر ہاشمی صفحہ ۱۱۸ ۔

۲۔ "اقبال ریویو" جنوری ۱۹۶۹ء صفحہ ۴۷ ۔

۳۔ "اقبال ریویو" جنوری ۱۹۶۹ء صفحہ ۴۵ ۔

۴۔ علامہ اقبالؒ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ۶۴ برس عمر پائی ۔

تحقیق کی تائید کرتا ہے کہ علامہ صاحب نے اپنی زندگی میں کبھی بھی شراب سے شغف نہیں رکھا۔

درحقیقت حضرت علامہ اقبالؒ پر شراب نوشی کا بہتان چپکانے کی کوشش صرف اس مفروضے کا جواز پیدا کرنے کے لئے کی جاتی ہے کہ شراب نوشی کے بغیر شاعری ناممکن ہے، حالانکہ یہ تصور حقیقت کے سراسر منافی ہے۔ اگر ہم اپنے ماضی کے شعراء پر نظر ڈالیں تو ان میں کئی ایسے بلند پایہ شعرائے کرام موجود تھے جنہوں نے کبھی شراب سے شغف نہ رکھا۔ اس کے علاوہ موجودہ دور میں بھی بیشتر شعراء مطلقاً شراب استعمال نہیں کرتے۔ اس لیے شاعرِ مشرق جیسے عظیم انسان اور بلند مرتبہ شاعر پر شراب نوشی کا الزام اور ان کی اعلیٰ و ارفع شاعری کو (جس کے متعلق جسٹس ایم۔آر۔کیانی مرحوم فرمایا کرتے تھے: "اقبالؒ کی شاعری قرآن کی آیات سے مملو ہے، پڑھنے والوں کے علاوہ سننے والوں کو بھی باوضو ہونا چاہیئے"[۱]) مرہونِ شراب نوشی قرار دینا علامہ اقبالؒ کی کھلی توہین ہے یہ اُن پر بہتانِ عظیم ہی نہیں بلکہ ان کی شاعری کی تذلیل اور آیاتِ قرآنی کی بے حرمتی کے مترادف ہے شاعرِ مشرق خود فرماتے ہیں:

کامل وہی ہے رندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منتِ تاک

حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمہ پر سب سے زیادہ شر انگیز اور بے سروپا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ ایامِ جوانی میں وہ ایک طوائف کے قتل کے مرتکب ہوئے تھے۔ پیشتر اس کے کہ اس بے بُنیاد کہانی کی تردید میں کچھ کہا جائے، ہمیں ایک دفعہ پھر اُس ماحول کا جائزہ لینا ہوگا جس کا تفصیلی ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ علامہ اقبال کو گھر اور مدرسے میں والدین اور اُستادوں کی شکل میں بہترین اور پرہیز گار انسانوں سے تربیت ملی اور ان بزرگوں نے یقیناً انہیں نیکی و بدی کا فرق واضح طور پر ذہن نشین کرایا اس قدر پاکیزہ ماحول اور تربیت میں پروان چڑھنے والا ذہن

۱۔ "افکارِ پریشاں" از جسٹس ایم آر کیانی، صفحہ ۶۲

کبھی اتنا پراگندہ نہیں ہو سکتا کہ وہ قتل جیسے فعل کا مرتکب ہو۔ دوسرے اپنے والد گرامی کی زندگی میں اگر حضرت علامہ سے اس قسم کا شدید جرم سرزد ہوا تو یہ کبھی باور نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے والد محترم نے، جو بڑے باشرع اور سچے مسلمان تھے، انہیں معاف فرما دیا ہو گا۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ علامہ اقبالؒ سے ایسی غلطی سرزد ہو گئی تھی تو کیا تمام زندگی اقبالؒ جیسے حساس انسان کو ان کے ضمیر نے کبھی ملامت نہ کی؟ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کتنا بھی چھپانے کی کوشش کی جائے، خون کبھی چھپا نہیں رہتا اور ضمیر کی خلش انسان کو اس کے اظہار اور اقرار پر مجبور کر دیتی ہے۔ لیکن علامہ اقبالؒ نے اپنی ساری زندگی میں کبھی اس قسم کا کوئی اقرار یا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی ان کی زندگی میں ایسی بات کبھی سننے میں آئی، بلکہ ان کی وفات کے بعد یہ من گھڑت قصہ مشہور کرنے کی جسارت کی گئی۔ جہاں تک افرادِ خاندان کا تعلق ہے، کبھی کسی نے اس واقعے کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ اگر کبھی ایسی بات ہوئی ہوتی تو ضرور کسی نہ کسی کی زبان سے نکل جاتی۔ اس کے علاوہ خاندان کے ان افراد نے بھی، جو علامہؒ کے انتہائی مخالف اور برملا دشمن شمار ہوتے تھے، کبھی اس واقعے کا ذکر نہیں کیا۔ میں نے خود ان میں سے کئی ایک افراد سے دریافت کیا ہے لیکن ہر کسی نے اسکی تردید ہی کی۔ اس کے علاوہ سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ کچھ لوگ یہ واقعہ سیالکوٹ کا بتاتے ہیں اور کچھ اسے لاہور کی واردات قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ بھی اس کے بے بنیاد ہونے کا ایک بین ثبوت ہے کہ ابھی تک اسکی جائے وقوع کا تعین بھی نہیں ہو سکا۔ اس سلسلے میں علامہؒ صاحب کے ایک ہم مکتب پروفیسر محمد دین بھٹی صاحب سے (جو اس وقت بعمر ۸۸ برس بقیدِ حیات اور بقائمی ہوش و حواس ہیں) میں نے جب استفسار کیا تو انہوں نے بڑے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "میں نے اپنی جوانی میں کوئی ایسا واقعہ علامہ مرحوم و مغفور کی ذات سے منسوب نہیں سنا لیکن آج جب اس قسم کی باتیں سنتا ہوں تو ان لوگوں کی ذہنی پستی اور احسان فراموشی پر رونا آتا ہے۔ یہ میری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ایسے من گھڑت اور دل خراش الزامات سننے کے لیے زندہ ہوں۔"

دراصل اس قبیل کے بے سروپا الزامات تراشنے اور مشہور کرنے میں ایک مخصوص "فرقے" کے افراد کا ہاتھ کارفرما ہے اور وہ محض اسی بنا پر اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں تاکہ اپنی اس "بین الاقوامی" تذلیل کا بدلہ چکا سکیں جو حضرت علامہ کے ہاتھوں انہیں اٹھانی پڑی تھی۔ سب سے زیادہ دکھ اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ "شہرِ اقبالؒ" کے بیشتر باشندے، جو سیالکوٹ سے باہر خود کو "شہرِ اقبال" کا باسی ظاہر کرنا باعثِ فخر خیال کرتے ہیں اور اقبالؒ کے نام سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ہر وقت مصروف رہتے ہیں وہ بھی اس مذموم پراپیگنڈے میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ میرے خیال میں حضرتِ علامہ اقبالؒ کے مخالفین اور بدخواہ جس قدر سیالکوٹ میں پائے جاتے ہیں شاید ہی کسی دوسری جگہ ہوں۔ اس تمام مخالفت کے پس پردہ حسد کا جذبہ کروٹیں لیتا ہوا صاف نظر آتا ہے۔ یہ لوگ اپنی پیشانیوں پر "اہالیانِ شہرِ اقبال" کا لیبل تو ضرور چپکا لیتے ہیں لیکن تعصب کا زہر اپنے دلوں کے نہاں خانوں میں محفوظ رکھتے ہیں اور اسے اگلنے کا کوئی موقع ضائع کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ اپنے گریبانوں میں جھانکنے کی زحمت گوارا کریں اور اپنے اپنے دل کے چور کو پہچانیں۔ اس خصلت اور ذہنیت کے افراد شہرِ اقبال کے اُن اصحاب کے لیے، جو شیدائیانِ اقبالؒ میں شمار ہوتے ہیں، ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا محاسبہ بے حد ضروری ہے۔

"ذکرِ اقبال" میں "مولانا" سالک نے حضرتِ علامہ اقبالؒ پر "رنگ رلیاں" منانے کا جو الزام لگایا ہے، پیشتر اس کے کہ حقائق کی روشنی میں اسے پرکھا جائے، بہتر ہو گا اگر "مولانا" سالک کی "جعل نویسی" کے ایک شاہکار کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ سالک اپنی متذکرہ بالا کتاب میں علامہؒ کے بچپن میں بٹیرے[1] پالنے کے شوق کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "مولانا میر حسن بھی (انہیں) منع

---

۱ اوّل تو یہ بات ہی غلط ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ کو کبھی بٹیر پالنے کا شوق تھا، البتہ انہیں کبوتروں کا شوق ضرور تھا اور ان کے اس شوق سے سب آگاہ ہیں۔ (مصنف)

نہ کرتے تھے بلکہ ایک دفعہ مولانا نے دیکھا کہ اقبالؒ سبق پڑھ رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں بٹیر تھام رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا: "کمبخت! اس میں تجھے کیا مزا ملتا ہے؟" تو اقبالؒ نے برجستہ جواب دیا کہ "حضرت! ذرا اسے پکڑ کر دیکھیے"[1] ایک معمولی عقل و فہم کا مالک بھی سالک صاحب کی اس تحریر پر سوائے ہنسنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ مقام غور ہے کہ موجودہ زمانے میں جبکہ اُستاد کا رعب اور وقار تقریباً ختم ہو چکا ہے، اگر ایک طالب علم بٹیر پکڑے بیٹھا سبق پڑھ رہا ہو اور استاد کے پوچھنے پر مندرجہ بالا جواب دے تو استاد اگر اسکی مرمت نہیں کرے گا تو کم از کم اس کے والدین تک شکایت ضرور پہنچائے گا۔ اب ذرا اس دور کو تصور میں لائیے جب اُستاد کے دبدبے اور رعب سے طالب علم تو کجا والدین تک کانپتے تھے۔ اقبالؒ بٹیر لیے بیٹھے ہیں اور استاد کے پوچھنے پر استاد کو بھی بٹیر پکڑنے کا مشورہ دیتے ہیں اور طرفہ یہ کہ اُستاد انہیں کچھ بھی نہیں کہتے۔ علامہ اقبالؒ اپنے استادوں، خاص طور پر مولانا میر حسن صاحب، کا جس قدر ادب احترام کرتے تھے اس کے متعلق متعدد کتابوں میں ذکر آیا ہے۔ ایک دفعہ کسی نے شاعرِ مشرق سے پوچھا تھا کہ کیا کبھی مولوی صاحب (مولانا میر حسن صاحب) کو اپنے اشعار بھی سُناتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے کبھی جرأت نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ علامہ اقبالؒ کے ہم مکتب پیر فقیر محمد دین بھٹی صاحب، جنہیں مولانا میر حسن مرحوم کا شاگرد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت علامہ جیسا مؤدب شاگرد انہوں نے آج تک نہ دیکھا اور نہ سُنا۔ وہ مزید بتاتے ہیں کہ شاگردی کے زمانے میں شاہ صاحب قبلہ (مولانا میر حسن) کے سامنے باادب بیٹھ کر سبق حاصل کرنا علامہ صاحب پر ختم تھا۔ بھٹی صاحب بھی فرماتے ہیں کہ "علامہ اقبالؒ بامِ عروج پر پہنچنے کے بعد بھی جب کبھی شاہ صاحب سے ملاقات کے لیے آتے تو دو زانو ہو کر بڑے باادب ان کی خدمت میں بیٹھتے اور انتہائی توجہ کے ساتھ ان کی نصیحتیں سُنتے۔ اگر شاہ صاحب کوئی سوال کرتے تو اس کا مختصر ترین جواب دے کر شاہ صاحب کو گفتگو کا زیادہ موقع دیتے"۔ ان تمام باتوں سے

---

[1] "ذکرِ اقبال" از مولانا سالک۔ صفحہ ۱۲۔

یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ اپنے اُستادِ مکرم کا انتہائی ادب کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے سامنے بٹیرے کر بیٹھنا اور پھر ان کو بھی بٹیر پکڑنے کی دعوت دینا ناممکن ہے۔

"مولانا" سالک کے علاوہ "اقبالؒ باکمال" میں عظیم فیروز آبادی نے اپنے ایک مضمون "اقبالؒ کی حیاتِ معاشقہ" میں علامہ اقبالؒ پر مس فرنجی نائٹے[1]، مس شنی شیل[2] اور عطیہ بیگم جیسی باذوق اور عالم خواتین سے معاشقوں کا مذموم الزام عائد کیا ہے۔ عظیم فیروز آبادی کی مفروضہ نگاری کا پول صرف اس معمولی سی بات سے کھل جاتا ہے کہ بقول ان کے علامہ اقبالؒ کی بیگم صاحبہ (والدہ جاوید) "وکٹوریہ گرلز کالج" کی طالبہ تھیں[3]۔ حالانکہ وہ کالج تو کیا کسی سکول کی تعلیم یافتہ بھی نہیں تھیں[4]۔ والدۂ جاوید گھر پر صرف قرآن مجید اور معمولی اردو پڑھی ہوئی تھیں اور صحیح طرح لکھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ شادی کے بعد انہوں نے معمولی اردو لکھنا سیکھا اگر ایک مضمون نگار اپنی مرضی سے بیگم اقبال کو کالج کی طالبہ بنا سکتا ہے تو اس قسم کے "زرخیز" ذہن سے ہر قسم کی "ایجادات" کی توقع کی جاسکتی ہے۔

یہاں اگر عطیہ بیگم اور علامہ اقبالؒ کے مابین تعلقات پہ ایک نظر ڈال لی جائے تو بہتر ہوگا عام طور پہ عطیہ بیگم کے نام اقبالؒ کے خطوط کو بنیاد بنا کر عجیب و غریب اور مضحکہ خیز مفروضے تشکیل کئے جاتے ہیں، لیکن "اقبال" از عطیہ بیگم میں شامل علامہ اقبالؒ کے تمام خطوط کا اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ان میں کہیں عشق و محبت کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ دو ایک خطوط کے سوا تمام خط عطیہ بیگم کے خطوں کے جواب میں تحریر کئے گئے ہیں اور

۱، ۲۔ یہ دونوں خواتین قیامِ یورپ میں علامہ اقبالؒ کی اُستاد تھیں۔

۳۔ "اقبالؒ باکمال" صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶۔

۴۔ "ذکرِ اقبال" کے صفحہ ۶۷ پر سالک صاحب نے انہیں وکٹوریہ گرلز سکول کی طالبہ بتایا ہے جو بالکل غلط ہے۔ (مصنف)

یہ تمام خطوط سیدھی سادی باتوں اور کہیں کہیں علمی موشگافیوں کے مظہر ہیں عظیم فیروز آبادی اپنے متذکرہ مضمون میں اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ "اقبالؒ کے عطیہ بیگم کے نام خطوط Love letters کا اچھا نمونہ نہیں ہیں، بلکہ محض رسمی اور خشک باتیں ہیں اور نہ ان میں اُن کی والہانہ شیفتگی کا پتا چلتا ہے[۱]"۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اعتراض اُٹھانا پڑتا ہے کہ "تاہم یہ جاننے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ ..... عطیہ بیگم کی کن خواہشات کا احترام اقبالؒ نے نہیں کیا اور اگر اس خلا کو قیاس سے پُر کیا جائے تو سب کھیل ہی کھیل نظر آئے گا[۲]" انتہائی درجے کی کور ذوقی اور بدنیتی کی زندہ مثال ہے اور اس قیاس آرائی کے پس منظر میں متعصب ذہن کارفرما نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں ایک صاحبِ فہم کی مندرجہ ذیل رائے بہت اچھی روشنی ڈالتی ہے: "دوسرے ممالک کی طرح ہمارے ملک کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت بھی غالباً یہ خیال کرتی ہے کہ جذبۂ محبت دراصل جنسی جذبے ہی کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے۔ یہ نظریہ ماہرِ نفسیات "سگمنڈ فرائڈ" نے آج سے چالیس برس اُدھر پیش کیا تھا، بظاہر بہت صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن یہ جس قدر مقبول ہے، حقیقت میں اسی قدر غلط ہے[۳]"۔

"اقبالؒ از عطیہ بیگم سے علامہ اقبالؒ کے اخلاق پر کسی قسم کا کوئی دھبہ ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی عطیہ بیگم نے ان پر کوئی الزام عاید کیا ہے، البتہ چند ایک مقامات پر عطیہ کے ریمارکس یہ چغلی ضرور کھاتے ہیں کہ وہ (عطیہ بیگم) علامہ اقبالؒ کے ساتھ شادی کی خواہش مند تھیں مگر شاعرِ مشرق نے کبھی اس کا نوٹس نہ لیا۔ حکیم الاُمّت کے اُس خط سے جس میں عطیہ کی اِن خواہشات کا ذکر ہے جن کا احترام نہ ہو سکا، عظیم فیروز آبادی جیسے اصحاب کا غلط قیاس آرائیوں کی طرف جانا ناقابلِ فہم ہے۔

۱۔ "اقبال با کمال" صفحہ ۱۰۴۔ ۲۔ "اقبال با کمال" صفحہ ۱۰۴۔

۳۔ "حیاتِ اقبالؒ کا ایک جذباتی دور" صفحہ ۹۵، ۹۶۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبالؒ، عطیہ بیگم کو ایک علمی دوست کی حیثیت سے تو پسند کر سکتے تھے لیکن بیوی کے رُوپ میں وہ ان کے لئے ناقابلِ قبول تھیں کیونکہ وہ جس قسم کی بیوی کے خواہشمند تھے وہ عطیہ بیگم سے مختلف تھی۔ عطیہ بیگم نے خود اور نواب صاحب آف جنجیرہ[۱] نے علامہ اقبالؒ کو یورپ سے واپسی کے فوراً بعد 'جنجیرہ' آنے کی متعدد دعوتیں دیں لیکن انہوں نے ہر بار مصروفیت کا عذر کر دیا۔ آخر کیوں؟ صاف ظاہر ہے کہ اقبالؒ عطیہ کی دیرینہ خواہش (شادی) کو پورا کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ شاعرِ مشرق نے ستمبر ۱۹۳۱ء میں عطیہ بیگم کی شادی کے کافی عرصے بعد اس کی دعوت کو شرفِ قبولیت بخشا اور بمبئی میں اس کے ہاں چند روز کے لئے قیام فرمایا۔

علامہ اقبالؒ اگر چاہتے تو عطیہ بیگم یا کسی دوسری اعلیٰ تعلیمیافتہ خاتون کے ساتھ شادی میں ان کے لئے کوئی رکاوٹ نہ تھی لیکن چونکہ وہ اعلیٰ تعلیم اور آزادیٔ نسواں کے اثرات سے بخوبی آگاہ تھے۔ اور ان کی چشمِ بینا اسکی قباحتوں کو بخوبی پہچانتی تھی اسلیئے انہوں نے معمولی تعلیمیافتہ بیگمات کو ترجیح دی[۱]۔ اور وہ تمام زندگی ان سے ہر طرح مطمئن رہے۔ والدۂ جاوید سے شادی کے بعد انہوں نے ایک دوست کو بتایا تھا کہ ان کی شادی کیا ہوئی ہے، گویا جنت الفردوس مل گئی ہے، حکیم الامتؒ چونکہ ایک اعلیٰ سیرت، نیک چلن اور پاک طینت بیوی کے خواہشمند تھے اس لیے گھریلو قسم کی خاتون سے شادی پر اظہارِ آسودگی فرمایا۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ علامہ اقبالؒ کبھی بھی "آزاد پریوں" کی عشوہ طرازیوں کے دلدادہ نہیں رہے اور نہ

۱۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ لوگ مشہور کرتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ نے اسلیے مزید دو شادیاں کیں کیونکہ وہ زیادہ پڑھ جانے کی وجہ سے اپنی پہلی بیوی (جو کم تعلیمیافتہ تھیں) سے مطمئن نہیں تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ صاحب کی دو دونوں بیگمات بھی جن سے انہوں نے انگلستان سے واپس آکر شادی کی، زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھیں۔ ان کی لدھیانے والی بیگم صاحبہ تقریباً ان پڑھ تھیں اور والدۂ جاوید قرآن مجید اور تھوڑی بہت اردو گھر پر پڑھی ہوئی تھیں۔ دراصل ان کی مزید دو شادیوں کی وجوہات کچھ اور تھیں جن کا اظہار ضروری نہیں۔ (مصنف)

ہی وہ ان "پری وشوں" کی کمزوری سے لذت گیر ہونے کے قائل تھے۔ عطیہ بیگم، ویجی ناٹ اور شنی شیل جیسی عالم خواتین سے علمی و ادبی استفادے ضرور ہوتے رہے لیکن ان ملاقاتوں سے "اقبال کی حیاتِ معاشقہ" کا مفروضہ تشکیل دینا نامناسب ہی نہیں، ناواجب بھی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت علامہ کے ایک قریبی دوست ڈاکٹر تاثیر مرحوم کا قول کافی ہے کہ "وہ (علامہ اقبالؒ) اچھی شکل کو اچھی شکل ضرور کہتے تھے لیکن عاشقی کے گنہ گار کبھی نہ ہوئے۔"[۱]

اسی طرح مولانا عبدالسلام ندوی "علامہ اقبالؒ کا اخلاق و عادات" کے زیرِ عنوان رقمطراز ہیں: "ڈاکٹر صاحب کی شاعری، فلسفے اور سیاسی نظریات پر بہ کثرت اعتراضات کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ صوفیوں کا ایک گروہ، جو مستقل طور پر ان کا مخاطب تھا وہ اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے ان پر سخت سے سخت اعتراض کر سکتا تھا لیکن ہم نے ڈاکٹر صاحب پر جو مضامین دیکھے ہیں، ان میں کوئی مضمون ہماری نظر سے ایسا نہیں گزرا جس میں ڈاکٹر صاحب کے اخلاق و عادات پر اعتراض کیے گئے ہوں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے ان کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں تھا۔"[۲]

اس سلسلے میں پروفیسر جی۔ سی چیٹرجی آئی۔ ای۔ ایس۔ صدرِ شعبۂ فلسفہ، گورنمنٹ کالج لاہور کے مضمون "ایک عظیم الشان شخصیت" کا مندرجہ ذیل اقتباس بھی قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "سب سے پہلے اور سب سے زیادہ میں ان کی غیر معمولی سادگی سے متاثر ہوا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ اقبالؒ عیش و عشرت کے دلدادہ ہیں لیکن میں نے ان کے اردگرد کبھی تن آسانی، عیش پرستی اور نفس پروری کا کوئی سامان نہیں دیکھا۔ ان کو ہمیشہ سادہ ترین لباس میں فرش پر بیٹھے ہوئے کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف یا کسی ہم فکر کے ساتھ گہری حکیمانہ بحث میں مشغول پاتا تھا۔ دوسری بات جو میں نے ان کے متعلق محسوس کی، یہ تھی کہ ایک

۱۔ مضمون "اسماء الرجالِ اقبال" از ڈاکٹر تاثیر، مطبوعہ کریسنٹ، مجلہ اسلامیہ کالج۔ فروری، اپریل ۱۹۵۱ء

۲۔ "اقبالِ باکمال" صفحہ ۷۰۔

ایسے وقت میں، جبکہ ہماری اجتماعی زندگی مکر و فریب اور خود غرضی کا شکار ہو رہی تھی، اقبالؒ ذاتی مفاد سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور ان کی آرزوؤں اور خواہشوں کا واحد مرکز تمدن اور روحانیت کی دنیا رہی۔[1]"

پروفیسر چیٹرجی کا یہ اظہارِ خیال علامہ اقبالؒ پر "رنگ رلیوں" اور "شراب نوشی" جیسے مذموم الزامات عاید کرنے والوں کے لئے لمحۂ فکریہ فراہم کرتا ہے۔

یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ جب شاعرِ مشرق کو ۱۹۲۳ء میں "سر" کا خطاب دیا گیا تو بعض ہندو اور مسلم آزادی پسند حلقوں میں پنجاب تا بنگال ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اخبارات اور رسائل میں ان کے خلاف مضامین اور اشعار کی بھرمار ہوئی۔ ان کی وطن دوستی اور عشقِ ملّی تک پر شک و شبہ کا اظہار کیا گیا لیکن کسی کو ان کے اخلاق کو ہدفِ تنقید بنانے کی جرأت نہ ہوئی۔ اگر علامہ صاحب میں معمولی سی بھی اخلاقی گراوٹ ہوتی تو مخالفین کے لئے اسے منظرِ عام پر لانے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ البتہ یہ "سعادت" علامہ صاحب کی وفات کے کافی عرصے بعد ان کے ایک احسان فراموش خوشہ چین کے حصے میں آئی جس نے محض جلبِ منفعت کی خاطر یا کسی کے اشارے پر "رنگ رلیوں" کی تہمت تراشی۔

ذیل میں، میں اپنی والدہ محترمہ کی روایت سے ایک گھریلو واقعہ قلمبند کر رہا ہوں جو حضرت علامہ کی پاکیزہ مزاجی، بلند اخلاقی اور اعلیٰ کردار کی نشاندہی کرتا ہے وہ اس طرح بیان فرماتی ہیں:

"یہ 1915ء کا ذکر ہے۔ ہمارے ایک پھوپھی زاد بھائی چچا جان (علامہ صاحب) کے ہاں لاہور میں رہتے تھے۔ موسم گرما کی تعطیلات میں حسبِ معمول چچا جان اہلِ خانہ کے ہمراہ سیالکوٹ تشریف لے آئے اور لاہور والے مکان پر ان کے بھانجے اکیلے رہ گئے۔ انہی دنوں ہمارے ان پھوپھی زاد بھائی کو بازارِ حسن جانے

۱۔ "اقبال نامہ" مرتبہ، چراغ حسن حسرت، صفحہ ۹۲۔

کا چسکا پڑا اور وہاں کی ایک طوائف[۱] کی التجاؤں سے متاثر ہو کر اسے گناہ آلود زندگی سے نجات دلائی اور گھر لا کر نکاح پڑھوا لیا۔ اس عورت کے لواحقین نے بڑا طوفان اٹھایا اور آخر معاملہ پولیس تک پہنچا لیکن عورت کے بیان سے فیصلہ ہمارے پھوپھی زاد بھائی کے حق میں ہوا۔ تعطیلات کے اختتام پر چچا جان جب واپس لاہور پہنچے تو گھر پر ایک اجنبی عورت کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ اپنے بھانجے سے دریافت کیا تو اُنہوں نے تمام واقعہ بتا دیا۔ مگر چچا جان کو تاب کہاں! بہت برہم ہوئے اور اسی وقت ہمارے پھوپھی زاد بھائی کو ان کی بیوی سمیت گھر سے چلے جانے کا حکم سُنا دیا اور پھر تمام زندگی ان کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہ ہوئے۔"

انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ایک مجبور و مظلوم عورت کو گناہ آلود زندگی سے نجات دلانا ایک مستحسن فعل تھا لیکن علامہ اقبال رح جیسے اصول پرست اور پاکیزہ مزاج انسان یہ برداشت نہ کر سکے کہ ان کے خاندان کا ایک فرد بازارِ حسن کا رُخ کرے۔

عظیم فیروز آبادی[۲] اسی مضمون میں "زہد و رندی" کے مندرجات اور "بے داغ ہے مانندِ سحر اسکی جوانی" کے متعلق یوں خیال آرائی فرماتے ہیں: "اسکو اقبالؒ کی کمزوری کہیے یا جُراءتِ رندانہ کی کمی کہ انہوں نے اپنی ان خطاؤں کو داد طلب سمجھنے کی جگہ ان کی ایسی تاویل کی جس کے تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔" عظیم صاحب کے اس "ارشاد" سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تنقید برائے تنقید کے قائل اور واضح سے واضح بات پر بھی اعتراض کرنے

۱۔ دراصل وہ خاتون طوائف نہیں تھیں بلکہ کشمیر کے کسی اچھے ہندو گھرانے سے تھیں جنھیں اغوا کر کے "اس بازار" میں پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ آخر دم تک اپنے خاوند کی فرمانبردار رہیں۔

۲۔ "اقبال باکمال"، صفحہ ۹۸۔

کے عادی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ تعمیری تنقید کی بجائے تخریبی تنقید کے علمبردار ہیں۔
ترجمانِ حقیقت پر جھوٹ کا بہتان لگانا کم علمی کی دلیل ہے۔ کیونکہ حضرت علامہ کے طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک "مولانا" جو عالمِ دین ہونے کے دعویدار بھی تھے، دروغ گوئی کے مرتکب ہوئے تو علامہ اقبالؒ بڑے بددِل ہوتے اور کئی روز تک بے کیف اور بے چین رہے[۱]۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود جھوٹ بولنا تو درکنار، دوسرے کی زبانی سُننا تک انہیں گوارا نہیں تھا۔ اس سلسلے میں عظیم صاحب جیسے بے پر کی اُڑانے والوں کیلیے مولانا عبدالسلام ندوی کا مندرجہ ذیل قول کافی ہے: "یہ ڈاکٹر صاحب کی بے ریائی اور نیک نفسی ہے کہ انہوں نے اپنے ان اخلاق کو بھی بہ تصریح بیان کر دیا ہے جو قابلِ اعتراض سمجھے جاتے ہیں[۲]۔"

شاعرِ مشرق کی ان نظموں اور غزلوں کو، جو قیامِ یورپ کے دوران کہی گئیں، بُنیاد بنا کر ان پر عشق بازی کی تہمت تراشنا زیادتی ہے کیونکہ اقبال رح جس اعلیٰ پائے کے حقیقت نگار سخنور تھے ان کی رُوح اسی اعلیٰ درجے کی حساس حُسن شناس بھی تھی، وہ خود فرماتے ہیں:

جستجو کُل کی لیے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
حُسن بے پایاں ہے، دردِ لا دوا رکھتا ہوں میں۔

اس لئے اگر انہوں نے کسی مقام پر کسی کے حُسنِ دِل آویز کی سحر کاریوں کے لطیف تاثر کو نشاط انگیز لہجے اور حسین پیرائے میں بیان کیا ہے تو اس سے یہ خیال آرائی کرنا کہ وہ بقول سالک "رنگ رلیوں" میں مشغول رہا کرتے تھے اور بقول عظیم فیروزآبادی عشق و محبت کے کھیل کھیلا کرتے تھے، حد درجہ افسوسناک ہے۔ جو حضرات" علامہ اقبالؒ کی مذکورہ بالا نظموں کی من مانی تشریحات کر کے اقبالؒ کو عشقِ مجازی میں گرفتار ہی نہیں" ہرجائی "تک ثابت کرنے کے درپے

۱۔ "سیرتِ اقبالؒ" صفحہ ۳۱۔

۲۔ "اقبال باکمال" صفحہ ۷۰۔

رہتے ہیں ان کے لئے ایک فاضل نقاد کی مندرجہ ذیل رائے لمحۂ فکریہ فراہم کرتی ہے: "اُنہیں (علامہ اقبالؒ) انسان کا عشق ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کا عشق یا خدا سے تھا یا پیغمبر سے"[۱]۔

یہ مانا کہ شاعرِ مشرق کی شاعری میں عشق کا ذکر بہت ہے لیکن ہر عشق کو ایک ہی ترازو میں تولنا اور ایک ہی کسوٹی پر پرکھنا قرینِ انصاف نہیں۔ اقبالؒ کے عشق حقیقی پر عشق مجازی کی تہمت لگانا اور یہ کہنا کہ عشقِ مجازی کے بغیر شاعری ممکن ہی نہیں "کنوئیں کے مینڈک" والی بات ہے۔ اگر ماضی بعید میں ہمارے بیشتر شعرا عشق مجازی میں گرفتار رہے اور مجازی محبوبوں کے عارض و گیسو سے فرصت حاصل نہ کر سکے تو یہ ضروری نہیں کہ اقبالؒ اور ان کے بعد آنے والے شعراء بھی اسی فرسودہ لکیر کو پیٹتے رہیں۔ اقبالؒ نے عشق کو ایک نیا اور وسیع میدان عطا کیا اور فنا کے چکر سے نکال کر ابدیت کے مقام بلند پر پہنچایا۔ یہ اقبالؒ ہی تھے جنہوں نے عشق کو مجاز کی پُرپیچ اور ناہموار پگڈنڈیوں سے نجات دلائی اور حقیقت کی صراطِ مستقیم پر چلنا سکھایا۔ اس سلسلے میں خلیفہ عبدالحکیم فرماتے ہیں: "اقبالؒ عشق مجازی کا شاعر نہ تھا لیکن محض مشقِ سخن کے طور پر مصنوعی عاشقی کی کچھ غزلیں اقبالؒ نے کہیں"[۲]۔ خلیفہ عبدالحکیم مزید رقمطراز ہیں: "اقبالؒ کا عشق حیات و کائنات کی ایک اساسی اور نفسیاتی کیفیت ہے۔ یہ حیاتِ علی الاطلاق کا عشق ہے، جو افراد و اشیا سب پر پھیلا ہوا ہے لیکن کوئی ایک فرد اس کا مرکز یا مطمحِ نظر نہیں۔ اس کا عشق فرد سے گذر کر ملت کا عشق بن جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ تمام نوعِ انسانی پر بلا امتیاز مذہب و ملت پھیل جاتا ہے، آخر میں تمام حیات و کائنات اس میں غرق ہو جاتی ہے"[۳]۔

کلامِ اقبالؒ کے ایک نقاد آسی ضیائی صاحب[۴] کے دو لطیفے یہاں بیان کر دینا تفنن طبع

۱۔ "حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور" صفحہ ۱۳۷

۲۔ "فکرِ اقبالؒ" از خلیفہ عبدالحکیم صفحہ ۱۷

۳۔ "فکرِ اقبال" از خلیفہ عبدالحکیم صفحہ ۳۸۔

۴۔ موصوف مرے کالج سیالکوٹ میں اردو کے لیکچرار ہیں

کا باعث ہوں گے لیکن ان پر صرف ہنس دینا ہی کافی نہیں بلکہ ان پر غور کرنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ آپ کو اس کا احساس ہو سکے کہ حکیم الامتؒ کی نیک نامی کے خلاف کس منصوبہ بندی کے تحت کام ہو رہا ہے۔

آسی ضیائی صاحب اپنی کتاب "کلامِ اقبالؒ کا بے لاگ تجزیہ" میں علامہ اقبالؒ کو "بوالہوس" ثابت کرنے کے لئے ان کی تین شادیوں پر اعتراض کرتے ہوئے "ارشاد" فرماتے ہیں: "آخر اقبالؒ نے کیوں یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں اور وہ بھی اس طرح کہ تینوں بیویاں بیک وقت موجود تھیں؟"[۳] آسی صاحب کی اس "عظیم الشان" کم علمی پر کسی قسم کے تبصرے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اس حقیقت کو دہرا دینا ہی کافی ہوگا کہ اسلام میں بیک وقت چار بیویوں کی اجازت موجود ہے۔ آسی صاحب اپنی کتاب میں ایک دوسری جگہ بہت دور کی کوڑی لائے ہیں اور ان کی اس سنسنی خیز اور چونکا دینے والی دریافت کی جس قدر بھی "داد" دی جائے کم ہوگی، وہ فرماتے ہیں کہ "چونکہ کلامِ اقبالؒ میں "خورشید" کا ذکر بار بار آتا ہے اس لئے علامہ اقبالؒ کی کوئی محبوبہ خورشید نامی ضرور رہی ہوگی۔"[۴]

میری ناقص رائے میں کلامِ اقبالؒ کے "بے لاگ" نقادوں کے لئے یہ بڑا سنہرا موقع ہے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ فوراً اس سلسلے میں ریسرچ کا آغاز فرمائیں کہ کلامِ اقبالؒ میں "لالہ" اور "شاہین" کا ذکر چونکہ بہت زیادہ ہے اس لئے کہیں علامہ اقبالؒ کے لاشعور کی کسی کھونٹی سے ان کی محبوبائیں "لالہ رُخ" اور شاہینہ بیگم نہ لٹک رہی ہوں۔ آسی ضیائی اور ان جیسے دوسرے حضرات کی ذہنی سطح پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے:

رہے نہ رُوح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف (اقبالؒ)

۳۔ "کلامِ اقبال کا بے لاگ تجزیہ" از آسی ضیائی صفحہ ۶۶۔
۴۔ "کلامِ اقبال کا بے لاگ تجزیہ" از آسی ضیائی صفحہ ۵۹۔

سر عبدالقادر

کیفِ غم

اقبال کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت اُس کا "کیف غم" ہے۔ اور یہی کیفیت مرحوم کے ذاتی فضائل میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ جو لوگ اُن سے ملتے رہے ہیں۔ وہ خُوب جانتے ہیں۔ کہ اعلیٰ درجہ کی ظرافت اور ہنستے ہنسانے کی عادت کے ساتھ اُن میں یہ عجیب وصف تھا کہ سنجیدگی اور متانت بیٹھے بیٹھے ظرافت پر غالب آجاتی تھی اور چہرے پر یکایک غم آمیز اثرات نظر آتے تھے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ جیسے کوئی دردانگیز خیال دفعتہً دل میں آگیا ہے۔ یہ رنگ اُن کے اشعار میں بہ کثرت پایا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شاعر کے کلام میں اثر گدازِ دل سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ غالب کا یہ شعر اس خیال کی ترجمانی کرتا ہے ؎

حُسنِ فروغِ شمعِ سُخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دِل گداختہ پیدا کرے کوئی

یہ نظریہ اقبال کے اس مصرعہ میں اس سے بھی بلند مقام پر پہنچ گیا ہے۔ ؏

عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہردم باوضُو رہنا

اقبال کے نزدیک شاعری میں غم کا عنصر شامل ہونا مشرقی شاعری کو مغربی شاعری سے ممیز کرنے والی صفت ہے۔ اُنھوں نے کیا خُوب کہا ہے ؎

پیرِ مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اِس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

یہی فرق مشرق اور مغرب کے اور فنون کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے اور خاص کر دونو کی موسیقی میں زیادہ واضح ہے۔ مغربی موسیقی جذبات طرب کو اُبھارنے کے لئے زیادہ موثر ہے اور مشرقی موسیقی میں عموماً جذباتِ غم کی تحریک زیادہ ہے۔ شعر سے رغبت کے ساتھ اقبال کو موسیقی کا بھی بہت شوق تھا۔ ان کو علم موسیقی سے گہری واقفیت پیدا کرنے کا تو موقع نہیں ملا مگر اُن کے کان موسیقی کی اچھی شناخت رکھتے تھے اور کوئی گاتا ہو تو وہ اُس سے ایسا لطف اُٹھاتے تھے جیسے کوئی ماہرِ فن اُٹھائے۔ قدرت نے خود انہیں بھی اچھا گلا عطا کیا تھا۔ اس لئے کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کی صحبت میں اپنا کلام ترنّم سے پڑھتے تھے۔ جس سے اشعار کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔ وہ ہر بحر کے لئے ایسی موزوں لے چُن لیتے تھے کہ سُننے والے مسحور ہو جاتے۔ اِس ترنّم کے وقت اُن پر اکثر غم کی حالت طاری ہوتی تھی اور سُننے والے بھی اس سے اثر پذیر ہونے سے بچ نہیں سکتے تھے۔ جب اُنہوں نے بڑے مجمعوں اور قومی جلسوں میں شریک ہونا شروع کیا تو پہلے اپنا کلام تحت اللفظ سناتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ لوگوں کو خبر ہو گئی کہ وہ خوش آہنگ بھی ہیں، تو فرمائشیں ہونے لگیں، کہ لے سے پڑھیں۔ دوستوں کے کہنے سُننے سے وہ مان گئے۔ پھر تو یہی چرچا ہو گیا جب کبھی وہ تحت اللفظ پڑھنا چاہیں، لوگ انہیں ترنّم پر مجبور کر دیں۔

لاہور کی مشہور تعلیمی انجمن "حمایت اسلام" کے سالانہ اجلاس اکثر ان کے کلام سے مستفید ہوتے تھے۔ پہلے پہل جب اُن کا کلام ترنّم سے وہاں سُنا گیا تو کئی موزوں طبع طلبا اور بعض دُوسرے شعرا کو شوق ہوا کہ وہ اُن کے طرزِ ترنّم کا تتبع کریں۔ اب جسے دیکھو وہ اپنا کلام اسی طرز سے پڑھ کر سُنا رہا ہے۔ خواجہ دل محمد ایم۔ اے جو اب اسلامیہ کالج میں ریاضیات کے پروفیسر ہیں اور شاعری میں بھی نام پیدا کر چکے ہیں۔ اُس وقت طالب علم تھے

اور اقبال کی آواز کا نمونہ پیش کرنے میں بہت کامیاب سمجھے جاتے تھے۔ اب بھی اکثر مجالس میں اُن کی لے سُننے میں آتی ہے۔ مگر اُس میں وہ ابتدائی رنگ باقی نہیں۔

اُن دنوں دہلی کے شاہی خاندان کے ایک نامور فرد مرزا ارشد گورگانی مرحوم زندہ تھے اور فیروز پور کے سرکاری مدرسے میں فارسی پڑھانے پر مامور تھے۔ وہ بھی انجمن کے سالانہ جلسوں میں اپنی قومی نظمیں سُنایا کرتے تھے۔ جو بہت مقبول ہوتی تھیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ اُنہوں نے اقبال کی روز افزوں قبولیت کو دیکھ کر محسوس کیا کہ اقبال کی خوش آہنگی اس کی نظم کو پَر لگا رہی ہے۔ اور اپنی ایک نظم میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے یہ مصرعہ لکھا ؏ اُس

نظمِ اقبالی نے ہر اِک کو گویّا کر دیا

یہ بات تو درُست تھی کہ بہت سے لوگ اقبال کو دیکھ کر ترنم پر آمادہ ہو گئے تھے۔ مگر اس کی قبولیت کی اصل وجوہ اور تھیں جو اُس وقت کے کلام میں بھی موجود تھیں اور بعد کو زیادہ پُختہ ہو گئیں۔

انجمن کا ایک اجلاس جس میں اقبال نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" اپنے اندازِ خاص میں پڑھی بہت لوگوں کو یاد ہو گا۔ جب "کیفِ غم" کا سماں جلسے پر چھا گیا تھا۔ اُن کے بہت سے مدّاح پھولوں سے جھولیاں بھر کر لاتے تھے۔ اور جب وہ پڑھ رہے تھے تو اُن پر پھول برسا رہے تھے۔ اُس وقت کی ایک اور بات خاص طور پر قابلِ دید تھی۔ کہ اقبال کا معمر باپ اس نظم کے سُننے والوں میں موجود تھا۔ باپ کی آنکھوں میں بیٹے کی کامیابی دیکھ کر خُوشی کے آنسو تھے۔ مگر لبوں پر تاثیرِ کلام سے وہی علاماتِ غم تھیں۔ جو بیٹے کے چہرے پر تھیں۔ درحقیقت یہ خصوصیت بیٹے نے باپ سے ورثے میں پائی تھی۔ اقبال کے والد ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ مگر ان کا رنگِ تصوف ایسا نہ تھا کہ ان کو زندگی کے روزمرہ فرائض سے بے پروا کر دے۔ ساری عمر اپنی دس اُنگلیوں کی کمائی سے روزی کھائی۔ "دل بہ یار و دست بہ کار" پر اُن کا عمل تھا۔ دل خُدا کی طرف اور ہاتھ کام پر لگے رہتے تھے۔

ایک عرصہ تک اقبال اپنی نظمیں ترنّم سے پڑھنے کے بعد فرمائشوں کی کثرت سے تنگ آ گئے اور انہوں نے یہ اصول بنا لیا کہ کسی بڑے مجمع میں ترنّم سے نہیں پڑھیں گے۔ بہت سے شائقین کو سخت مایوسی ہوئی مگر مرحوم جب کوئی ایسا فیصلہ کر لیتے تھے اس پر قائم رہتے تھے۔ اس لئے ان کی وفات سے برسوں پہلے یہ معمول ہو گیا تھا کہ کسی جلسے میں اگر اپنا کلام پڑھیں تو تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ اور دوستوں میں بیٹھے ہوتے بھی ترنّم پر بمشکل مائل ہوتے تھے۔ آخر میں اُنہوں نے خاص صحبتوں میں بھی ترنّم سے پڑھنا بند کر دیا تھا۔ اس عرصہ میں ایک دفعہ ایسا اتّفاق ہوا کہ مجھے اور دو اور دوستوں کو اُن کی نو لَے دردانگیز سُننے کا موقعہ مِلا۔ وہ آواز اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے مجھے رہ رہ کر افسوس آتا ہے کہ جس زمانے میں اقبال لَے سے پڑھتے تھے۔ اُس وقت آواز کے ریکارڈ بنانے کا عام رواج نہ تھا اور کسی کو خیال نہ آیا کہ اُس کے پڑھنے کی بے نظیر طرز کو مستقل طور پر مقیّد کر لیا جاتا۔ کیونکہ ایک خاص اثر اُن کی آواز میں تھا جو سُننے سے تعلق رکھتا تھا اور لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔

جس موقعہ کا ذکر مَیں نے کیا ہے۔ اِس کی تفصیل دلچسپ ہے۔ مَیں نے دیرینہ اور بے تکلّف دوستی کی بنا پر وہ جسارت کی۔ جس سے اقبال اپنا کلام اپنے خاص انداز میں سُنانے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۹۳۴ء میں سید سر عبدالرؤف جو لاہور کی ہائیکورٹ کی ججی سے پنشن پا کر الٰہ آباد چلے گئے تھے۔ احباب سے مِلنے کے لئے لاہور آئے۔ جسٹس سید آغا حیدر صاحب کے ہاں ٹھہرے۔ جب وہ لاہور میں تھے تو میرے اور اقبال کے اُن سے بہت مراسم تھے۔ ایک دن سید آغا حیدر صاحب نے مجھے اپنے ہاں کھانے پر بلایا۔ کھانے کے بعد اقبال کی باتیں شروع ہوئیں تو سر عبدالرؤف نے کہا کہ میں نے سُنا ہے کہ اقبال اپنی نظموں کو بڑے مؤثر انداز سے پڑھتا ہے۔ مگر افسوس کہ میں اتنے برس لاہور میں رہا۔ اور اقبال سے ملاقات بھی رہی مگر مجھے ہمّت نہ ہوئی کہ میں فرمائش کرتا کہ اپنا کلام لَے سے پڑھ کر مجھے سُنائیں۔ آغا صاحب نے کہا کہ میں اکثر اقبال سے مِلنے جاتا ہوں مگر افسوس کہ آپ ایسے وقت میں لاہور آئے، جب اقبال نے

اپنے پڑھنے کا انداز بدل دیا ہے۔ دونوں نے مجھ سے کہا کہ تم اقبال کے پرانے دوست ہو۔ کوئی طریق بتاؤ جس سے ہم اُن کا کلام اُن کے پرانے انداز سے سُن سکیں۔ میں نے کہا کوشش کروں گا۔ گو کامیابی یقینی نہیں کہی جا سکتی۔ تجویز یہ ہوئی کہ اقبال کو اور مجھے پھر کسی دن کھانے پر بلائیں مگر کسی اور کو نہ بلائیں اور کھانے کے بعد سید عبدالرؤف اقبال سے کہیں۔ اقبال اُن کا ادب کرتے ہیں۔ شاید اُن کی فرمائش کو نہ ٹالیں۔ اس قرارداد کے مطابق ہم چاروں ایک شب جمع ہوئے، میں جانتا تھا کہ سید عبدالرؤف کے کہنے پر اقبال صاف انکار تو نہیں کرینگے مگر غالباً یہ کہیں گے کہ مجھے اب اپنا کلام یاد نہیں رہتا۔ اور کوئی اشعار یاد بھی ہوں تو مسلسل یاد نہیں۔ اس کا علاج میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ میں گھر سے چلتے وقت اُن کی اردو فارسی کتابیں اپنے ساتھ ایک کاغذ میں لپیٹ کر لے گیا۔ تاکہ یہ عذر پیش ہو، تو میں کتابیں پیش کر دوں۔ جب ہم سب کھانے سے فارغ ہوئے اور دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھے تو سید عبدالرؤف نے بہت اچھے لفظوں میں اپنی آرزو بیان کی۔ اور کہا کہ مجھے اس لطف سے محروم نہ رکھیئے، جو آپ کے اور دوست پہلے اُٹھا چکے ہیں اور یہ بھی کہا کہ میں بوڑھا آدمی ہوں معلوم نہیں پھر یہاں آؤں یا نہ آؤں۔ آپ سے یہ میری آخری درخواست ہے۔ اس کا اقبال پر اچھا اثر ہوا۔ مگر انہوں نے وہی عذر پیش کیا جس کی مجھے توقع تھی۔ میں اُٹھ کر وہ کتابیں لے آیا اور اُن کے سامنے رکھ دیں۔ اب انہیں انکار کا راستہ نہ رہا۔ اور طبیعت بھی کچھ مائل ہو گئی۔ انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔ اُن دونوں ججوں کے لئے تو اُن کی خوش نوائی ایک نئی چیز تھی میں جو پہلے سُن چکا تھا۔ میرے لئے بھی ایک گئی ہوئی نعمت واپس آئی۔ ہم اس طرح جھوم جھوم کر سُننے لگے کہ اقبال کو بھی مدت کے بعد اس طرح پڑھنے کا مزا آگیا اور اُن کی طبیعت کی وہ خصوصیت بھی اپنا رنگ لائی۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے، اور ہم تینوں کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ پڑھتے پڑھتے اُن کے آنسو نکلے۔ پھر ہم کیا پتھر تھے کہ ہمارے آنسو تھمے رہتے۔ رات کے کوئی دس بجے تھے۔ جب اقبال نے پڑھنا شروع کیا

آدھی رات ہو گئی، تو ہم سب کو پتہ چلا کہ اتنی دیر ہو گئی ہے۔ بادلِ نخواستہ یہ پُر کیف صحبت ختم کرنی پڑی۔ دونو سید بہت ممنون ہوئے۔ اقبال کو اُن کی دوستی کا بھی پاس تھا اور سیادت کا بھی۔ اقبال کو بارگاہ رسالتؐ سے ایسی عقیدت تھی کہ وہ ہر سید کا احترام کرتے تھے۔ جب ہم دونوں وہاں سے چلے۔ تو اقبال نے شکایت کی کہ تم نے آج بُری طرح مُدت کا بندھا ہوا معمول مجھ سے ترک کرا دیا۔ میں نے کہا کہ سید عبدالرؤف کا دلی شوق ایسا تھا کہ انہیں محروم رکھنا ظلم تھا۔ اگر یہ بات آپ کے خلافِ طبع ہوئی ہے تو مجھے معاف کریں۔ اقبال نے کہا میں بھی اسی خیال سے پڑھنے پر آمادہ ہو گیا مگر تمہیں اس شرط سے معافی ملتی ہے کہ کل پھر یا آئندہ مجھے ایسی فرمائش نہ ہو۔ کل کی تاکید اسلئے کی، کہ یہ قرار پایا تھا کہ دُوسرے دن شام کو دونو سید صاحبان نے پھر فرمائش کی۔ مجھے اُن کو بتانا پڑا کہ میرے اور اقبال کے درمیان جو معاہدہ ہو چکا ہے اُس کا پابند ہوں اور درخواست میں شریک نہیں ہو سکتا۔ حیف کہ کچھ عرصہ بعد گلے کی بیماری کی وجہ سے اُس آواز کو صدمہ پہنچا کہ مرحوم اپنی عُمر کے آخری سالوں میں معمولی بات چیت بھی بہت دھیمی آواز سے کہہ سکتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں جب میں لاہور سے روانۂ انگلستان ہوا تو اقبال بیمار تھے۔ اسی بیماری کی وجہ سے وہ آکسفورڈ نہ آ سکے۔ جہاں اُنہیں لیکچر دینے کے لئے بُلایا گیا تھا۔ اسی زمانہ میں ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کو جو اُن کے خاص قدردانوں میں تھے خیال آیا کہ اُن کا معالجہ ہونا چاہیئے۔ انہیں اپنے ہاں بُلا کر مہمان رکھا اور علاج بھی کرایا جس سے قدرے افاقہ ہوا اور گفتگو میں کچھ آسانی پیدا ہو گئی مگر گلا پُورا درست نہ ہو سکا۔ میں ۱۹۳۷ء میں چند ماہ کی رُخصت لے کر لاہور گیا تھا۔ غنیمت ہے کہ مرحوم سے دو آخری مُلاقاتیں نصیب ہو گئیں۔ ایک دن گیا تو وہ علیل تھے اور پلنگ پر لیٹے ہوتے تھے۔ اُن کے پاس چند نوجوان طلبا اور دو ایک دوست بیٹھے تھے۔ لیٹے لیٹے مجھے گلے لگایا اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس کے چند روز بعد صحت کچھ بہتر ہوئی تو مجھے دوپہر کے کھانے پر بُلایا اور میرے ساتھ کھانا کھایا۔ دو اور دوست بھی

اس دعوت میں شریک تھے۔ اُس دِن مزاج شگفتہ تھا اور کئی باتوں میں پُرانے زمانے کی جھلک نظر آتی تھی۔ مگر کیا معلوم تھا کہ میں انہیں آخری دفعہ دیکھ رہا ہوں۔ اور اُن کی دلچسپ باتیں آخری بار سُن رہا ہوں۔ ہم کیفِ غم" کے لئے اُن کی آواز تو اب نہیں سُن سکتے مگر اُن کا کلام اس سے لبریز ہے اور اس کیف میں جوشِ زندگی ملا ہُوا ہے۔

رشید احمد صدیقی

حضرت علامہ اقبال

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم!
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

بڑی گرمی پڑ رہی تھی۔ دُور دراز کے سفر سے واپس آ رہا تھا۔ علی گڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترا ہی تھا کہ ایک عزیز نے کہا، ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے، بہت تھوڑی دیر کے لئے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے پلیٹ فارم کی ہر چیز موجود تو ہے لیکن اس کی نہ کوئی آواز ہے اور نہ اس میں کوئی حرکت۔ یہ بات صرف ایک آن کے لئے تھی۔ آسیائے گردشِ ایام ایک آن کے لئے رُک سی گئی لیکن فوراً ہی رواں ہو گئی۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ رواں دواں نظر آنے لگی۔ مکان واپس آیا، نہ نہانا اچھا معلوم ہوا نہ کھانے کا جی ہوا۔ جیسے نفس اپنے مطالبات چھوڑ بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے کمرہ بند کر کے لیٹ رہا۔

ذہن نے ماضی کے اوراق ایک ایک کر کے پلٹنے شروع کر دیئے۔ طفلی کا زمانہ یاد آیا۔ جب اقبال کے اشعار چھٹپنے کی دوستی کی طرح مزیدار اور جاں نثار معلوم ہوتے تھے اور خود اقبال کا یہ تصوّر تھا کہ وہ جو اشعار کہتے ہیں اُنہی میں رہتے بستے ہیں۔ اقبال کی صورت وہی ہو گی جو میرے اپنے تصورات کے عمل سے پیدا ہوئی تھی۔ بہت اچھی سی،

بہت چاہی جانے والی جیسی جادوگروں جیسی، کچھ عجیب سی!

یہ بات بھی کچھ کم عجیب نہیں کہ اب بھی جبکہ ادراک و شعور ایک حد تک مکمل ہو چکا ہے اچھے اشعار کا مجھ پر وہی اثر ہوتا ہے۔ جو بچپن میں ہوتا تھا۔ اچھا شعر ذہن میں آیا نہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے معلوم نہیں کیا چیز، تصورات کو کہاں کہاں لئے پھرتی ہے۔ وہی افسانہ و افسوں، وہی روشنی و تاریکی، لذت و اذیت، خوف و امید جو بچپن میں پیدا ہوتے اب بھی بیدار ہو جاتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں لئے پھرتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں۔

۱۹۳۵ء میں میں مرحوم سے ملنے لاہور گیا تھا۔ اقبال کے کلام میں جو باتیں بچپن کے تجسس میں دلچسپ معلوم ہوتی تھیں اب تجزیہ و تجربہ کی زد میں ناقابل فہم معلوم ہونے لگی تھیں۔ میں صرف پڑھنے اور اپنے طور پر لطف لینے کی منزل سے گذر چکا تھا۔ اب پڑھانے کو پُرفکر و پُرلطف بنانے کا فرض عائد ہوتا تھا۔ شعر میں شاعر غالب نظر آتا تھا اور ہر دلآویزی تاثرات پر ہی نہیں بلکہ فکر و تجربہ کی صحت و صداقت پر منحصر معلوم ہوتی تھی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں میں نے محسوس کیا کہ خود شاعر کو دیکھا جائے اس کے اشعار ہی سے نہیں بلکہ اس کی شخصیت سے بھی رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاعر اپنی ترنگ میں جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے۔ یہ تو نسبتاً آسان ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کی ترنگ یا تذبذب سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے وہ اپنے ہی جذبات کی ترجمانی کر سکتا ہے یا دوسروں کی تشفی بھی۔

غالباً دن کے نو دس بجے ہوں گے میں مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا۔ کپڑے پہن کر کسی مقدمہ کی پیروی میں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ سیاہ عقدہ (بو) باندھتے، کالر درست کرتے ہوئے برآمد ہوئے، گٹھا ہوا جسم، چوڑی چکلی ہڈیاں، مردانہ انداز، آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع کسی قدر تورانیوں جیسی، سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ مسکرانے میں آنکھوں کے گوشوں میں جھریاں پڑتی تھیں جن سے ذکاوت و ملاطفت کا اظہار ہوتا تھا۔ بڑی خوشدلی

اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر دیر تک ہاتھ میں لئے رہے، بھاری بھر کم لہجے میں میں بولے "آپ ہیں جی صدیقی صاحب!" میں اقرار کرتا ہوں کہ مرحوم کا ڈیل ڈول اور اُن کا حُلیہ دیکھ کر متحیّر اور مرحوم کے اندازِ تخاطب اور لہجہ سے کسی قدر دل گرفتہ ہوا۔ اتنے میں نوکر کو آواز دی اور پنجابی میں قلم لانے کو کہا۔ قلم کا تلفّظ سُن کر میں گھبرا اُٹھا۔ علی گڑھ میں پنجابی تلفّظ سے آشنا ہو چکا تھا لیکن ذہن میں معلوم نہیں، کیوں یہ بات جم گئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال اس طرح کی معذوریوں سے مستثنیٰ ہوں گے۔

لیکن میں کیا بتاؤں کہ اپنی پہلے سے بنائی ہوئی بہشت کو یوں درہم برہم ہوتے دیکھ کر مجھ پر جو اثر جس درجہ ہونا چاہیئے تھا وہ نہ ہوا۔ مرحوم کچھ اس انداز سے ملے اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ خود ان کے تلفّظ میں کچھ ایسا خلوص اور ان کے ہاتھ ملانے میں وہ شفقت اور ناقابلِ بیان مروّت و مرحمت تھی کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا، جیسے ایک نیا تجربہ بڑا تجربہ حاصل ہوا۔ جس کا میں مستحق ضرور تھا گو اس کا منتظر نہ تھا۔ جیسے مجھے ایک نئی حِس تفویض ہوئی جس کو چھین لیا جاتا تو میں کوئی بڑی کمی محسوس کرنے لگتا۔

تھوڑی دیر کے لئے کمرہ میں آبیٹھے۔ علی گڑھ کا حال دریافت فرماتے رہے۔ آواز بھاری تھی لیکن بلند ہونے کے ساتھ ساتھ زور اور صفائی بڑھتی جاتی۔ میں نے اس خود اعتمادی کے ساتھ جس میں عالمانہ اور والہانہ دونوں انداز متوازی و متوازن ہوں، کم لوگوں کو گفتگو کرتے سُنا ہے۔ یہی بات مجھے ذاکر صاحب میں ملتی ہے، علامہ مرحوم کی باتیں سُنیئے۔ بشرطیکہ وہ بات کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو فوراً محسوس ہوگا کہ ان کی باتیں صرف زبان سے نہیں ادا ہوتی تھیں اور وہ صرف اپنے الفاظ اور فقروں پر نہیں بھروسا کرتے تھے بلکہ وہ باتیں کہیں دُور سے اور بڑی گہرائی سے آتی تھی۔ اُن کی گفتگو حشو زوائد سے قطعاً پاک، ہوتی تھی کہ اُن کی اتنی واضح اور جامع ہوتی تھی کہ وضاحت و جامعیت بجائے خود صنائع بدائع

معلوم ہونے لگتی تھی۔ گفتگو کرنے میں اُن کی آنکھیں نصف سے بھی کچھ کم کھُلی رہتی تھیں۔ البتہ جب گفتگو میں گرمی اور روانی پیدا ہو جاتی تھی تو آنکھیں پوری کھُل جاتی تھیں اور چہرہ پر گرمی و روشنی جھلکنے لگتی تھی۔

اُسی دن شام کو دوسری ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے اُس دن ایک نوجوان شاعر آ گئے جو کچھ دیر تک اپنا فارسی کلام سُناتے رہے۔ اُن کی شاعری اور لہجہ دونوں پر جدید ایرانی رنگ غالب تھا کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔ نوجوان کی گفتگو میں تعلّی زیادہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی مسلسل خاموشی کسی قدر بیزاری میں تبدیل ہونے لگی تھی کچھ دیر تو بیٹھے رہے اُس کے بعد اُٹھ کھڑے ہوئے۔ صحبت ختم ہو گئی۔ صرف دو چار اصحاب بیٹھے رہ گئے، اندر سے دیر میں برآمد ہوتے چہرہ پر اب بھی انقباض طاری تھا۔ تھوڑی دیر تک حُقّہ کا ٹھہر ٹھہر کر کش لیتے رہے۔ اس کے بعد فرمایا نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے اُس کے بعد کچھ اور لوگ آ گئے۔ اب طبیعت بحال ہو گئی۔ ہر ایک سے پرسشِ حال کرتے وہ بھی اس طور پر نہیں کہ موسم اچھا ہے یا بُرا۔ رسمی باتیں تو وہ کرنا ہی نہیں جانتے تھے۔ ہر ملنے والے سے اُس کے مشاغل اور اُس کا مقصود دُکھ سُکھ سُنتے۔ لوگ مرحوم کے حلقہ میں معتقدین کی حیثیت سے ڈرے سہمے ہوتے نہیں بیٹھتے تھے بلکہ محبت اور بے تکلفی کی فضا ہوتی تھی۔ ہر شخص مرحوم کی باتیں بڑی گہری توجہ سے سُنتا اور خود بھی بے تکلفی سے اپنی سُناتا۔

دُوسرے دن پھر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ آج کہیں جانا نہ تھا۔ اس لئے بڑے اطمینان اور بے تکلفی سے باتیں شروع کیں اُس زمانہ میں اقبال کے نظریۂ فوق البشر کا بڑا چرچا تھا۔ بعض باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں اس لئے اس پر میں نے خاص طور پر اپنے شبہات کا اظہار کیا مرحوم نے بڑے ہی عالمانہ انداز سے اور انتہائی خوش دلی اور اعتمادی کے ساتھ جو اُن کی سیرت کا بڑا ہی گرانقدر پہلو تھا، اظہارِ خیال کرنا شروع کیا مجھے اس وقت جو چیز سب سے عزیز اور خوش آئند معلوم ہُوئی وہ یہ تھی کہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو مرحوم اس خُوبی سے

واضح کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا جیسے متنازعہ فیہ مسئلہ میں کوئی کشیدگی تھی ہی نہیں۔ عالمانہ و مخلصانہ نقطۂ نظر کی یہ کرامت ہے کہ ناگہانی پیچیدگیوں اور نامعلوم مسائل کا حل بڑی آسانی سے سامنے آجاتا ہے۔ اسی صحبت میں عورتوں کا درجہ، فوق البشر، بعثتِ نبوی کا وقت اور مقام فقۂ اسلامی میں اجتہاد کے مسائل پر تقریباً تمام دن گفتگو فرماتے رہے۔ میں نے اس بحث کا خلاصہ اپنے بعض گذشتہ مضامین میں جہاں تہاں کیا ہے لیکن ایک بات جس کا اعادہ میں بار بار کرتا رہا وہ یہ ہے کہ مرحوم کو صرف شاعر سمجھ لینا یا یہ کہ انکے خیالات یا تصورات تمام کے تمام اُن کے کلام میں مقید ہو چکے ہیں بڑی غلطی ہے مرحوم کی فکر و نظر کا بہت کم حصہ اُن کے کلام میں منتقل ہوا ہے وہ بہت کچھ جانتے تھے اور یہی نہیں بلکہ اکثر کچھ ایسا بھی محسوس ہوا جیسے بعض بالکل ہی نئی باتیں دورانِ گفتگو میں اُن پر کسی کوشش کے بغیر منکشف ہو گئیں۔

فقۂ اسلامی میں اجتہاد کے مسئلہ پر وہ انگریزی میں بہت کچھ لکھ چکے تھے، مسوّدہ بھی ٹائپ ہو چکا تھا اور کافی ضخیم تھا۔ فرمایا اِن مسائل پر میں بعض مستند عُلما سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے نزدیک کون لوگ ایسے ہیں جن سے رجوع کرنا سُود مند ہو گا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس کوچہ سے نابلد ہوں اس کے علاوہ میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بیشتر علمائے علم دین سے تو پورے طور پر واقف ہوتے ہیں لیکن موجودہ عہد کے اکثر مسائل کچھ ایسے پیچ در پیچ ہیں اور ماہرین فن ہی کے پیدا کئے ہوتے ہیں۔ اس میں اُن پر ہمارے علمائے کرام مناسب رائے قائم کرنے سے معذور ہیں۔ جب تک متنازع فیہ مسئلہ کی ماہیت نہ معلوم ہو اُس وقت تک اُن پر صحیح حکم لگایا کیسے جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے سامنے مسائل کی جو نوعیت ہے اُس پر اگر مولانا ابو الکلام آزاد صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی صاحب سے رجوع کیا جائے تو بہتر ہو گا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ مرحوم نے یہ فرمایا کہ وہ اُن دونوں بزرگوں سے تبادلۂ خیالات کر رہے ہیں یا کریں گے اتنا البتہ یاد ہے کہ دونوں کے بارہ میں مرحوم نے اچھے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ خطوط کا جواب جلد سے جلد دیتے اور جب تک بینائی نے ساتھ دیا ہر خط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجتے۔ ان خطوط میں رسمی تکلفات کو بالکل دخل نہ تھا اور ہر بات کا جواب نہایت واضح اور جامع ہوتا۔ وہ مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک مسئلہ میں بھی بڑی صاف گوئی سے کام لیتے۔ بڑے آدمیوں کی طرح اُن میں یہ کمزوری نہ تھی کہ جوابات ایسے ہوں کہ موقع بہ موقع کترا کے نکل جانے کا امکان باقی رہے۔ اُن کو اپنے جوابات پر بڑا اعتماد ہوتا۔ اس کا سبب میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ وہ فلسفی، مفکر اور مقنن ہونے کے علاوہ بڑے اچھے وکیل (بیرسٹر) بھی تھے۔ وہ جو کچھ کہتے یا لکھتے اُس میں جذبات کو اتنا نہیں جتنا کہ فکر و تدبر کو دخل ہوتا چنانچہ اُن کی تحریر و تقریر دونوں میں ایک اچھے قانون دان اور اچھی وکالت کرنے والے کا منطقی ربط ہوتا۔

اُن کی شاعری کا امتیازی پہلو بھی یہی تھا۔ جس طرح مسائل کی توضیح میں تدبر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی تدبر حکیم یا فلسفی کی بڑائی اور کامیابی کی دلیل ہے۔ ٹھیک اسی طور پر جذبات کا احتساب کرنا اور اُس کو مناسب موزوں اسالیب میں ڈھالنا شاعر کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اقبال کی شاعری خود شاعری کی معراج ہے۔ اُنھوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دے دیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا۔ دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ اور ایقان دوش بدوش کارفرما ملتے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی اُن کا کلام پڑھ کر ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اقبال کہاں اور کہاں تک حکیم اور کہاں اور کس حد تک شاعر ہیں بلکہ حکیم اور شاعر (البتہ کہیں حکیم پہلے اور شاعر بعد میں اور کبھی اس کے خلاف۔ لیکن بالآخر دونوں) ایک دوسرے میں ممزوج یا ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ اقبال نے فطری ملکات کو بشری ریاضتوں اور ماورائی بصیرتوں سے ایک نئی حسین اور لازوال صورت یا نوعیت بخشی۔ شاعر کا طبعاً شاعر یا مفکر ہونا میرے نزدیک کوئی بہت بڑی نعمت نہیں ہے نعمت تو وہ توفیق ہے جو فطری استعداد کو بشری نعمت بناتی ہے

اور غالباً یہی توفیق وہ توفیقِ الٰہی ہے جو انسانیت کو نہ صرف انسانوں کے ہاتھ ہلاک ہونے سے بچاتی رہتی ہے۔ بلکہ انسانوں ہی کے ہاتھ انسانیّت کو فوزِ عظیم پر فائز کرتی ہے۔

علی گڑھ، ایک دن دوستوں کی ایک علمی صحبت میں حافظؔ کے مشہور شعر ہے

صد بادِ صبا ایں جا بہ سلسلہ می رقصد
ایں است حریف اے دل تا باد پیمائی

پر گفتگو ہونے لگی۔ اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہر ایک نے خوب خوب مُوشگافیاں کیں، بالآخر یہ طے ہوا کہ ڈاکٹر اقبالؒ سے رجوع کیا جائے چنانچہ مرحوم سے استصواب رائے کیا گیا مرحوم نے فوراً ہی جواب لکھ بھیجا۔ ہر رائے پر محاکمہ کیا اور آخر میں لکھا کہ شاعر کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے مطالب کو ریاضیات کے اصول مدِّنظر رکھ کر پیش کرے اس لئے شعر کے مطالب جداگانہ بھی ہو سکتے ہیں البتّہ متضاد نہ ہوں، آگے چل کر لکھا تھا کہ کبھی کبھی شاعر اپنی واردات کا پُورے طور پر خود استقصا نہیں کر سکتا ایسی حالت میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ واقعہ بیان کرنے کے بجائے ایسی فضا کی طرف رہبری کر دے جس میں اس واقعہ کے پیش آنے کا قوی امکان ہو اور جہاں ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق اپنے مطلب کی چیز ڈھونڈ لے۔ آخر میں لکھا تھا کہ شاعر کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو منطق سے نہیں بلکہ ان رمُوز سے اپنا لے جو اس کے شعر میں دُھوپ چھاؤں کی کیفیت پیدا کر رہے ہوں، شاعرانہ رموز نہ منطقیانہ رمُوز ہوتے ہیں نہ فلسفیانہ، وہ شاعرانہ ہی رموز ہوتے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں میں بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر صاحب انہی دنوں یاد نہیں آتا کس سلسلہ میں علی گڑھ تشریف لائے تھے، ایک دن صُبح مکان تشریف لائے۔ اُس روز مجھے خاص طور پر بڑی تکلیف تھی مُشکل سے باہر آیا۔ میں نے بڑی مایُوسی کے ساتھ رُک رُک کر کہا ڈاکٹر صاحب کاش میں اِتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دُوسری جگہ قیام کرنے کی مایُوسی اور شرمندگی اُٹھانی پڑتی

ہاتے اُن کا وہ چونک کر لیکن فوراً ہی مُسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمانا، نہیں جی صدیقی صاحب کوئی بات نہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے گا، اچھے ہو جاؤ گے، پھر لاہور آنا، مایوس کیوں ہوتے ہو، مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے اچھے مسلمانوں کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیئے۔

اس کے بعد دیر تک اس انداز سے گفتگو کرتے رہے کہ میں ان کی موجودگی میں یہ بھول گیا کہ بیمار بھی تھا۔ اُس وقت میرے ذہن میں یہ بات آ نہیں سکتی تھی کہ میں تو اچھا ہو جاؤنگا اور ڈاکٹر صاحب اس جہان سے اٹھ جائیں گے۔ اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس تکلیف میں رہ کر عالمِ بقا کو سدھارے، کاش کسی وقت میں حاضر خدمت ہو کر ان کے لئے وہ کر سکتا جو اُنہوں نے میرے لئے کیا تھا، پھر سوچتا ہوں ڈاکٹر صاحب بہت بڑے شخص تھے اُن کو مجھ جیسا معمولی شخص کیا تسکین یا تشفّی دے سکتا تھا۔ وہ خاصانِ بارگاہ سے تھے ان کا خدا سے خاص تعلق تھا۔ لیکن اس بات سے طبیعت مطمئن نہیں ہوتی۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ گو معجزہ کا زمانہ نہیں رہا لیکن محبّت و خلوص میں اب بھی بڑی کرامتیں پوشیدہ ہیں۔ دُوسروں کی وہ کونسی تکلیف ہے جس کو میں یا آپ محبّت سے کچھ اور نہیں تو تھوڑی دیر کے لئے زائل نہیں کر سکتے۔

زندگی کے آخری عہد میں مرحوم کا توسّل دربارِ بھوپال سے ہو گیا تھا اس تعلق کے پیدا کرنے میں سر راس مسعود مرحوم کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ اقبال کو جن مالی دقّتوں کا سامنا تھا اب اُن سے نجات ہو گئی تھی، دورِ آخر کی بیشتر مشہور نظمیں مرحوم نے بھوپال ہی میں لکھیں۔ بھوپال کا تنہا یہ کارنامہ میرے نزدیک ان کارناموں میں سے ہے جن کو آئندہ آنیوالی نسلیں کبھی فراموش نہ کر سکیں گی۔ اگر افراد کی مانند اداروں کو بھی کوئی معاد ہے تو اسی ایک نیک کام کے صلہ میں بھوپال کی نجاتِ اُخروی متیقّن ہے۔ اقبال کو غمِ روزگار سے نجات دلانا میرے نزدیک بہت بڑی سعادت ہے۔ چنانچہ اقبال کے بعض عقیدت مند

سر راس مسعود مرحوم اور نواب محمد حمید اللہ خاں بالقابہ کی اس فرض شناسی اور علم دوستی کو ان عزیز دگرامی ہستیوں کی اور بہت سی منزلتوں پر مافوق رکھتے ہیں۔ اگر انگریز قوم کے بارہ میں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ برطانوی سلطنت سے محروم ہونا پسند کرے گی لیکن شیکسپیئر کو چھوڑنا گوارا نہ کرے گی تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی گراں سے گراں قیمت پر اقبال سے جدا ہونا گوارا نہیں کریں گے۔

مرحوم کو سید راس مسعود مرحوم سے بڑی شیفتگی تھی۔ اسی طرح سر راس کو بھی اقبال سے بڑا شغف تھا۔ لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم سے جو عقیدت تھی اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت و آرام کا موصوفہ خیال رکھتی تھیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھوپال میں بڑے اصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کرا دیا تھا جو ہر صبح آدھ گھنٹہ تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سناتے یہ وہ زمانہ تھا۔ جب لیڈی موصوف کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی۔ مرحوم فرماتے تھے کہ ایام حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلام پاک سن لیا کرے تو بچہ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا ممکن ہے یہی خیال ہو جس کی بنا پر اقبال نے ارمغانِ حجاز میں دخترانِ ملت کو یوں مخاطب کیا ہے ؎

زشامِ ما برون آور سحر را به قرآن باز خوان اہلِ نظر را
تو می دانی کہ سوزِ قرأت تو دگر گون کرد تقدیرِ عمر را

مرحوم کا ملازم علی بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلام پاک سننے کے لئے فوراً آمادہ کرے۔ مرحوم خود بھی دیکھتے رہے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا رہتا ہے یا نہیں ایک دن کا واقعہ ہے مرحوم نے علی بخش کو آواز دی کہ قاری صاحب آئے ہوئے ہیں۔ لیڈی مسعود کہاں ہیں۔ علی بخش نے کسی قدر آزردہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا، قرآن کیا سنیں گی، وہ تو صبح ہی صبح باغ میں پھول کاٹنے چلی جاتی ہیں، وہاں سے فرصت ملے تو آئیں، میں کیا کروں مرحوم خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا صبر، علی بخش صبر، یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے! دین و دنیا میں توازن!

اہلِ نظر جانتے ہیں اقبال کی نظر کہاں تھی۔ میرے نزدیک تو اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا ہی ساجُھکاؤ انکی فکر و فرزانگی، شاعری و شخصیت اور ان کا مجموعہ انکی آفاقی بصیرت کا پورے طور پر ترجمان ہے۔ یہی وہی مقام ہے جہاں اقبال ہم سے آپ سے اور بہت سے دُوسرے لوگوں سے جو ہم سے بڑے ہیں منفرد ملتے ہیں اور جُدا ہو کر ان پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو درکنار ان کا تصور بھی دشوار ہوتا ہے۔

بے موقع نہ ہوگا اگر یہاں ایک واقعہ مولانا محمد علی مرحوم کا بھی بیان کر دیا جائے۔ مولانا تحریک خلافت کے سلسلہ میں یورپ جا رہے تھے۔ ایک الوداعی صحبت میں کسی صاحب نے مولانا سے سوال کیا، اور کیوں جناب راستہ میں دل بہلانے کی خاطر کوئی کتاب بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کیوں نہیں، دُوسرے صاحب نے پوچھا معاف فرمایئے گا کیا میں دریافت کر سکتا ہوں، کس کس قسم کی اور کونسی کتابیں ہیں۔ مرحوم نے فرمایا دو کتابیں کافی ہیں اور وہی میں نے رکھ لی ہیں۔ حاضرین ان کتابوں کا نام سُننے کے لئے سراپا اشتیاق بن گئے۔ مرحوم نے اپنے خاص انداز میں بتایا ایک تو کلام پاک ہے اور دُوسری دیوانِ داغ!

اسے محض ایک لطیفہ ہی کیوں نہ سمجھا جائے لیکن یہ بیان واقعہ ہو تب بھی میرے نزدیک اس سے مولانا کی پر تجمّل شخصیت کی دلربائی کچھ بڑھ ہی جاتی ہے یہاں بھی کسی طویل نفسیاتی مذاکرہ کو راہ دینا نہیں چاہتا۔ اصل مقصد دو عظیم المرتبت شخصیتوں کی ذہنی پرداخت و پرداخت کی طرف صرف اشارہ کرنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے لیڈی مسعود کے پہلے بچّہ کی شیر خوارگی میں وفات پا جانے پر رنجور ماں کو تسکین و تشفّی کا بڑا اچھا خط لکھا تھا اور آخر میں یہ شعر لکھا تھا ؎

در چمن بود و لیکن نتواں گفت کہ بود
آہ! ازاں غنچہ کہ بادِ سحر اورا نہ کشود

اس کے بعد نادرہ پیدا ہوئی تو ڈاکٹر اقبال بھوپال میں تھے اور لیڈی مسعود اندور

میں۔ نادرہ کی ولادت سے اقبال بے انتہا مسرور تھے اور اُس کو دیکھنے کے بے حد مُشتاق تھوڑے ہی دنوں بعد۔ لیڈی مسعود اطلاع دیئے بغیر بھوپال آگئیں۔ اتفاق سے سر راس مسعود اور سر اقبال دونوں یکجا تھے۔ سر راس مسعود نے فرطِ اشتیاق سے آگے بڑھ کر بچّی کو آغوش میں لینا چاہا۔ اقبال نے آواز دی۔ نہیں پہلا حق شاعر کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ ماں نے نادرہ کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں دے دیا۔

مجھے اکثر خیال آتا ہے کیا نادرہ بڑی ہو کر کبھی اس پر بھی غور کرے گی یا نہیں کہ وہ نہ صرف بڑے باپ کی بیٹی ہے بلکہ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھی اس کی نفسیاتی پرداخت کا اہتمام اپنے زمانہ میں اسلام کے سب سے بڑے اور برگزیدہ شاعر نے کیا تھا اور آغوشِ مادر سے سب سے پہلے براہِ راست وہ اسی شاعر کے آغوش میں آئی!

ڈاکٹر صاحب نے جاوید اور بانو کی تربیت و نگہداشت کے لئے ایک شریف جرمن خاتون کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ یہ خاتون میرے ایک عزیز دوست کی رشتہ دار ہیں اور کچھ عرصہ تک میری بیوی، بچّوں کے ساتھ گھر کے عزیز رکن کی حیثیت سے رہ سہہ چکی تھیں۔ میں نے ہی ڈاکٹر صاحب سے تحریک کی تھی کہ یہ خاتون بچّوں کی نگرانی و تربیت و تہذیب میں بہت مُفید ثابت ہوں گی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب سے کچھ عرصہ تک خط و کتابت ہوتی رہی۔ میں نہیں بتا سکتا کہ مرحوم ان بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے کتنے فکر مند تھے ان کی معاوضہ کی کمی بیشی پر مطلق اصرار نہ تھا۔ لیکن وہ خاتون کی سیرت و عقائد کی چھان بین میں اس درجہ کاوش کرتے تھے کہ بالآخر میں نے کسی قدر تھک کر ڈاکٹر صاحب کو لکھ دیا کہ آپ کا نقطۂ نظر میں پورے طور سے سمجھ چکا ہوں۔ مزید گفتگو سے کہیں بہتر یہ ہوگا کہ آپ امتحاناً انہیں دو ایک ہفتہ کے لئے اپنے ہاں بُلالیں اور ان کے انداز و اطوار کو نظر میں رکھیں۔ اس کے بعد فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ اُن کا رکھا جانا مناسب ہے یا نہیں!

ڈاکٹر صاحب اس تجویز کو مان گئے اور جرمن خاتون جن کو ہمارے ہاں کے چھوٹے بڑے

سب آپا جان کہا کرتے تھے لاہور پہنچ گئیں۔ ان کے پہنچنے کے بعد مرحوم کے جو خطوط آتے اِن میں ہر ایک میں ان خاتون کی شرافت و قابلیت، دیانت و امانت، محبّت و مروّت کا ذکر ہوتا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو ان پر اتنا اطمینان و بھروسہ ہوا کہ رحلت کے وقت مرحوم نے ان دونوں بچّوں اور سارے گھربار کو خاص طور پر ان کے سپُرد کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات پر بہت سے لوگوں نے ان جرمن خاتون کا بڑے اچھے الفاظ میں اپنے مضامین اور بیانات میں تذکرہ کیا۔

مرحوم کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد میں لاہور گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے جاوید اور بانو کو دیکھا۔ جاوید کسی قدر سیانا تھا ایک حد تک خاموش اور کم آمیز کھل کر ملنے یا بات کرنے میں بھی تکلف کرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مرحوم کو جاوید کس درجہ عزیز تھا اور وہ اس کو کیا دیکھنا چاہتے تھے اور جاوید ان کے کلام میں کہاں کہاں اور کس کس طرح جاری وساری تھا، لیکن میں نے کچھ ایسا محسُوس کیا کہ خود جاوید پر اس کا وہ اثر نہیں ہے جو ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن بانو! مشکل سے ۶، ۷ سال کی عمر، کیسی تندرست، چنچل، ذہین، خوب صورت، بھولی بھالی بچّی! ایسی لڑکی جو صرف ڈاکٹر اقبال کی لڑکی ہو سکتی تھی!!

جرمن خاتون نے بتایا کہ ڈاکٹر اقبال کی وفات کے بعد ایک رات بانو حسبِ معمول میری چارپائی پر لیٹی ہوئی باتیں کرتی اور خاموش ہو جاتی، پھر باتیں کرنے لگتی لیکن رہ رہ کر کسی ذہنی اُلجھن میں مبتلا ہو جاتی۔ میں نے پُوچھا، بانو آج کیا بات ہے تم اچھی اچھی باتیں نہیں کرتیں۔ بانو نے کہا، آپا جان، ابّا موجود تھے تو یہ چاند اور ستارے کتنے چمکدار اور اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اب یہ کیوں نہیں چمکتے!!

جرمن خاتون نے یہ بھی بتایا کہ خود مرحوم کو بانو سے عشق تھا، چنانچہ بالکل آخری زمانۂ حیات میں ڈاکٹر اقبال کا جی صرف بانو سے بہلتا اور بانو بھی مرحوم سے اس طور پر وابستہ ہو گئی تھی جیسے مرحوم اس کی ماں، اس کی ہمجولی اور اس کا کھلونا سب ہی کچھ تھے۔ اسی سلسلہ میں خاتون کا بیان ہے کہ جب مرض نے نازک صورت اختیار کر لی اور مرحوم پر ضعف کی وجہ

سے اکثر غفلت طاری ہو جاتی تو ڈاکٹروں نے مریض کے کمرہ میں بانو تک کا آنا بند کر دیا۔ ایک بار اتفاق ہوا کہ بانو نہیں معلوم کیسے ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں آگئی جہاں کوئی اور نہ تھا۔ میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ بانو ڈاکٹر اقبال کے سینہ پر بیٹھی ہوئی بے تکلف بات کئے جا رہی ہے۔ میں گھبرا اٹھی، سر اقبال کی بینائی تقریباً زائل ہو چکی تھی۔ میں نے دبے پاؤں قریب جا کر بانو کو بہلا کر جدا کرنا چاہا۔ سر اقبال بول بھی نہیں سکتے تھے۔ بڑی ہی نحیف آواز میں کچھ ایسا کہا اور ان کی تقریباً بند آنکھوں میں کچھ ایسی جنبش ہوئی جیسے وہ چاہتے تھے کہ بانو کو ذرا دیر کے لئے جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ بانو کے اس طرح موجود ہونے سے جیسے اُن پر ایک گونہ اطمینان سا طاری تھا اور زندگی کی ڈوبتی بجھتی ہوئی قندیل کو وہ اپنے جذبۂ امتنان و مسرت سے ایک لمحہ کے لئے اور اُبھارے اور روشن کئے ہوئے رکھنا چاہتے تھے۔

یہ خاتون اب بھی جب کبھی سر اقبال کا تذکرہ کرتی ہیں تو اُن کا گلا گلوگیر ہو جاتا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ میں نے ایسا مخلص اور شریف انسان نہ دیکھا۔ جب میں پہلے پہل پہنچی تو کھانے پر ڈاکٹر صاحب پورے کپڑے پہن کر آئے اور انہوں نے دسترخوان کے وہ آداب ملحوظ رکھے جو یورپ میں اونچے سے اونچے گھرانوں میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کو مجھ پر کچھ ایسا اعتماد ہوا کہ انہوں نے بڑی صفائی اور بڑے ہی لطف سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کو اس تکلف سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ صرف بنیائن اور تہمد پہنے کھانے پر چلے آتے۔ جب تکلیف اور ضعف زیادہ بڑھا تو کمرہ ہی میں کھانا کھا لیتے۔ ان میں بھروسا کرنے کا عجیب مادّہ تھا میری کسی تجویز کو انہوں نے کبھی رَد نہیں کیا اور گھر کے معاملات میں مطلق دخل نہیں دیا۔ وہ اپنے عزیزوں سے کہیں زیادہ میرا اعتبار کرتے تھے اور مجھے اس بات کا فخر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اکثر فرمایا کہ تمہارے ہونے سے مجھے گھر اور بچوں کی طرف سے ایسا اطمینان و آرام ہے جس کا میں بڑا متمنی تھا۔ اور جس کی مجھے بڑی ضرورت تھی۔

دوسرے دن ایک عزیز کے ساتھ مرحوم کے مزار پر حاضر ہوا شاہی مسجد کی پائیں

بائیں سمت اُس مردِ قلندر کو آسودۂ خاک پایا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ یہ اُس اقبال کی آرامگاہ ہے۔

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ جس نے

اور آدم کو سکھاتا ہے، آدابِ خداوندی

میں نے محسوس کیا کہ بادشاہی مسجد کی پُراسرار و پُروقار ضخامت و قدامت اور اس کی مخصوص فضا اور روایات ذہن و دماغ پر اسی درجہ اور اتنا جلد مستولی ہو جاتی ہیں کہ ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہونے کے قابل ہی نہیں رہ جاتا چنانچہ میرے دل میں بے اختیار اور بار بار یہی آیا کہ اقبالؒ کا مزار مستقل حیثیت سے کہیں اور ہونا چاہیئے تھا۔ جہاں اقبال کے تصور میں مزاحم ہونے والی کوئی اور چیز نہ ہوتی۔

اقبالؒ زندہ تھے تو اطمینان رہتا تھا کہ کوئی نہ کوئی موقع نکال کر اُن سے مل آؤں گا اور اس کا یقین تھا کہ اُن سے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور معلوم ہو گی جو میرے ذہن کی استعداد کو شگفتہ کرے گی اور دل کے ولولوں کو بڑھائے گی۔ ذہن کی کچھ اُلجھنیں تھیں جن کے بارے میں یقین تھا کہ ڈاکٹر اقبال اُنہیں سُلجھا دیں گے۔ کبھی محنت و مطالعہ سے بچنے کے لئے دل کو بہلا لیا کرتا کہ دماغ پاشی کیوں کی جائے۔ کسی دن ڈاکٹر اقبال سے جا کر اپنا اطمینان کر لوں گا۔

جس وقت وفات کی خبر ملی تو معلوم ہوا کہ وہ تمام ذہنی تصورات جن میں بعض دھندلے تھے اور بعض گریز پا اور جن پر تعمیر کھڑی کر لینا میری زندگی کی کرامات میں سے ہوتا، اقبال کے اُٹھ جانے سے سب کے سب درہم برہم ہو گئے اب نہ وہ ولولہ رہا کہ ان کا پھر سے تعین کیا جائے اور نہ یہ اُمید کہ اقبال جیسا رفیق و رہبر ملے گا جو اُن کی تشکیل و تزئین میں مدد دے گا۔

اقبال کا ایک خاص وصف یہ بھی تھا کہ وہ اکثر ایسی باتیں بتا دیتے تھے اور اس طرح سے بتا دیتے تھے کہ اُس ایک بات سے بے شمار نئی نئی اور عجیب باتیں از خود برآمد ہونے لگتی تھیں اور کم سے کم مجھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اُن کی اس ایک بات سے بہت سی

دُوسری باتیں نکال سکتا تھا۔ پھر لطف یہ کہ یہ دُوسری باتیں اصل بات سے کوئی واسطہ براہِ راست نہیں رکھتی تھیں۔ اُن کی بتائی ہُوئی باتیں نہ صرف نئے راستے کھول دیتی تھیں بلکہ اُن راستوں پر مجاہدانہ و مجتہدانہ انداز سے گرم رفتار ہونا بھی آسان اور دلچسپ ہو جاتا تھا۔

اقبال دُوسروں کے نزدیک کیسے ہی کچھ نہ ہوں میرے لئے تو وہ بہت کچھ تھے۔ مَیں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ بہت سے مقامات پر وہ خود اپنے آپ کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں اگر یہ شاعری ہے تو پیمبری کیا ہے؟ اور یہ پیغمبری ہے تو شاعری کا کیا درجہ ہے؟

سید عابد علی عابد

دو ملاقاتیں

ٹھیک یاد نہیں لیکن غالباً ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء کی بات ہے کہ ایک بیرونی یونیورسٹی میں اردو کی پروفیسری خالی ہوئی میں نے بھی درخواست دی، لیکن درخواست دینے کے بعد چپکا بیٹھ رہا۔ ایک دوست نے جن کی تجربہ کاری پر بہت اعتماد تھا یہ قصّہ سُنا تو اُنھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ علاّمہ اقبال سے سفارش کروائی جائے۔ اس وقت تک مجھے ان کی خدمت میں کبھی جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اور اُن کی عظمت کا نقش دل پر اس قدر گہرا تھا کہ یوں کہیئے کہ جانے کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ لیکن یہ سفارش والا سلسلہ ایسا نکلا کہ میں نے اُن کی ملاقات کے وسائل کے متعلق تگ و دو شروع کی۔ جو تندہ یا بندہ ایک بزرگوار جن سے ابھی تک عقیدت استوار ہے۔ اس معاملے میں خضرِ راہ ثابت ہوئے (خضرِ راہ علاّمہ اقبالؒ کے کلام کی رعایت سے نہیں لکھا گیا) گرمیوں کے دن تھے، شام کا وقت تھا۔ جب میرے یہ خضرِ طریقت مجھے اپنے ساتھ لے کر نکلے۔ تو میرے دل کی عجیب کیفیت تھی کبھی یہ خیال آتا تھا کہ علاّمہ میری سفارش کیوں کریں گے۔ نہ وہ مجھ سے ذاتی طور پر واقف نہ میرے ہفواتِ نظم و نثر کے آشنا۔ کبھی خیال آتا تھا کہ شاید میرے خضرِ طریقت کی سفارش مؤثر ثابت ہو اور علاّمہ میری سفارش پر آمادہ ہو جائیں بہر نوع راستہ کٹ گیا اور ہم علاّمہ اقبال کے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کے دروازے پر جا پہنچے۔ علاّمہ کا معمول یہ تھا کہ ہر قسم کے

رسمی تکلفات سے بے نیاز ہو کر ملتے تھے، نہ کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہ سرِ زیرِ بارِ منتِ درباں کرنے کی حاجت۔ علّامہ بیٹھے ہیں یا لیٹے ہیں۔ لوگ باگ آ جا رہے ہیں۔ تانتا لگا ہوا ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ خسرو کے اس شعر کا مطلب انہی کے مکان پر جا کر سمجھ میں آتا تھا۔

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
گیر و دار و حاجب و دربان درایں درگاہ نیست

یہ باتیں میں نے سُن رکھی تھیں لیکن اس دن بچشم خود مشاہدہ کیں۔ علّامہ برآمدے میں آرام کرسی پہ لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ میں اور میرے دوست سلام کر کے بیٹھ گئے۔ ذرا اندازہ کر لیجئے کہ اس وقت میرے دل میں کیا کیفیت ہو گی۔ دور سے تو علّامہ کو کئی بار دیکھا تھا۔ اس دن پہلی بار یہ سعادت حاصل ہوئی کہ ان کی باتیں سُنیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ سچ مچ کو یقین نہیں آتا تھا کہ اقبال میرے سامنے لیٹا باتیں کر رہا ہے۔ دل بلّیوں اُچھل رہا تھا کہ علّامہ نے میرے خضرِ طریقت سے پوچھا کہ آپ کے ساتھ یہ کون ہیں؟ انہوں نے میرا نام بتایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ پنجاب کے بہت بڑے ادیب اور شاعر ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ درخواست دی ہے چاہتے ہیں آپ ان کی سفارش کریں۔ علّامہ نے حقّہ کا ایک کش لیا۔ "ہوں" کہا اور میرے دوست سے سیاسی معاملات پر گفتگو کرنے لگے۔ ان سے باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک بیرسٹر صاحب تشریف لے آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ یہ صاحب علّامہ سے ایسی بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے کہ مجھے تعجب ہوتا تھا۔ یہ بزرگوار بہت ہنس مکھ تھے اور پھبتی کہنے میں طاق۔ اُن کے آنے سے گفتگو کا رُخ تبدیل ہو گیا۔ اور علّامہ بھی ان نو وارد بیرسٹر صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔ مسکراتے جاتے تھے اور کبھی کبھی اُن کی پھبتیوں کا جواب بھی دیتے تھے۔ یہ نو وارد بیرسٹر صاحب اپنے ہم پیشہ قانون دانوں پر پھبتیاں کس رہے تھے۔ اور حق بات یہ ہے کہ مزے کی باتیں کر رہے تھے۔ ناگاہ باتیں کرتے کرتے رُک گئے اور ایک عجیب انداز میں بے تکلفانہ کہا "یار تُوں حقّے دور رکھیا کر، اِک آپنے لئی تے اِک دوسریاں لئی،

حُقّے دی نڑی مُنہ دِچ پا کے تُوں فیر کڈھدا ای نئیں۔ اے تینوں خبرے کی پیڑی عادت پئے گئی ہوئی اے (یار تم حُقّے دور رکھا کرو۔ ایک اپنے لئے ایک دُوسروں کے لئے حُقّہ کی نَے مُنہ لیتے ہو تو لیے ہی رہتے ہو۔ خدا جانے تمہیں یہ کیا بُری عادت پڑ گئی ہے) مندرجہ بالا فقرے ٹھیٹھ پنجابی میں کچھ ایسے بے تکلفانہ انداز میں کہے گئے تھے کہ ہمیں بے اختیار ہنسی آ گئی۔ علّامہ مُسکرائے اور نوکر کو آواز دے کر کہا، پیر صاحب کے لئے دُوسرا حُقّہ لے آؤ۔ میں علّامہ کی باتیں دلچسپی سے سُن تو رہا تھا لیکن میرے گوشۂ قلب میں ایک شبہ سا پیدا ہو رہا تھا کہ علّامہ میری سفارش نہ کریں گے۔ کیونکہ اُنہوں نے اس معاملے میں سوائے "ہُوں" کہنے کے اس کے بعد کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد میرے خضرِ طریقت نے میرا زانو دبایا۔ گویا مجھے اشارہ کیا کہ اُٹھو چلیں۔ مَیں نے اجازت چاہی اور ساتھ ہی میرے خضرِ طریقت نے کہا عابد صاحب کے لئے سفارش۔ فرمایا "سفارش، ہاں" پھر انگریزی میں کہا "جو آپ مناسب سمجھیں لکھ لائیں مَیں دستخط کر دُونگا۔" ہم دونوں سلام کر کے رُخصت ہوئے۔ علّامہ کے "محقق" دوست ابھی تشریف رکھتے تھے۔ راہ میں میرے خضرِ طریقت نے مجھ سے کہا لو بھئی تمہارا کام تو ہو گیا۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ گھر پہنچا تو سوچتا رہا کہ یہ بھی علّامہ نے کیا ارشاد فرمایا جو مناسب سمجھو لکھ لاؤ۔ کبھی یہ خیال آتا کہ پھر جب ان کی اجازت ہے تو کیوں نہ اپنے متعلق واقعی جو جی میں آئے لکھ لُوں۔ پھر سوچتا بہت بیہودہ بات ہو گی کہ علّامہ تو مجھ پر اتنا اعتماد کریں اور میں یہ حرکت کروں نتیجہ یہ نکلا کہ جو کچھ مَیں نے اپنے متعلق لکھا نہایت معقول تھا شام کو وہ تحریر لے کر علّامہ کی خدمت میں پہنچا۔ اُنہوں نے تحریر پڑھی، مسکرائے اور مجھ سے کہا کہ ان لفظوں سے آپ کا کام ہو جائے گا۔ میں نے عرض کی جی اُمید تو ہے۔ وہ پھر مسکرائے اور فرمایا، دیکھئے میں نے آپ کو کھلی چھٹی دے دی تو آپ نے خود ہی اپنی تعریف سے مبالغے سے کام نہیں لیا۔ یہ کہہ کر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد کئی بار علّامہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی جن میں سے اس مرحلے میں صرف ایک ملاقات کا تفصیلی ذکر کرونگا۔

دسمبر ۱۹۳۷ء میں ایک دن میں اور میرے ایک دوست کسی کام سے جا رہے تھے کہ سنٹرل ٹریننگ کالج کے پاس ہمیں ایک خوش پوش نوجوان نے ٹھہرا لیا۔ اِن دنوں یومِ اقبال منانے کی تحریک کا بڑا چرچا تھا۔ میں اگرچہ ذرا فاصلے پر تھا۔ لیکن میں سُن رہا تھا کہ یہ نوجوان اس تحریک کے متعلق کچھ باتیں کر رہا ہے۔ چنانچہ یہ سمجھ کر کہ ان دونوں کی باتیں شاید ایسی ہوں کہ میرا شامل ہونا انہیں ناگوار ہو۔ میں ذرا آگے بڑھ گیا۔ میرے دوست نے مجھے آواز دے کر بلایا اور اب معلوم ہوا کہ یہ نوجوان میرے دوست سے یومِ اقبال کے سلسلے میں مشورہ لے رہا ہے میرے دوست نے میرا تعارف کرایا تو اس باہمت نوجوان نے میرا نام سنتے ہی فوراً کہا کہ آپ علامہ کی شاعری پر کوئی پیپر نہیں پڑھیں گے؟ میں نے کوئی رسمی سا عذر پیش کیا۔ لیکن دونوں صاحب میرے سر ہو گئے اور آخر مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ میں اقبال اور فنونِ لطیفہ پر مقالہ پڑھوں گا۔

رات کو لوٹا اور اس مضمون کا خیال آیا تو کچھ اُلجھنیں سی ہونے لگی۔ سوچتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ کہہ جاؤں جو علامہ مرحوم کی تعلیم کی اصل رُوح کے خلاف ہو۔ اگرچہ نقّاد کی حیثیت سے مجھے کامل آزادی حاصل تھی۔ لیکن علامہ مرحوم سے جو مجھے عقیدت تھی۔ اس کی وجہ سے یہ خیال ضرور پیدا ہوتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ کہہ جاؤں جس سے اصل مقصد (اقبال کے نظریہ فنونِ لطیفہ کی تفسیر) فوت ہو جائے یا علامہ کو کسی قسم کی ذہنی تکلیف ہو۔

دوسرے دن راجہ حسن اختر صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے موقع پا کر اپنی اُلجھن کا ذکر چھیڑا۔ راجہ صاحب نے بے ساختہ کہا کہ چلیے، علامہ کے ہاں چلتے ہیں۔ مجھے جرأت نہیں کہ ان کے سامنے بحث کا آغاز کر سکوں لیکن اگر آپ کسی مسئلہ پر بحث چھیڑ دیں گے۔ اور علامہ کو اس سے دلچسپی پیدا ہو جائے گی تو گتھی گرہیں خود بخود کھل جائیں گی۔ چنانچہ اسی شام میں اور راجہ صاحب علامہ کے درِ دولت پر حاضر ہوئے۔

ایک دو اور بزرگوار بھی بیٹھے تھے۔ جن کو میں نہیں پہچانتا۔ حسنِ اتفاق سے ایک مقامی مشاعرے کا ذکر آ گیا۔ جس میں لاہور کے ایک بر خود غلط شاعرِ انقلاب نے بہت ہنگامہ بپا کیا تھا

اسی سلسلے میں اُردو اور فارسی محاورات اور تضمینات کا ذکر چھڑ گیا۔ یاد نہیں کہ دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستیِ فتنہ انگیز، کس نے کہا! میں نے یہ محاورہ سُن کر غالب کا شعر پڑھا ؎

بادہ زمے ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند

آرے دروغِ مصلحت آمیز گفتہ اند

علامہ مسکرائے اور ایک شعر پڑھا۔ جو میں نے اچھی طرح نہیں سُنا۔ کیونکہ اُن کی آواز بیٹھ گئی تھی کچھ لفظ کان میں پڑے تھے۔ کچھ نہیں سُنائی دیئے تھے۔ میرے چہرے کے انداز سے وہ بھانپ گئے کہ میں نے شعر نہیں سُنا اس لئے پھر ذرا بلند تر آواز سے پڑھا ؎

راستیِ فتنہ انگیز، اس سہی قد کا ہے قد

اور دین اس کا دروغِ مصلحت آمیز ہے

راجہ صاحب نے موقع دیکھ کر کہہ دیا کہ عابد صاحب "اقبال اور فنونِ لطیفہ" پر ایک مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ علامہ نے میری طرف تیز تیز متجسّانہ نظروں سے دیکھا۔ جن لوگوں کو ان نظروں کی دوربینی اور دُوررسی محسوس کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان تیز تیز نظروں میں کیا بات پوشیدہ تھی۔ علامہ کی آنکھیں گویا، مخاطب کے تمام سرمایہ ذہنی کو ٹٹول کر، گویا اس کے تہہ قلب کے خُفیہ ترین گوشوں میں پہنچ کر، اس کے اعمال اور افعال کے محرکاتِ شعوری کا جائزہ لیتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اور اس طرح محسوس ہوتا تھا گویا علامہ مخاطب کو تول رہے ہیں۔ ان تاثرات کو بیان کرنے کے لئے پانچ چھ سطریں لکھنے کی ضرورت پڑی ہے لیکن درحقیقت یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہو گیا ایک آدھ منٹ چپ رہنے کے بعد علامہ نے فرمایا "میرے کلام کو آرٹ (شاید اس کا مغربی تصور مراد تھا) سے کیا تعلق ہے؟ میری شاعری اسلامی تفکر اور فقہ کی تفسیر اور تعبیر ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میرا مقصد یہ ہے کہ اس بات کو واضح کر دوں کہ آپ کے خیال میں فنونِ لطیفہ کا نصب العین کیا ہے، فرمایا" ہاں اس اعتبار سے مقالہ لکھا جا سکتا ہے"

اس کے بعد کچھ عرصہ علامہ چپ رہے۔ شفیع صاحب آگئے اور ان کے شانے دبانے لگے۔ میں نے جرأت کر کے پوچھا کہ آرٹ کے زوال پذیر ہونے کے جو محرکات ہوتے ہیں ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، علامہ نے لیٹے لیٹے جواب دیا کہ آرٹ کی زوال پذیری دراصل اقوام کی مجموعی زوال پذیری کے تابع ہوتی ہے، جب تک خدا کو کسی قوم سے کچھ کام لینا مقصود ہوتا ہے اور اُسے سرداری کے منصب پر فائز رکھنا منظور ہوتا ہے، اس وقت تک آرٹ زندہ اور جاندار رہتا ہے۔ بلکہ سب سے پہلے کسی قوم کی زوال پذیری کی علامت آرٹ کی زوال پذیری کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ علامہ یہ کہہ کر چپ ہوئے تو نیازی صاحب نے پوچھا کہ ان حالات میں کیا شاعری سب سے پہلے متأثر ہوتی ہے۔ فرمایا، ضروری نہیں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم زوال پر آمادہ ہو جاتی ہے تو ٹھوس چیزوں سے مغز سے، معنی سے، بیگانہ ہو جاتی ہے، چھلکے سے، شکل سے، دل بستگی بڑھ جاتی ہے۔ یہی آرٹ کی زوال پذیری ہے، میں نے عرض کیا کہ اُردو شاعری میں شاید ناسخ اور اس کے سکول کا کلام آپ کے ارشاد کی بہترین تفسیر ہے۔ فرمایا، میں نے ناسخ اور اس کے سکول کا کلام بہت کم پڑھا ہے۔ میرا اُردو ادبیات کا مطالعہ بہت محدود ہے، البتّہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُردو کی تاریخ میں دکنی ادبیات کا حصّہ نسبتاً بہت جاندار نظر آتا ہے۔ نیازی صاحب نے فرمایا کہ شاید اس کی وجہ یہ ہو گی کہ دکنی ادبیات کو مذہب سے نہایت گہرا تعلق ہے، فرمایا "ہاں یا یوں کہو کہ زندگی سے دکنی ادبیات کا تعلق اصلی اور اساسی ہے۔" میں نے کہا، کچھ دن ہوئے ہیں۔ رسالہ اُردو میں ایک مقالہ نگار نے میر حسن اور ایک پُرانے دکنی ادیب کی مثنویوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ دکنی شاعر کا کلام زیادہ جاندار اور پُرجوش ہے" علامہ نے فرمایا "مقالہ نگار کا خیال ٹھیک ہو گا۔ حسن کے وقت تک اُردو شاعروں میں کافی ژولیدہ بیانی پیدا ہو چکی تھی۔ یا تو کچھ کہنا ہی نہیں چاہتے تھے، یا کہنا چاہتے تھے تو کہہ نہیں سکتے تھے۔ بلکہ جو

بزرگوار کچھ کہنا چاہتے تھے ان کے کلام میں بھی ایک خاص قسم کی ژولیدہ گفتاری ہے۔ جو ذہنی ژولیدگی اور پریشان فکری کی خبر دیتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس قسم کی ژولیدہ گفتاری کا معیاری نمونہ غالب کا ابتدائی کلام سمجھا جائے گا۔ کسی نے غالبؔ کے "نسخۂ حمیدیہ" والے دیوان کا ایک شعر پڑھا۔ شعر یاد نہیں، غالباً ژنگ آخر اور پلنگ آخر ان قافیوں میں تھا۔ علامہ کچھ عرصہ چپ رہے۔ پھر فرمایا "کسی حد تک، لیکن غالب سے کہیں زیادہ مومن ژولیدہ گفتار ہے۔ میں خود اگرچہ مومن کے مداحوں میں سے نہیں ہوں اور اس اسلوبِ فکر اور اندازِ تغزل کو ایک کارنامہ نہیں سمجھتا۔ لیکن کچھ نقادوں نے غالبؔ کے مقابلے میں مومن کو اچھالا تھا" اس سلسلے کے تمام واقعات مجھے یاد آگئے اور معاً خیال آیا کہ زوال پذیر قوموں کے نقاد بھی کس قدر ژولیدہ فکر ہو جاتے ہیں کہ پریشان گفتاری کو ندرتِ اسلوب اور ژولیدہ بیانی کو جدتِ ادا کا لقب دے کر معائب کو محاسن بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوگئیں۔ بُلھے شاہ کی کافیوں کا ذکر آیا۔ کچھ وقت تک پنجابی شاعری اور تصوف کا ذکر چلتا رہا۔ لیکن میرے دل کو چٹیک سی لگ گئی تھی کہ موقع ملے تو علامہ سے کچھ اور پوچھوں۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسلام کی زوال پذیری کے سلسلے میں ایرانی تحریکاتِ مذہبی کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ شاید اسلام کی زوال پذیری میں ان تحریکات نے کافی حصہ لیا ہے جنہیں مجوسی کہا جاتا ہے اور جن کو دراصل شیعیت سے کوئی تعلق نہیں۔ فرمایا "ہاں۔ اگر اسلامی علوم وفنون اور اسلامی روایات کا چشمہ بہت کم گدلا ہوا ہے تو عدتر کان عثمانی کے ہاں ہے ورنہ اسلام کا چشمہ جس زمین سے گذرا ہے، اس زمین کو گدلا کر دیا گیا ہے اس کا رُخ پھیر دیا گیا" اس کے بعد کچھ عرصہ علامہ چپ رہے۔ ایک صاحب نے کسی نئی تصنیف کا ذکر چھیڑا جس میں آرٹ کے فلسفے سے بحث کی گئی تھی۔ علامہ نے فرمایا "ایک جرمن مصنف کہتا ہے کہ فلسفے کے نظام دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ٹھوس وزنی۔ ان میں مغز زیادہ ہوتا ہے، دوسرے ذرا ہلکے۔ جب قومیں زوال پذیر ہوتی ہیں تو ہر ٹھوس چیز سے بیگانہ ہو جاتی ہیں" میں نے پوچھا آرٹ

بھی ٹھوس اور ہلکا ہو سکتا ہے۔ فرمایا "ہو سکتا ہے"۔ زوال پذیر اقوام میں آرٹ کا رس نچوڑ کر نہیں پیا جاتا۔ بلکہ پھل کی شکل بنا دی جاتی ہے اور اس کے رنگ کو دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں"۔ میں نے عرض کیا کہ آرٹ کی عظمت کا انحصار کس چیز پر ہے۔ شکل پر یا مغز پر۔ علامہ نے ارشاد فرمایا کہ یوں تو شکل بھی مغز ہی کا ایک پہلو ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آرٹ کی عظمت کا معیار مغز کی صحت مندی اور توانائی پر ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر علامہ چپ ہوئے تو اُن کے ایک پرانے دوست تشریف لے آئے۔ اُنہوں نے مجھے آنکھ کے اشارے سے بولنے سے منع کیا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد میں نے اور راجہ صاحب نے اجازت چاہی۔ اجازت چاہی بھی رسماً لکھ گیا ہوں۔ ورنہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ علامہ پہ یہ شعر صادق آتا تھا ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
گیر و دار حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

ایم اسلم

علّامہ اقبال

حضرت علامہ بڑے سادگی پسند اور بے تکلف قسم کے بزرگ تھے۔ آپ کا دروازہ ہر کسی کے لئے کھلا رہتا تھا۔ آپ سے ملنے کے لئے نہ وقت مقرر کرنے کی ضرورت تھی نہ کارڈ بھیجنے کی۔ گرمیوں کے موسم میں آپ کوٹھی سے باہر ایک میدان میں ایک پلنگ پر گاؤ تکیہ لگائے نیم دراز لیٹے ہوتے۔ لباس میں نصف آستین کی بنیان اور سپید تہہ بند ہوتا۔ پلنگ کے دونوں طرف کرسیاں رکھی ہوتیں جو آتا السلام علیکم کہہ کر کرسی پر بیٹھ جاتا۔ یا تو وہ خود اپنا تعارف کرواتا یا حضرت علامہ خود فرماتے "فرمائیے"۔

لاہور والے تو آپ کے دیوانے تھے۔ ہر رنگ کے آدمی ملنے آتے۔ ملنے والوں سے اکثر پنجابی میں ہی گفتگو کرتے۔ باتیں مسکرا مسکرا کر کرتے۔ کبھی کسی کی بات کو نہیں کاٹتے تھے۔ دوسرے کی بات پوری توجہ سے سنتے اور بے تکلفانہ انداز سے بات چیت کرتے۔ کبھی باہر سے بڑے بڑے عالم اور سیاستدان بھی آجاتے تھے، مگر آپ اپنے روزمرّہ کے لباس ہی میں ان سے بھی ملتے۔ آپ کے ہاں طمطراق سے رہنے کا رواج ہی نہ تھا۔ ہر بات میں اسلامی عظمت اور اسلامی شان نظر آتی تھی۔ روز کے ملنے والوں میں ادیب بھی ہوتے، شاعر بھی ہوتے، کالج کے پروفیسر بھی، طلبا بھی اور شہر کے ہر طبقے کے لوگ بھی۔ سب کی باتیں غور سے سنتے۔ حضرت علامہ کبھی کسی کی بات نہیں کاٹتے تھے۔ آپ کی گفتگو میں رعونت کا عنصر

کبھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جتنی دیر کسی کا دل چاہے بیٹھے۔ حضرت علامہ کبھی کسی شاعر سے اپنا کلام سُنانے کو نہیں فرماتے تھے اور نہ کسی میں یہ جُرأت ہوتی کہ آپ سے کلام سُنانے کی فرمائش کرے۔ کوئی خود ہی کچھ سنانا چاہے تو آپ توجہ سے سُنتے۔ آپ کا داد دینے کا انداز صرف ایک "ہوں" ہوتی۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے کسی شاعر سے کہا ہو کہ "پھر پڑھیے"، جو شعر پسند ہوتا صرف "ہُوں" کہہ دیتے اور وہ بھی بہت کم ورنہ خاموش بیٹھے سُنتے رہتے تھے۔ جس طبقہ اور مذاق کا آدمی آتا اس سے اسی طرح کی باتیں کرتے۔ کبھی ہنسی مذاق بھی ہو جاتا۔ جب طلبا آتے تو مجلس کا رنگ بالکل ادبی ہو جاتا۔ طلبا کو پوری آزادی سے بات کرنے کی اجازت ہوتی۔ باتوں باتوں میں کبھی بحث کا رنگ بھی پیدا ہو جاتا آپ کی تقریر میں فصاحت اور بلاغت کے دریا بہتے نظر آتے۔ گفتگو یا بحث کا انداز بڑا دلپذیر ہوتا اور اختلاف کا رنگ ایسا ہوتا جس سے دوسرے کی طبیعت ملول نہ ہوتی، اور نہ دل میں فرومائگی کا احساس پیدا ہوتا۔ آنے والے اپنی مرضی سے آتے اور اپنی مرضی سے اُٹھ کر چلے جاتے۔ گرمی کے موسم میں جب کھانے کا وقت ہوتا تو علی بخش ایک سینی میں کھانا لگا کر لاتا۔ سالن کی دو کٹوریاں، روٹی یا چاول اور پانی کا گلاس سینی میں رکھا ہوتا۔ آپ دوزانو بیٹھ جاتے اور دُوسروں سے یہ کہہ کر کہ اگر کسی صاحب نے کھانا کھانا ہو تو آجائیں، کھانا شروع کر دیتے۔ کھانا بھی کھاتے، باتیں بھی ہوتیں اور ہنسی مذاق بھی ہوتا رہتا۔ حضرت علامہ کو پلاؤ بہت پسند تھا، آپ فرمایا کرتے تھے پلاؤ کھانے والی قوموں کو زمانہ کبھی مٹا نہیں سکتا۔ دو چار لوگ ایسے بھی تھے جو علم دوست بھی تھے نکتہ رس اور نکتہ سنج بھی اور تقریباً ہر روز آنے والے بھی۔ آپ ان سے بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرتے اور ان کی باتیں جن میں کبھی اختلاف کا پہلو بھی نکل آتا بڑی دلچسپی اور سنجیدگی سے سُنتے۔ یہ لوگ سوسائٹی میں اقبال پرست کہلاتے تھے۔ میں ان لوگوں کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ میری بھی ان سے بے تکلفی تھی۔ علمی بحث بھی ہوتی سیاست کے راز بھی کھولے جاتے، حالاتِ حاضرہ پر بھی تبادلہ خیال ہوتا اور معاشرہ بھی

زیرِ بحث آتا۔ حضرت علاّمہ معاشرے کے رنگ سے بہت بے زار نظر آتے اور کبھی سختی سے تنقید بھی کرتے اور عقیدتمند ہاں میں ہاں ملانا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے۔ لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ اس مخصوص جماعت میں کچھ منافق بھی تھے۔ کبھی حضرت علاّمہ کی موجودگی میں میری اور انکی گفتگو میں تلخی بھی پیدا ہو جاتی۔ چودھری محمد حسین جو عموماً وہاں موجود ہوتے میرے ہم خیال ہوتے، لیکن علاّمہ اقبال بالکل خاموش رہتے۔

حضرت علاّمہ اسلامی معاشرے کے قیام کے بڑے حامی اور مبلغ تھے خصوصیت سے جب طلبا آپکی خدمت میں حاضر ہوتے تو انہیں اسلامی روایات زندہ کرنے اور اسلامی رسم ورواج کو ترویج دینے کی بڑے دلپذیر انداز سے نصیحتیں فرماتے۔ کوٹھی کے قریب ہی ایک مسجد تھی۔ جب اذان کی آواز آتی حضرت علاّمہ خاموش ہو جاتے اور باتوں کا سلسلہ بھی بند ہو جاتا۔

نثر لکھا کرو

مجھے سکول کے وقت سے ہی شعر کہنے کا شوق تھا۔ جناب خوشی محمد ناظر سے اصلاح لیا کرتا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں میٹرک کرنے کے بعد میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا اور کالج کی مجلس اردو میں اپنی غزلیات سنایا کرتا۔ کالج میں سالانہ امتحانات کے نتائج کے موقع پر اوّل رہنے والوں کو انعام دیئے جاتے تھے۔ ایک انعام نیچرل شاعری کے لئے بھی مقرر تھا۔ میرے گروپ ٹیوٹر پروفیسر جونز نے جو کیمسٹری کے پروفیسر تھے مجھے ایک نظم لکھنے کے لئے کہا۔ چنانچہ میں نے "وسط ایشیا" کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر پروفیسر جونز کے حوالے کر دی اور انہوں نے میری نظم حضرت علاّمہ اقبال کو جو نظموں کے مقابلہ کے منصف تھے، دے دی۔ حضرت علاّمہ یورپ سے واپس آکر چیف کورٹ پنجاب میں پریکٹس بھی کرتے تھے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ چیف کورٹ میں آپ کے مقدمات بارہ بجے دوپہر کے بعد پیش

کئے جاتے تھے۔ پہلا وقت آپ کالج میں گذارتے تھے۔ نیچرل شاعری کے مقابلہ میں تقریباً پچیس تیس نظمیں کالج کے طلباء کی طرف سے پیش کی گئیں۔ یہ ۱۹۰۹ء کا زمانہ تھا۔ میں فسٹ ائیر میں تھا اور حضرت علامہ ہماری کلاس کو ہفتہ میں دو بار انگریزی نظم "لاری ایٹا" پڑھاتے تھے۔ کچھ روز بعد نیچرل شاعری کے اول انعام کا اعلان میرے نام کے ساتھ ہوا۔ یعنی میری نظم "وسط ایشیا" کو اول انعام دیا گیا۔ جلسہ تقسیم انعامات کی رات کو کالج کی ڈرامیٹک کلب نے ایک کھیل پیش کیا۔ تمام کالجوں کے پروفیسر صاحبان اور کچھ بڑے افسر مدعو تھے۔ ڈرامہ کے بعد میری باری آئی اور میں نے اپنی نظم لے کے ساتھ سنائی۔ اگلے روز کالج میں چھٹی تھی، حضرت علامہ اقبال ان ایام میں اندرون بھاٹی دروازہ رہتے تھے، میرے کالج سے گھر جانے کا بھی یہی راستہ تھا اور میں گھر جاتے ہوئے گاہے گاہے حضرت علامہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرتا تھا۔ اگلے روز جب میں کالج سے آیا تو حضرت علامہ کی خدمت میں سلام عرض کرنے انکے دولت خانہ پر چلا گیا۔ گرمی کا موسم تھا، کمرے میں ساتھ ساتھ دو پلنگ بچھے ہوئے تھے، ایک پلنگ پہ حضرت علامہ اور دوسرے پلنگ پہ حضرت گرامی جو فارسی کے مشہور شاعر اور نظام دکن کے درباری شاعر تھے استراحت فرما رہے تھے۔ دروازے میں بیٹھا ایک نوکر پنکھا کھینچ رہا تھا۔ رات کے جلسہ میں حضرت علامہ کا معتمد ملازم علی بخش بھی گیا ہوا تھا، مجھے دیکھ کر علی بخش نے پنجابی میں کہا:

"اسلم جی! رات تساں حد کر دتی، بڑی پیاری نجم (نظم) سنائی۔"

حضرت مولانا گرامی نے مجھے مخاطب ہو کر پنجابی میں کہا "اوئے منڈیا سانوں وی سنا" یعنی اے لڑکے ہمیں بھی سناؤ"۔ میں نے حضرت علامہ کی موجودگی میں کبھی کوئی شعر نہیں پڑھا تھا اس لئے میں چپکا ہو رہا۔ اس پر حضرت گرامی ذرا غصے سے بولے "اوئے منڈیا توں سنیا نئیں" (لڑکے تم نے سنا نہیں!) میں نے ایک شعر سنایا:

قیس اڑائے نہ جنوں سے جو کبھی گرد و غبار سُرمہ پھر۔ وہ چشمِ غزالاں نہ رہے

حضرت گرامی بولے یہ تو تمہارے اُستاد کا رنگ ہے، کچھ اور سناؤ۔ حضرت گرامی کا اُستاد سے غالباً حضرت علامہ اقبال مُراد تھا۔ حالانکہ میں نے حضرت علامہ اقبال کی موجودگی میں کبھی نظم یا غزل پڑھنے کی جُرأت نہیں کی تھی۔ میں نے ایک اور شعر پیش کیا:

جس طرح سے بنے گذارہ کر　　　اب زمانہ نہیں شکایت کا

حضرت گرامی سر ہلا کر پنجابی میں بولے: "ول شعر اے ول" (اچھا شعر ہے اچھا) 'اوہ!' حضرت علامہ نے فرمایا "پھر پڑھیئے!" میں نے پھر وہی شعر پڑھ دیا۔ کچھ دیر بعد مجھے مخاطب ہو کر ارشاد ہوا "اسلم شعر مت کہا کرو، نثر لکھا کرو!"

غور فرمائیے ایک روز پہلے مجھے اوّل انعام عطا فرمایا اور اگلے روز شعر کہنے سے منع فرمایا اور نثر لکھنے کی تلقین کی اور میرے لئے وہی بات ہوئی کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اس روز سے میرا شعر کہنے کا شوق ٹھنڈا پڑ گیا۔ دو چار روز بعد میں نے باتوں باتوں میں حضرت علامہ سے عرض کیا کہ آپ نے مجھے نثر لکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ افسانہ ہی لکھ سکوں گا۔ یہ سُن کر ارشاد فرمایا "افسانہ ہی لکھو، لیکن جو کچھ بھی لکھو قومی نقطۂ نگاہ سے لکھو" الحمد اللہ میں نے افسانے، ناول اور جو کچھ بھی لکھا ہے قومی نقطۂ نگاہ سے ہی لکھا ہے۔

کچھ نہیں ہوگا

مُدت کی بات ہے میں نے مارک ٹوین کی کہانی "جمپنگ فراغ" کو اردو میں 'مرزا اینڈ کی' کے عنوان سے مزاحیہ رنگ میں لکھا۔ یہ مضمون جب شائع ہوا تو حضرت علامہ کی نظر سے بھی گذرا بقول چوہدری محمد حسین ایم۔ اے مرحوم جن کے حضرت علامہ سے گہرے مراسم تھے حضرت علامہ نے "مرزا اینڈ کی" بہت پسند فرمایا۔ میں نے اسی رنگ میں دو یا تین مزاحیہ افسانے اور لکھے۔ ایک روز حضرت علامہ نے فرمایا کہ میں اسی رنگ میں (مزاحیہ) کانگریس کے متعلق بھی کچھ لکھوں اور کچھ ہدایات

بھی فرمائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس اور مسلم لیگ کے جھگڑے زوروں پر تھے۔ حضرت علامہ کے ارشاد پر میں نے اپنے مزاحیہ مضامین میں کانگریسی نیتاؤں کا خوب مذاق اڑایا۔ سارے ہندو پریس نے جس میں لاہور کا "ٹریبیون" اور بنگال کا "امرتا بازار پتر کا" تھا بڑی شدت سے میرے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا، اور حکومت سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ اسلم کو پنجاب سے نکال دیا جائے۔ اس کا وجود پنجاب کے لئے خطرناک ہے۔ اسلم پر شر انگیزی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اُبھارنے پر مقدمہ چلایا جائے۔

انگریزی اور اُردو تمام ہندو اخبارات میرے خلاف بڑی شدّومد سے لکھتے تھے۔ میرے گھر والے بہت پریشان ہو رہے تھے، لیکن حضرت علامہ جن کے ایما پر میں نے یہ مضامین لکھے تھے اور انہوں نے بہت پسند فرماتے تھے بالکل چپ تھے۔ آخر ایک روز میں نے علامہ کی توجہ اس غوغا آرائی کی طرف کرائی۔ حضرت علامہ نے بڑی بے نیازی کے انداز میں ہاتھ ہلا کر صرف اتنا فرمایا "کچھ نہیں ہوگا"۔

لیکن ہندو پریس بڑی شدت سے میرے خلاف لکھتا رہا۔ میں نے سب مضامین 'مرزاجی' کے نام سے کتاب کی صورت میں شائع کر دیئے تھے۔ ہندو پریس بڑے زور سے یہ مطالبہ کرتا رہتا تھا کہ 'مرزاجی' بحق سرکار ضبط کر لی جائے۔ ان دنوں حکومت پنجاب کا چیف سیکرٹری مسٹر گاربٹ تھا۔ گاربٹ بہت سخت گیر آدمی مشہور تھا۔ آخر مجھے اطلاع ملی کہ مسٹر گاربٹ نے حکم دیا ہے کہ 'مرزاجی' کا انگریزی میں ترجمہ کروا کر حکومت کو پیش کیا جائے۔ اس تمام عرصہ میں جب کبھی بھی میں حضرت علامہ کی توجہ ہندوؤں کی فتنہ پردازی کی طرف دلاتا تو حضرت علامہ وہی پہلے کی طرح ایک شان بے نیازی سے فرما دیتے: "کچھ نہیں ہوگا"۔ سارے ملک کا ہندو پریس تو میرے خلاف زہر اگلتا رہتا تھا لیکن مسلمان پریس بالکل خاموش تھا۔ کسی اخبار یا اُردو رسالے میں مسلم پریس کی طرف سے میرے یا میری کتاب 'مرزاجی' کے حق میں اس تمام عرصے میں کبھی دو سطریں بھی نہ لکھی گئیں۔ حکومت پنجاب کی طرف سے جو کارروائی بھی ہوتی تھی،

چوہدری محمد حسین ایم۔ اے جو گورنمنٹ پریس برانچ میں سپرنٹنڈنٹ تھے مجھے اس سے باخبر رکھتے۔

میرے دوست احباب بہت پریشان تھے کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

حضرت علامہ کو بھی ان سب حالات کی خبر ملتی رہتی تھی اور میں جب کبھی بھی توجہ دلاتا تو وہی شان بے نیازی ہوتی اور وہی جواب "کچھ نہیں ہوگا" ملتا۔

آخر ایک روز گورنمنٹ پریس برانچ سے مجھے یہ خبر دی گئی کہ مسٹر گاربٹ نے 'مرزاجی' کے متعلق یہ حکم دیا ہے:

M. Aslam's pen shares neither Hindus nor Muslims, nor Congressites. Book is humorous and harmless. No action is needed.

یہ اطلاع پا کر میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو چوہدری محمد حسین بھی موجود تھے، چوہدری صاحب نے حضرت علامہ سے کہا: "ڈاکٹر صاحب! اسلم صاحب سے فرمائیں مٹھائی کھلائیں"، حضرت علامہ مسکرا کر بولے، "میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ "کچھ نہیں ہوگا"۔"

مجھے تمباکو نوشی سے سخت نفرت ہے۔ میں حقّہ کی بو برداشت نہیں کر سکتا، لیکن حضرت علامہ حقّہ پیتے تھے۔ حضرت علامہ سردی ہو گرمی عموماً پلنگ پر بیٹھنے کے عادی تھے۔ گلے میں نصف آستین کی بنیان اور ململ یا کسی سپید کپڑے کی قمیض اور تہہ بند ہوتا سردی کا موسم ہوتا تو پشمینے کی چادر کندھوں پر ڈال دیتے اور گاؤ تکیہ سے پیٹھ لگائے نیم دراز سے پلنگ پر پڑے رہتے۔ دونوں ہاتھ عموماً سر کے پیچھے رکھتے۔ ایک صاف ستھرا حقّہ پلنگ کے پاس رکھا ہوتا، کسی وقت لیٹے لیٹے ایک دو کش لگا لیتے، بار بار نہیں، خاصے وقفہ کے بعد۔۔۔۔ بے تکلفی اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے حقّے کی "نے" دوسروں کی طرف بڑھا دیتے۔

جیسے کہ میں کہہ چکا ہوں مجھے تمباکو نوشی سے نفرت ہے، میں حقّے سے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھتا تاکہ دھوئیں سے بچا رہوں۔ میری اس عادت پر حضرت علّامہ نے مجھے "خالصہ جی" کا خطاب دے رکھا تھا...... چنانچہ میں جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو مجھے دیکھتے ہی مسکرا کر فرماتے "آئیے خالصہ جی یا وہ خالصہ جی آئے"۔

ایک روز میں اور چوہدری محمد حسین ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے، حضرت علّامہ پلنگ پر خاموش لیٹے ہوئے ہماری باتیں سُن رہے تھے۔ باتوں باتوں میں تمباکو نوشی کا ذکر آگیا چوہدری محمد حسین نے کہا کہ تمباکو نوشی تو آجکل فیشن میں داخل ہے تمہیں اس سے اتنی نفرت کیوں ہے میں نے کہا اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں تمباکو ہوتا تو دُوسری منشّیات کی طرح یہ بھی حرام ہو جاتا۔ حضرت علّامہ نے مسکرا کر پوچھا "یہ تم نے کس سے سُنا؟" میں نے عرض کیا کہ میں نے دو چار علمائے دین سے دریافت کیا تھا، اُنہوں نے یہی جواب دیا تھا۔ حضرت علّامہ مسکرا کر بولے "میں اِنہی علمائے دین کی اجازت سے حقّہ پیتا ہوں لیکن میں یہ بھی مانتا ہوں کہ تمباکو مکروہ ضرور ہے"۔ پھر آپ نے ایک واقعہ سُنایا کہ لکھنؤ میں آل انڈیا مُسلم ایجوکیشن کانفرنس پر میں بھی گیا ہُوا تھا۔ میں وہاں ایک جاگیردار کے پاس ٹھہرا ہُوا تھا۔ کھانے کے بعد کچھ ناچ گانے کا بھی انتظام تھا۔ دو تین اور مہمان بھی مدعو تھے۔ لکھنؤ کی ایک مشہور گانے والی بُلائی گئی تھی گانے والی جب آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ کسی نے پوچھا کہ بریف کیس کیسا ہے مغنّیہ نے کہا کہ آج دوپہر کو ایک صاحب اس کے کوٹھے پر گانا سُننے آئے تھے۔ وہ جاتے ہوئے اپنا بریف کیس وہیں بھول گئے تھے۔ میں اس لئے اُٹھا لائی ہُوں کہ شاید آپ ان کا کھوج نکال سکیں۔

میں نے وہ بریف کیس صاحب خانہ کو دے دیا۔ جب بریف کیس کھول کر دیکھا تو اس میں کانفرنس کے متعلق کچھ کاغذات تھے۔ یہ بریف کیس ایک ایسے شخص کا تھا، جو کانفرنس کا ایک معزز رکن تھا اور لوگ ان سے حضرت مولانا کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔

اقبال ادبی مجلس

حضرت علامہ کے پاس مختلف کالجوں کے پانچ دس طالب علم حصول فیض کے لئے ہفتہ میں دو تین بار انکی کوٹھی پر آیا کرتے تھے۔ بعض اوقات اور ملنے والے بھی موجود ہوتے اور طلبا کو بات کرنے کا موقع نہ ملتا اور وہ بے نیل مرام واپس چلے جاتے۔ مرزا جلال الدین بار ایٹ لا سے حضرت علامہ کے دوستانہ مراسم تھے۔ مرزا جلال الدین ایک زندہ دل آدمی تھے، انہوں نے حضرت علامہ کی اجازت سے اپنے ہاں ایک ہفتہ وار ادبی مجلس جو بعد میں علامہ اقبال ادبی مجلس بن گئی، قائم کی۔ اس ادبی محفل میں صرف طلبا کی تعداد دس پندرہ سے کم نہ ہوتی۔ حضرت علامہ طلبا کو اپنے اردو اشعار کے معنی اور مطالب سمجھاتے۔ آپ جو کچھ فرماتے طلبا ساتھ ساتھ قلمبند کرتے جاتے۔ یہ ادبی محفل کبھی ایک گھنٹہ اور کبھی دو گھنٹے ہوتی۔ حضرت علامہ کی تقریر جس میں کبھی سیاست بھی راہ پا جاتی بڑی دلپذیر ہوتی۔ پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر بینٹ حضرت اقبال کے بڑے مداح تھے اور آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ کسی موقع پر بینٹ (آئی جی) نے حضرت علامہ سے کہا کہ "اقبال ادبی مجلس" کے چار طلبا مخبری کا کام بھی کرتے ہیں اور حکومت کو مطلع کرتے رہتے ہیں۔ اس پر حضرت علامہ نے یہ مجلس بند کر دی کبھی کبھی میں بھی اسی ادبی مجلس میں شامل ہوا کرتا تھا۔ میں اس زمانے میں گورنمنٹ کالج میں تعلیم پا رہا تھا۔ بقول مرزا جلال الدین حضرت علامہ کو لڑکوں کی اس حرکت پر غصہ بھی آیا اور بیزار بھی بہت ہوئے، لیکن زبان ہمیشہ بند رہی۔ کسی کو مطعون کرنا یا کسی کا نام بتانا پسند نہ کیا۔

کچھ روز سے ایک آدمی جو اپنا نام خوشی محمد بتاتا تھا ہر روز حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ آتے ہی ہاتھوں کو بوسہ دیتا، پھر پاؤں دابنے بیٹھ جاتا۔ لیکن حضرت علامہ منع فرما دیتے۔ خوشی محمد ایک جوان آدمی تھا۔ خوشی محمد کبھی دن کے وقت آتا کبھی شام

سے پہلے آجاتا اور رات آٹھ نو بجے تک بیٹھا رہتا۔ مہذب اور خاموش سا آدمی تھا، حضرت علامہ کے خاص ملازم علی بخش سے گاڑھی چھنتی تھی۔ اس کا آنا جانا بہت روز سے تھا، وہ بتایا کرتا تھا کہ وہ بے کار ہے۔ ایک روز علی بخش نے حضرت علامہ سے کہا کہ آپ خوشی محمد کو پولیس میں ملازم کرا دیں۔ حضرت علامہ نے خوشی محمد کو مسٹر بینیٹ کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیا۔

ایک روز مسٹر بینیٹ کا حضرت علامہ کے نام خط آیا کہ اس نے سپاہی خوشی محمد کو حضرت علامہ کی سفارش پر کانسٹیبل سے حوالدار کے عہدے پر ترقی دے دی ہے اور ساتھ ہی لکھ دیا کہ ہیڈ کانسٹیبل خوشی محمد گذشتہ دو سال سے آپ سے ملنے جلنے والوں پر نگاہ رکھنے کے لئے محکمہ کی طرف سے مقرر تھا۔ اس کے بعد خوشی محمد پھر کبھی وہاں نظر نہیں آیا۔

داتا کا دربار

ایک روز ایک واقعہ حضرت علامہ نے خود سنایا۔ ان ایام میں آپ ڈیوس روڈ پر کوٹھی میں رہتے تھے، یہ واقعہ بھاٹی دروازے لاہور سے تعلق رکھتا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ حضرت گرامی آئے ہوئے تھے اور حسب دستور میرے پاس مقیم تھے۔ ایک روز ہم دونوں صبح صبح گھر سے نکل کر حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کو چلے، بھاٹی دروازہ کے باہر ایک سپید ریش آدمی ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا، میری جیب میں ایک چونی تھی، میں نے وہ چونی اس کے ہاتھ پر رکھ دی لیکن اس نے چونی زمین پر پھینک دی اور ایک روپیہ مانگا۔ مانگنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میرا قدم آگے کو نہ اٹھا۔ میں نے گرامی صاحب سے کہا کہ آپ دربار کو چلئے میں آپ کے پیچھے پیچھے پہنچتا ہوں۔ گرامی صاحب نے کہا کہ وہ اسی جگہ میرا انتظار کریں گے۔ گھر دروازے کے قریب ہی تھا، میں نے گھر سے ایک روپیہ لیا اور واپس آکر اسی فقیر کو دے دیا۔ اس نے دعا دی اور میں اور گرامی حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر جا پہنچے۔ یہاں ہم کچھ دیر ٹھہرے اور فاتحہ پڑھ کر واپس گھر لوٹ آئے۔ اسی روز میرے

منشی طاہر نے مجھے پانچسو روپے کا نوٹ دیا اور کہا کہ ایک مقدّمے والا آیا تھا وہ یہ پانچسو روپے آپکی فیس کے دے گیا ہے۔ حضرت گرامی جو میرے پاس بیٹھے تھے، بولے "ڈاکٹر صاحب! لیجئے آپکو ایک کے پانچسو مل گئے"۔

درویش

حضرت علامہ کبھی موج میں آکر اپنی زندگی کے واقعات بھی سُنایا کرتے تھے۔ لیکن یہ افتخار زیادہ تر چوہدری محمد حسین کو ہی حاصل تھا۔ کبھی مجھ پر بھی عنایت ہو جاتی۔ ایک روز چوہدری محمد حسین صاحب اور میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر تھے۔ کچھ اللہ والوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ حضرت علامہ کو اللہ والوں سے بڑی عقیدت تھی۔ لاہور سے دُور کسی گاؤں میں کوئی اللہ والے رہتے تھے۔ عقیدتمند دور دور سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت علامہ کی بھی ان سے سفر میں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کو ان بزرگ سے دوبارہ ملنے کا بڑا اشتیاق تھا کئی بار جانے کا ارادہ بھی کیا لیکن نہ جا سکے۔ حضرت علامہ فرمانے لگے کہ "گرمی کا موسم تھا اور رات کا وقت۔ کوئی نو بجے ہونگے۔ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ کوئی بزرگ صورت آدمی ملاقات کے لئے آیا ہے۔ میں نے کہا بلاؤ، ملازم اسے ساتھ لے آیا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ معتقدات اور صوفیہ کا ذکر چل پڑا۔ باتوں باتوں میں گیارہ بج گئے، پھر انہوں نے جانے کی اجازت طلب کی۔ اندھیری رات تھی، میں شکل و صورت کو اچھی طرح نہ دیکھ سکا تھا۔ جب وہ جانے کے لئے اُٹھے تو میں لپک کر برآمدے میں سے لالٹین اُٹھا لایا اور ان کے ساتھ دروازے تک آیا۔ یہاں کافی روشنی تھی۔ اب جو میں نے انہیں دیکھا تو وہی بزرگ تھے جن سے سفر کے دوران میری ملاقات ہوئی تھی اور کچھ روز سے مجھے ان سے ملنے کا پھر سے شوق تھا۔ میں نے ان سے بغل گیر ہونے کے لئے جھک کر لالٹین زمین پر رکھ دی، لیکن اسی اثنا میں وہ اللہ والے وہاں

نہیں تھے۔ میں کچھ دیر وہیں کھڑا انہیں ادھر اُدھر دیکھتا رہا، پھر مایوس ہو کر واپس آیا۔ نجانے وہ اللہ والے آنکھ جھپکنے میں کہاں غائب ہو گئے۔ اس واقعہ کا میری طبیعت پر کئی روز اثر رہا۔"

افسانہ اور الہامی کتابیں

ایک روز میں حضرت علامہ کی خدمت میں اپنے افسانوں کا مجموعہ جو کتابی صورت میں شائع ہوا تھا نذر گزارنے حاضر ہوا۔ چودھری محمد حسین بھی موجود تھے۔ میں نے کتاب پیش کی، حضرت علامہ نے کتاب لے لی اور پانچ سات منٹ اسے دیکھتے رہے۔ پھر فرمانے لگے:

"اسلم اب تم مصنّفین کی صف میں شامل ہو گئے ہو!" میں نے عرض کیا:

"ڈاکٹر صاحب یہ سب آپ ہی کی کرامت ہے۔ آپ نے ہی اس راہ پر ڈالا تھا" آپ مسکرا کر خاموش ہو رہے۔ چودھری محمد حسین نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا "آپ کس انگریز مصنّف سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں" مَیں نے کہا "مجھے سب سے زیادہ ڈیوما اور سر والٹر سکاٹ پسند ہیں، اس کے بعد وکٹر ہیوگو" چودھری محمد حسین بولے "مغرب والے تو اس فن کے موجد ہیں۔"

"بالکل غلط ہے" حضرت علامہ نے ایک جذبے سے فرمایا۔ "ہماری دُنیا میں افسانہ الہامی کتابوں سے آیا ہے، جس میں قرآن مجید پیش پیش ہے۔ زبور، توریت اور انجیل میں بھی افسانے یا افسانوں کے ڈھانچے ملتے ہیں، لیکن قرآن حکیم میں واقعات کو پورے افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے، مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ جسے خود اللہ تعالےٰ نے احسن القصص کہا ہے، پھر حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کا قصہ اور حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے واقعات الہامی افسانے ہی تو ہیں۔ مغرب والوں نے افسانہ لکھنا الہامی کتابوں ہی سے سیکھا ہے۔ ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی اہلِ قلم نے افسانے کے فن میں بہت جدت سے کام لیا ہے"

اور اس کی نوک پلک کو خوب سنوارا ہے"۔

مخلوط تعلیم

حضرت علامہ مخلوط تعلیم کے مخالف تھے۔ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا بھی انہیں پسند نہ تھا۔ آپ مسلمان عورت کے لئے پردہ بہت ضروری سمجھتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے مسلمان عورت کی شان پردے ہی میں ہے۔ آپ کے نقطۂ نظر کے مطابق مسلمانوں کی موجودہ پستی کی ایک وجہ بے پردگی بھی تھی۔ چونکہ آپ کے دل میں اسلام کی محبت اور درد تھا اس لئے آپکے ہاں کا ماحول زیادہ تر اسلامی تھا۔ عورت کی آزادی کو اس کا فطری حق سمجھتے تھے لیکن آپ کے نقطۂ نظر سے عورت کی آزادی سے مراد وہ آزادی تھی جو اسے اسلام نے عطا کی تھی۔ عورت کی موجودہ آزادی کو حضرت علامہ عورت کی بے راہروی سمجھتے تھے اور اس کے شدت سے مخالف تھے۔

گرمیوں کا موسم تھا، حضرت علامہ حسبِ دستور کوٹھی کے برآمدے کے سامنے پلنگ پر استراحت فرما رہے تھے اور نصف آستین کی بنیان اور سپید لٹھے کا تہہ بند پہنے ہوئے تھے۔ پلنگ کے پاس ایک طرف چوہدری محمد حسین اور میں کرسیوں پر بیٹھے تھے اتنے میں ایک صاحب (نام یاد نہیں رہا) جو اکثر حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، بائیسکل پر ہانپتے کانپتے آئے، وہ کسی روزنامہ کے رپورٹر تھے۔ چوہدری محمد حسین نے ان کی پریشانی دیکھ کر مسکرا کر پوچھا۔ "راستے میں کسی باؤلے کتے سے تو واسطہ نہیں پڑا"۔ انہوں نے حضرت علامہ کو سلام کیا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ "کہاں سے آ رہے ہو؟" چوہدری محمد حسین نے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ ابھی سینٹ ہال کی ایک میٹنگ سے اٹھ کر آئے ہیں۔

"کیا ہوا وہاں"؟ حضرت علامہ نے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" اخباری نمائندے نے جواب دیا۔ "آج خلیفہ صاحب نے سینٹ میں مخلوط تعلیم کا ریزولیشن پاس کروا لیا ہے۔"

یہ سنتے ہی حضرت علامہ کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا، آپ پلنگ پر بڑے زور سے ہاتھ مار کر بولے:

"آج مسلمانوں کی ذِلّت پہ مہر لگا دی گئی ہے۔"

مرزا محمد منوّر

ابو الاثر اقبال کے حضور میں

میں نے بارہا حفیظ صاحب سے کہا کہ آپ نے حضرت علامہ سے اپنی ملاقاتوں کا کبھی تحریراً ذکر نہیں کیا۔ جو لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے ہیں ان میں سے بہت سے حضرات نے ان ملاقاتوں کی روداد قلمبند کی ہے۔ آپ بھی کسی وقت کچھ لکھ ڈالیں۔ مگر انہوں نے ہمیشہ میری بات کو توڑ موڑ کر "تصوف" میں ڈال دیا۔ ایک دفعہ میں زیادہ مُصر ہوا تو جل کر کہنے لگے۔ "بھائی صاحب! لوگ ڈاکٹر صاحب سے اپنی ملاقاتوں کی روداد اس لئے نہیں لکھتے کہ اس میں بہتوں کا بھلا مضمر ہوتا ہے۔ وہ اس لئے لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اپنی نسبت کا اظہار کر کے اپنی آپ کو بڑا ثابت فرمائیں۔ مجھے خدا کے فضل سے ایسی کوئی احتیاج نہیں۔"

تاہم اپنا ارادہ تھا کہ انہیں کسی روز مائل کر دونگا اور حضرت علامہ کے معاملے میں چھیڑ کر ساتھ ساتھ نوٹ لیتا رہوں گا اور پھر جب فرصت میسّر آئے گی تو ترتیب دے ڈالوں گا۔ حق تو یہ ہے کہ حفیظ صاحب پچھلی نصف صدی کی چلتی پھرتی تاریخ ہیں ان کی ملاقاتیں کسی کس سے نہیں رہیں؟ اور حافظے کی غیر محفوظیت کے باوصف انہیں کیا کیا کچھ یاد نہیں؟ مگر وہ خود کچھ نہیں لکھیں گے ——— ان کا پختہ ارادہ ہے کہ سب یادیں اپنے ہمراہ لحد میں لے جائیں خواہ سو سال کے بعد یہ موقع ہاتھ آئے اور وہاں ان یادوں کو

دہرا دہرا کر منکر نکیر کو بہلائیں یا شاید بہکائیں۔ خدا ان کے ارادوں کو بابرکت کرے۔

ہاں تو ذکر کر رہا تھا کہ حفیظ صاحب کو حضرت علاّمہ کے معاملے میں چھیڑ کر کچھ لکھ لینے کا ارادہ تھا۔ لیکن اس ارادے کو تکمیلی صورت دینے کے لئے محترم برادر آغا شورش صاحب کا گرامی نامہ بڑا نیک بہانہ بن گیا ــــــــ شورش صاحب نے مطالبہ کیا کہ یا میں "اقبال کے مخالفین" پر کوئی دبنگ سا مقالہ لکھوں یا "الوالاثر" صاحب سے حضرتِ علاّمہ کے ساتھ ان کی ملاقاتوں سے متعلق (انٹرویو) کروں۔ آغا صاحب کا مطالبہ تازیانہ بنا اور میں نے حفیظ صاحب کو جا پکڑا۔ انہیں بذریعہ خط اپنے نیک ارادے سے مطلع کر رکھا تھا۔ اور دُکھ کی بات یہ ہے کہ وہ بھی ذہناً کچھ تیار ہو چکے تھے ــــــــ واقعی آدمی کا کیا اعتبار؟

حفیظ صاحب اگرچہ علاّمہ سے متعلق باتیں کرنے پر آمادہ تھے تاہم پوچھا "بھائی صاحب! آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں اور ان باتوں سے حاصل بھی کیا ہوگا" میں نے جواباً عرض کیا "تمہید کی کوئی ایسی شدید ضرورت نہیں ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ نے پہلی بار حضرت علاّمہ کا نام کس عمر میں سُنا تھا؟"

بولے، میں نے پہلی بار ڈاکٹر صاحب کا نام جب سُنا اس وقت میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ عمر کوئی آٹھ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ مرعوب اس لئے نہ ہوا کہ اس عمر میں آدمی ایسی کمزوری سے محفوظ ہوتا ہے۔ میرے والد بزرگوار کے پاس کچھ پڑھے لکھے افراد آن بیٹھتے تھے جن میں بعض ڈاکٹر صاحب کی نظمیں خوشخط لکھا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو دکھاتے تھے۔ ایک نظم یہ بھی تھی ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے

میں "کدوں کے" کا معنیٰ تو "کب کے" سمجھا۔ پنجابی میں یہی مفہوم ہے۔ صنم کا مطلب

نازو ادا یا یوں کہو کہ ناز نخرہ جانا۔ لہٰذا اپنے ایک برہمن ہم جماعت کو چھیڑنے کے لئے یہ شعر یاد کرلیا۔ پھر اُسے بارہا دہرایا اور بارہا برہمن کو پریشان کیا۔ معنیٰ اُس کم بخت کو بھی معلوم نہ تھا۔

میں نے پوچھا "بچپن میں آپ نے حضرت علامہ کے شعر کبھی یاد کئے"؟ حفیظ صاحب نے جواب دیا کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے شعر یاد نہیں کئے۔ اُس دور میں مسدس حالی کا چرچا زیادہ تھا۔ میلاد کی محفلوں میں مسدس کے نعتیہ حصے پڑھے اور گائے جاتے تھے۔ میں نے بھی مسدس ہی کے اشعار زیادہ یاد کئے ——— !

حالی کی مناجات ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے

اُمت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

بھی مجھے زبانی یاد تھی ——— نعتوں کے چھوٹے چھوٹے مجموعے اُس دور میں عام ملتے تھے مجھے میلاد کی محفلوں میں بچپنے ہی سے بُلایا جانے لگا تھا۔ میرے ہم عمر اور بھی تھے، جو نعت خوانی فرماتے تھے۔ مگر میرا "رہا" اچھا تھا۔ اس لئے میں زیادہ مقبول ہوگیا۔

ہمارے نصاب کی ایک کتاب میں ڈاکٹر صاحب کی نظم "بُلبُل کی فریاد" تھی۔ اساتذہ نے اس سے سچ مچ کی بُلبُل مُراد لی ——— اگر سیاسی معنی اُن کی سمجھ میں آ بھی جاتے تو جب بھی ہمیں نہ سمجھا سکتے۔ اسلئے کہ ہم سمجھنے پر قادر ہی نہ تھے ——— بہرحال میں خود بھی شعر کہتا تھا۔ دوسری جماعت میں پہلی بار شعر کہا۔ چھٹی جماعت میں پہنچا تو غزل کہنے لگا ——— اب حالی سے بھی تعلقات کچھ کشیدہ سے ہوگئے تھے اور وہ اس لئے کہ میں خود شاعر بن رہا تھا اور یہ حضرت اعلان کرچکے تھے کہ ؏

جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

ساتویں جماعت میں تھا کہ مدرسے سے بھاگ اُٹھا۔ اب شاعری کا شوق بے پناہ تھا اور داغ، رند اور امیر مجھے پسند تھے، داغ خاص طور پر ——— کسی قدر اکبر سے بھی عقیدت تھی۔

اکبر کے مفاہیم سے تو کیا آگاہ ہوتا، البتہ ان کی طنزیہ شاعری پر فریفتہ اور استعدادِ قافیہ بندی سے مرعوب تھا......"

میں نے بات کاٹی اور قطع کلامی کی معافی چاہے بغیر پوچھا کہ آپ نے حضرتِ علامہ کو سب سے پہلے کس عمر میں دیکھا؟ پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟

حفیظ صاحب بولے "میرا خیال ہے کہ میں نے پہلی بار ڈاکٹر صاحب کو ۱۹۱۷ء میں دیکھا تھا۔ لاہور میں ایک مشاعرہ تھا۔ جنگی قسم کا مشاعرہ، جنگِ عظیم اوّل جاری تھی میں اس سے قبل جالندھر میں ایک جنگی مشاعرہ جیت چکا تھا یعنی میری نظم پسند کی گئی تھی اور مجھے انعام دیا گیا تھا۔ یہ دَور اوڈوائر کی گورنری کا تھا۔ لاہور کا مشاعرہ بہت بڑا معاملہ تھا۔ مقام تھا بریڈلا ہال ——— بہت سے وہ شاعر بھی جو کالج کی پیداوار تھے جمع ہو رہے تھے دیگر کئی مشاہیرِ شعر آزیبِ محفل تھے ——— ڈاکٹر صاحب بھی آئے ہوئے تھے گو میں انہیں نہیں پہچانتا تھا۔ مشاعرے سے قبل گویوں نے ایک نظم گائی ؎

یا رب رہے سلامت فرمانروا ہمارا

جہاں تک یاد پڑتا ہے اُس مشاعرے کا اہتمام خان صاحب عبدالعزیز نے کیا تھا جو ماہنامہ "حق" کے مدیر تھے۔ حکیم احمد شجاع مددگار مدیر تھے۔ جالندھر کا مشاعرہ بھی انہی عبدالعزیز صاحب ہی کی کوششوں سے عمل میں آیا تھا۔ ماہنامہ "حق" انگریزوں کی حمایت و پاسداری کا دم بھرتا تھا۔

مشاعرہ شروع ہوا مگر بے قابو ہو گیا۔ بڑے بڑے شاعر ہوٹ ہو گئے۔ ڈاکٹر نارنگ صاحب سے کہا گیا کہ وہ مجمع کو خاموش کرائیں۔ مگر نارنگ صاحب کی تلقین کے جواب میں سینکڑوں منکوں کے منہ کھل گئے یعنی لوگوں نے باآوازِ بلند شُوں شُوں کرنا شروع کر دیا۔ آخر جب کوئی چارہ کار نظر نہ آیا تو ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں گذارش کی گئی۔ ڈاکٹر صاحب کے اُٹھتے ہی سب آوازیں بیٹھ گئیں۔ پورے ہال پر خاموشی مسلط ہو گئی۔ میں دُور بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر

صاحب نے ایک فارسی نظم سُنائی جس کا مضمون یہ تھا کہ قوموں کا کردار کیونکر بنتا ہے۔
میں ڈاکٹر صاحب سے بہت مرعوب ہُوا - حد ہے کہ ایسا بے قابو مجمع جو کسی کی منّت نہ مانے ایک شخص کے اُٹھ کر سامنے آتے ہی صُمٌّ بُکمٌ ہو جائے -

پھر اتنا یاد ہے کہ رولٹ ایکٹ کے پیدا کردہ ہنگامے شروع ہو گئے - جالندھر میں صُوبائی کانگرس کا اجلاس ہونے والا تھا - ڈاکٹر سیف الدین کچلو، لالہ دینا ناتھ اور سردار موتا سنگھ امرتسر سے آئے ہوتے تھے - ڈاکٹر کچلو شاعروں کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے میرے مکان پر آن پہنچے - میرے والد سے ملے اور کہا، سُنا ہے آپ کا بیٹا شاعر ہے؟ والد صاحب بولے "ہاں، کچھ اِدھر کی اُدھر کرتا ہی رہتا ہے" - میں اندر سے آیا تو ڈاکٹر کچلو نے پُوچھا "قومی کام کرو گے؟" میں نے عرض کیا "ضرور کروں گا" کہا "تو کل نظم پڑھو"!

دُنیا گرمائی ہوئی تھی، میں بھی گرمایا ہُوا تھا - گرما گرم نظم لکھی —— سردار موتا سنگھ اور لالہ دینا ناتھ کی تقریر کے بعد مجھے میز پر کھڑا کر دیا گیا - ایک مِل مالک راجہ داس صدرِ جلسہ تھے - ہجوم بے پناہ تھا - اصل میں جالندھر بڑا ہنگامہ پرور شہر تھا - اس دَور میں اکثر جالندھری ہندو مسلمان کانگرسی تھے اور پھر جب خلافت کا زور ہُوا تو جالندھری مسلمانوں کی بھاری اکثریت خلافتی بن گئی - ہاں تو میری نظم کو بہت پسند کیا گیا - ڈاکٹر کچلو مرحوم نے اپنی تقریر میں میری نظم کے حوالے دیئے —— دُوسرے یا تیسرے روز امرتسر کے باغ جلیانوالہ میں گولی چل گئی - رام جی داس اور مجھے جالندھر سے گرفتار کر کے لاہور پہنچا دیا گیا - میں تین روز حوالات میں رہا اور پھر چھوڑ دیا گیا -

کچھ یوں یاد پڑتا ہے کہ میری پہلی ملاقات علاّمہ اقبال سے امرتسر میں ہوئی تھی - کانگرس اور خلافت کے جلسے ہو رہے تھے - مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بھائی شوکت علی، چھندواڑہ جیل سے رہا ہو کر امرتسر پہنچے اور ان جلسوں میں شریک ہوئے - علاّمہ اقبال لاہور سے آ کر شریک جلسہ ہوئے - مجھے بھی نظم پڑھنے کے لئے جالندھر سے بُلوایا گیا - اب میں بھی خاصہ حساب

شمار ہیں تھا۔ اس جلسے میں چوہدری شہاب الدین بھی موجود تھے۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم "اسیری" سنائی تھی۔ جلسے کے اختتام پر میں نے ہجوم میں داخل ہو کر علامہ اقبالؒ سے ہاتھ ملایا۔ ڈاکٹر کچلو نے علامہ اقبال سے کہا "یہ ہمارا شاعر ہے۔ اس میں آگ بھری ہے"۔ علامہ اقبال نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ مسکرائے اور فرمایا "اچھا ہے" مجھے خوب یاد ہے، یوں گویا کل کی بات ہو۔ یہ بھی یاد ہے کہ چوہدری شہاب الدین کسی سے کہہ رہے تھے۔ "تمہیں کیا معلوم ڈاکٹر اقبال کو کس مشکل سے لایا گیا ہے"۔

میں اسی زمانے میں مولانا گرامی کا شاگرد ہوا تھا۔ وہ حیدر آباد سے پنشن پا کر تشریف لے آئے تھے۔ لاہور میں میرے کچھ رشتہ دار تھے۔ جب بھی ان سے ملنے کے لئے آتا ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ کبھی کبھی گرامی صاحب کی کوئی چٹھی بھی ڈاکٹر صاحب کے نام لاتا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب انارکلی کے ایک بالاخانے میں رہتے تھے۔ عموماً پچھلے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ کبھی کبھی سرِ شام بازار کا نظارہ کرنے کی خاطر چھجے پر بھی بیٹھ جاتے تھے۔ تین چار بار گرامی صاحب کی معیت میں بھی حاضر ہوا ——— اور دونوں بزرگوں کی باتیں خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ باتیں عموماً شعر و شاعری ہی کی ہوتی تھیں۔ کوئی "مزاح" بھی ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب گرامی صاحب کو کبھی کبھی پیر و مرشد کہہ کر بھی خطاب کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض مصرعوں پر ردّ و کد شروع ہو جاتی تھی اور عموماً ڈاکٹر صاحب گرامی صاحب کی رائے کو قبول کر لیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک بار یہ بھی کہا کہ "آپ کا تعلق ہر وقت سروش سے قائم رہتا ہے"۔

مولانا گرامی ایک بار انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں بھی تشریف لائے ——— ڈاکٹر صاحب نے تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا، "یہ ہمارے دور کے فارسی کے ملک الشعرا ہیں...... آپ لوگوں کی اولادیں اس بات پر فخر کریں گی کہ آپ نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا"....

میں نے جالندھر سے ایک رسالہ نکالا۔ سرپرست اس کے گرامی تھے۔ یہ ۱۹۲۱ء کی بات

ہے۔ رسالے کا نام "اعجاز" تھا   میں مولینا گرامی کا خط لے کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور "اعجاز" کے لئے نظم مانگی ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "بہت سے شعر نہیں دے سکتا۔ جس زمین میں کاشت زیادہ ہو وہ بنجر ہو جاتی ہے۔ یہی حالت آجکل اپنی ہے۔ یہ دو شعر لے جاؤ۔ یہی اس وقت تازہ ہیں۔ ان میں سے ایک شعر یہ تھا ؎

از خاک سمرقند ترسم کہ دِگر خیزد
آشوبِ ہلاکوئے ہنگامۂ چنگیزے

دوسرا شعر یاد نہیں ——— میں نے ان شعروں کو چوکھٹے میں فرمودۂ اقبال کے عنوان سے چھاپا۔ یہ رسالہ بے چارہ شعلۂ مستعجل تھا۔ یوں کہ میرا ایک دوست پنڈت نظر سوہانوی میرے یہاں مہمان ہوا۔ کچھ روز قیام کرکے اچانک غائب ہو گیا۔ اس کے غیاب کے بعد پتہ چلا کہ وہ صندوقچی غائب ہے جس میں میں نے نہ جانے کس کس صعوبت کے ساتھ حاصل کر کے کچھ پونجی رکھی ہوئی تھی صندوقچی کا غیاب "اعجاز" کے شمسِ بازغہ کے غروب کا باعث بن گیا ؏

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

میں ۱۹۲۲ء میں لاہور چلا آیا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اُس وقت ڈاکٹر صاحب میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں مقیم تھے   مجھے حاضری کے مواقع زیادہ ملنے لگے۔ عبدالمجید سالک مرحوم، مرتضیٰ احمد خاں میکش مرحوم اور نشتر جالندھری میرے دوست تھے۔ میں کبھی اُن کی معیت میں اور کبھی اکیلے ڈاکٹر صاحب کے یہاں پہنچ جاتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ حفیظ صاحب! کبھی حضرت علامہ نے آپ لوگوں سے شعر سُنانے کی بھی فرمائش کی تھی؟ حفیظ صاحب بولے "علامہ جانتے تھے کہ ہم سب شاعر ہیں، مگر انہوں نے ایسی فرمائش شاذ ایک بار کی تھی ——— میں تو ہمت نہ کر سکا البتہ نشتر جالندھری نے ایک غزل سُنانی شروع کر دی جو انہوں نے ڈاکٹر صاحب ہی کی ایک غزل کی زمین میں کہہ رکھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بے دلی سے سُنی۔ ہم باقی ساتھی سخت شرمندہ تھے۔ واپسی پر نشتر صاحب اور ان کے احباب

میں جچ ہو گئی ـــــ حق تو یہ ہے کہ نشترؔ صاحب پکے شاعر تھے ـــــ اور مجھے کچھ یوں یاد پڑتا ہے جیسے اُنہوں نے ایک رجسٹر بھی کھول رکھا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب کی شعری خطاؤں اور خامیوں کو قلمبند کرتے رہتے تھے۔

تقریباً یہی زمانہ تھا کہ میری نظم "فرصت کی تلاش" روزنامہ "زمیندار" میں شائع ہوئی۔ لکھنؤ سے "اودھ پنچ" نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور "بے تکی نظم" کے عنوان سے لے دے شروع کر دی۔ اُس کی تحریفیں یعنی پیروڈیاں بھی چھاپ دیں۔ میں جواباً کچھ عرض کرنا چاہتا تھا۔ لیکن حُسنِ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت "اودھ پنچ" کا وہ شمارہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے تھا۔ بولے "حفیظ جی! یہ پڑھا ہے؟" میں نے عرض کیا، "پڑھا ہے اور میں اس کا منہ توڑ جواب دوں گا۔" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: "جواب نہیں دینا چاہیئے۔ جب کوئی GENIUS پیدا ہوتا ہے تو لوگ اس سے یہی برتاؤ کرتے ہیں۔" مجھے GENIUS کے معانی معلوم نہ تھے۔ مگر چونکہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا تھا۔ اس لئے خیال تھا کہ کوئی اچھی بات کہی ہو گی۔ مدت کے بعد اس لفظ کا معنی کھلا، اور میں بہت خوش ہوا۔ اور فخر سے اکڑ گیا ـــــ یہ الفاظ کہہ کر حفیظ صاحب چند لمحے اکڑ کر بیٹھے رہے، اور پھر بولے ـــــ سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء میں، میں "تہذیب" اور "پھول" میں کام کرتا تھا۔ یعنی اُن کا ایک طرح سے مدیر تھا۔ انہی دنوں ایک ہندو روزنامے میں ڈاکٹر صاحب کے کلام پر اعتراضات آنے لگے۔ لاہور کے کچھ لوگ جن میں لال دین قیصر آگے آگے تھے یہ سمجھتے تھے کہ یہ میری کارستانی ہے ـــــ ڈاکٹر صاحب پر اعتراضات کرنے والے بزرگ "جراح" کے نام سے لکھتے تھے۔ میں اور میرے بعض شاگرد ان اعتراضوں کے جواب لکھتے تھے۔ مگر جو لوگ مجھ سے بدظن تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے ایک پاکھنڈ کھڑا کر رکھا ہے۔ خود ہی اعتراض کرتا ہوں، خود ہی جواب لکھتا ہوں۔ نوبت باینجا رسید کہ ان لوگوں نے میری پٹائی کرنے کا پروگرام بنایا۔

میں نے بات کاٹی "تو پھر حفیظ صاحب! مرست ہوئی بھی یا حسرت ہی رہی۔"
حفیظ صاحب نے مسکراہٹ دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔" حسرت ہی رہی کم ازکم اس وقت ——— مرست ہوئی مگر ایک اور موقع پر اس کا ذکر پھر کروں گا۔" ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ میں لال دین قیصر صاحب اور ان کے رفقائے عزیز کے ہاتھوں پٹنے سے محفوظ رہا۔ اس لئے کہ راز جلد ہی فاش ہو گیا اور پتہ چل گیا کہ "جراح" صاحب پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی ہیں ——— وہ ڈاکٹر صاحب کے اُستاد بھائی تھے۔ داغ کے شاگرد تھے، بھلا وہ ڈاکٹر صاحب کو کیوں کر خاطر میں لاتے۔ بہرحال جراح صاحب کی "جراحی" کو روک دیا گیا۔

۱۹۲۵ء میں، میں ایک ریاست میں شاعرِ دربار ہو کر چلا گیا۔ وہاں "رقاصہ" لکھی، اور جیل انعام میں پائی۔ مگر جلد ہی "خیر سے بدھو گھر کو آئے"۔ یعنی میں لاہور واپس تشریف لے آیا اور "حمایتِ اسلام" کا ایڈیٹر بنا۔ پھر "مخزن" کو ازسرِ نو زندہ کیا ——— اور "مخزن" کے لیے کچھ لینے کی نیت سے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ "پیام مشرق" پریس سے آنے ہی والی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ "پیام مشرق" میں مشمولہ غزلوں یا نظموں میں سے کوئی دے دیجئے۔ تاکہ کتاب کے آنے سے قبل میرے یہاں چھپے۔ میری "معتبری" ہو جائیگی مگر ڈاکٹر صاحب نے میری نیازمندی کا کوئی خیال نہ کیا، صاف انکار کر دیا اور کہا جب "پیام مشرق" نکل آئے تو اس میں سے نقل کر لینا ——— میں اپنا سا منہ لے کر لوٹ آیا، اور پھر کبھی اس غرض سے ان کے ہاں نہ گیا۔" یہ کہہ کر حفیظ صاحب چپکے ہو گئے۔

میں نے پھر چھیڑا۔ "مگر حفیظ صاحب یہ تو فرمایئے کہ آپ نے حضرت علامہ کو کبھی اپنا کلام سنایا؟"

حفیظ صاحب چونکے اور بولے "سنایا اور وہ یوں کہ میں "سوز و ساز" کی کاپیاں پڑھ رہا تھا ——— اچانک سر راس مسعود ماڈل ٹاؤن میں میرے غریب خانے پر تشریف

لائے۔ میرے سامنے میری نظم "تین نغمے ——— ٹیگور، اقبالؔ، حفیظؔ کی کاپی کھلی پڑی تھی۔ یہ شاہنامہ جلد اول کے شائع ہو جانے سے بعد کی بات ہے۔ سر راس مسعود کو یہ نظم بہت ہی پسند تھی۔ لہٰذا دیکھتے ہی فرمایا "پکڑا گیا ——— اور پھر کاپی چھین لی۔ پیٹی اور اٹھ کھڑے ہوئے ——— مجھ سے کہا چلو میرے ساتھ" ——— میں چل دیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ مجھے سر محمد شفیع مرحوم کے ٹھکانے پر لے جائیں گے۔ کیونکہ وہ لاہور میں عموماً انہی کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ مگر وہ مجھے ڈاکٹر صاحب کے مکان پر لے گئے اور جاتے ہی کہا "میں تمہارے چور کو پکڑ لایا ہوں۔ یہ تمہارے لئے لکھتا ہے اور تمہیں سناتے ہوئے شرماتا ہے۔" ڈاکٹر صاحب بولے "حفیظ جی کیا بات ہے؟ سناؤ۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کر کے اپنا کلام سنایا مجھے اس امر پر بڑا احساس فخر ہوا اور تا حال میرے احساس کا وہی حال ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس حصے سے بہت ہی متاثر ہوئے جہاں میں نے انہیں دریا سے تشبیہ دی تھی اور ان کے حضور اپنی عقیدت کا ہدیہ پیش کیا تھا۔ میں نے کہا تھا ؎

درد کی چیخیں اٹھیں میرے شکستہ ساز سے
آب دیدہ ہو گیا دریا میری آواز سے

ڈاکٹر صاحب کے آنسو نکل آئے اور جب میں نے یہ شعر پڑھا ؎

میرا نغمہ نغمۂ دریا سے کم آواز تھا
ہاں مگر ہم رنگ و ہم آہنگ و ہم آواز تھا

تو ڈاکٹر صاحب نے بے ساختہ کہا۔ "ہم آواز۔ ہم آواز"

نظم ختم ہوئی تو سر راس بولے "دیکھا میرا بیٹا؟ کیسا ہے؟ خدا نے میرے دادا کو... عطا کیا تھا۔ مجھے حفیظ دیا ہے" ——— سر راس سراپا اخلاص تھے۔ اپنے انداز میں کہے جا رہے تھے۔ میں کچھ ان کی بے پناہ شفقت اور کچھ ڈاکٹر صاحب کے رعب سے پس...

پسینہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ "حفیظ جی" تمہارا انداز بیان گرامی مرحوم کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ مرحوم نے تمہاری خوب تربیت کی ہے۔ ان کے شکر گزار رہو۔ اور حفیظ جی! کبھی کبھی آ بھی جایا کرو"۔

میں ان دنوں مصروف کچھ زیادہ ہی تھا۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے مواقع کم کم میسر آتے تھے —— میں نے بات کو پیچھے کی طرف موڑا اور حفیظ صاحب سے عرض کیا کہ وہ آپ کی پٹائی والا قصہ کیا تھا؟ —— بولے "وہ ڈاکٹر صاحب کے حامیوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ ان کے مخالفین کی عنایت سے عمل میں آئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب پنجاب کونسل کا الیکشن لڑ رہے تھے —— میں بھی ان کے "زندہ بادیوں" میں شامل تھا۔ مزنگ کی کمبوہ برادری کی اکثریت ڈاکٹر صاحب کی حامی تھی —— ارائیں حضرات کی اکثریت ان کی مخالف تھی۔ میں مزنگ میں ڈاکٹر صاحب کو "زندہ باد" کرتا پھرتا تھا کہ ارائیوں نے پکڑ لیا اور مرمت فرمانا شروع کر دی۔ کمبوہوں کے افراد موقع پر پہنچ گئے اور مجھے چھڑا لیا —— ہاں منوّر یار! تو اس الیکشن کے ضمن میں ایک واقعہ یاد آ گیا ہے وہ بھی سن لو۔ ڈاکٹر صاحب کے دوست تھے۔ دولت رام، فیروز پور کے رہنے والے تھے۔ وکیل تھے اور بڑے زندہ دل "محفلی" باوقار اور سیاسی و علمی اہمیت کے مالک —— انہوں نے فیروز پور میں ڈاکٹر صاحب کی انتخابی فتح کا جشن منایا۔ ایک مشاعرہ بھی رکھ دیا۔ ڈاکٹر صاحب سے مشاعرے میں شرکت کرنے اور ساتھ ہی صدارت کرنے کے لیے کہا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا میں بہتر سے بہتر شاعر مشاعرے کے لیے فراہم کر دوں گا مگر نہ اس مشاعرے کی صدارت کروں گا اور نہ اس میں کچھ پڑھوں گا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے، سالک صاحب مرحوم اور ہری چند اختر کے علاوہ دیگر کئی عزیزوں کو گھر بلوایا اور فیروز پور چلنے کو کہا۔ ہم لوگ پہنچ گئے۔ کھانے پینے کا بندوبست الگ قناتوں میں تھا اور اس کے بعد مشاعرے کا پنڈال الگ مگر ملحق —— مشاعرہ بڑا کامیاب رہا۔ میں نے بھی اپنا کلام سنایا "ابھی تو میں جوان ہوں" اور "پیٹے چلا جا" وغیرہ کئی نظمیں

پیش کیں۔

واپسی پر ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے ساتھ کار میں سوار کر لیا۔ راستے میں کہا ——

"حفیظ جی! میں قنات کے پیچھے بیٹھا سارا مشاعرہ سن رہا تھا۔ تمہاری نظمیں بھی سنیں۔ میں یہ سن کر جھینپ سا گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب سُن رہے ہیں —— پھر باتوں باتوں میں پوچھا "حفیظ جی! کبھی پی ہے؟" میں نے عرض کیا "پی تو نہیں"۔ تو فرمایا۔ "پیے چلا جا" کی قسم کی نظمیں کیوں کر کہہ ڈالیں؟" میں نے کہا آپ خود ہی تو فرماتے ہیں کہ شاعر کا تخیل "افطار السمٰوات" کے پار چلا جاتا ہے۔ بولے "ہاں —— مگر پیتے اور پھر چھوڑ دیتے"۔

مجھے یاد ہے کہ منٹو پارک نیا نیا بنا تھا۔ سنہ یاد نہیں، وہاں ایک بہت بڑی نمائش منعقد ہوئی۔ ایک آل انڈیا مشاعرہ ہونا بھی قرار پایا۔ میاں بشیر احمد صاحب (ہمایوں والے) کرتا دھرتا تھے۔ صدارت سر عبدالقادر کو کرنا تھی۔ مجھ سے میاں بشیر صاحب نے شمولیت کے لئے فرمائش کی میں نے انکار کر دیا۔ اصل بات یہ تھی کہ میرے دوست تاثیر اور کچھ دیگر احباب نے یہ طے کیا تھا کہ اس مشاعرے میں شریک نہ ہوں گے مگر میں نے میاں صاحب کے سامنے یہ عذر پیش کیا کہ میں نمائشی قسم کے مشاعروں میں شامل ہو کر خوشی محسوس نہیں کرتا۔

تاہم جب مشاعرہ شروع ہوا تو وہاں میرے منع کرنے والے سب دوست شامل تھے۔ باہر سے آنے والوں میں ساغر اور جوش ملیح آبادی وغیرہ بھی تھے۔ جوش صاحب نے نہایت عریاں نظمیں اور عالی قدر ملحدانہ رباعیاں سنائیں اور ہندوؤں، سکھوں کے ہجوم بے پناہ میں دین کا خوب مضحکہ اڑایا۔

چنانچہ مشاعرے سے اگلے روز ڈاکٹر صاحب نے مجھے بلوایا اور سرزنش کے لہجے میں کہا۔ "تم رات کے مشاعرے میں کیوں شامل نہ ہوئے؟" میں نے عرض کیا —— حضور وہ نمائشی مشاعرہ تھا اور میں —— ابھی میرا جواب بے صواب مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ فرمایا:

"تم ہر طرح کے مشاعرے میں شریک ہوتے ہو مگر جب تمہاری ضرورت تھی تم غائب ہو گئے"

یہ لوگ یہاں اپنے شعروں کی مدد سے کیا پھیلانا چاہتے ہیں؟ تم اس کا ردّ پیش کر سکتے ہو۔ اُن کا تعاقب کرو" ——— حق تو یہ ہے کہ اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ڈانٹ دیا مگر مجھے

مجھے اس ڈانٹ پر فخر ہے میں اسے اپنے لئے ایک بہت بڑی سند اعزاز جانتا ہوں

حفیظؔ صاحب یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔ مَیں نے بات بڑھائی۔ حفیظ صاحب مجھے کچھ یوں یاد پڑتا ہے کہ ایک بار آپ نے ذکر کیا تھا کہ جب آپ نے شاہنامہ لکھنے کا پروگرام بنایا تو ڈاکٹر صاحب نے آپ کی حوصلہ افزائی نہ کی تھی؟ ——— حفیظؔ صاحب چونکتے ہوئے اور کہنے لگے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا تھا کہ کوئی بھرپور تاریخ شعر میں بیان کی گئی تو وہ ایک ثقیل سی شے بن جائے گی۔ عوام کے کسی کام نہ آئے گی۔ محض کتب خانہ کی زینت ہو گی۔ لہٰذا انہوں نے تجویز پیش کی تھی کہ میں ایک مسلسل و مربوط تاریخ قلم بند کرنے کے بجائے علامہ شبلی کی طرح چھوٹی چھوٹی اسلامی نظمیں لکھوں ——— یہ زیادہ مفید کام ہو گا ——— مَیں نہ ٹلا اور شاہنامہ شروع کر دیا۔ جب پہلی جلد چھپ گئی اور ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گذری تو انہوں نے پسند فرمائی جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب مَیں حج پر جانے لگا اور ڈاکٹر صاحب کے حضور وداعی ملاقات کے لئے پہنچا تو انہوں نے آبدیدہ ہو کر فرمایا تھا، "حفیظ جی! شاہنامہ ساتھ لے جاؤ۔ اگر ہو سکے تو سرکار دو عالمؐ کی خدمت میں پیش کرنا" پھر جب ڈاکٹر صاحب کو گردے کی تکلیف ہوتے تو مجھے بلوایا اور مجھ سے شاہنامہ کے مختلف حصے سُنے۔ خصوصاً وہ حصے جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ذکرِ جمیل تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں جب "یومِ اقبال" منایا گیا تو اس محفل میں مَیں بھی شریک تھا۔ مَیں نے اپنی نظم "میرا اقبال" اس محفل میں پڑھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اگلے روز مجھے اپنے گھر پر بلوایا اور یہ نظم دوبارہ سُنی۔ ایک روز بیماری کی شدت میں مجھ سے کہا "حفیظؔ جی! تم میرا مرثیہ ضرور لکھنا"۔ مَیں رو دیا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے سفرِ آخرت اختیار کیا تو مَیں ملک سے باہر تھا۔ بہرحال مَیں نے ڈاکٹر صاحب کے ایک سے زیادہ مرثیے لکھے ——— ڈاکٹر صاحب

زندہ رُوح کے مالک تھے۔ وہ رُوح اب بھی زندہ ہے۔ مُردہ رُوحوں کو اُن کی رُوحِ پُر فتوح اب بھی زندگی عطا کئے جا رہی ہے۔ اس لئے ان کا مرثیہ عام مروّج معانی میں مرثیہ نہیں ہو سکتا ہاں صنفی نام یہی ہے ورنہ ان کی یاد تو زندگی ہے اور بھرپور زندگی۔"

احمد ندیم قاسمی

اقبال سے پہلی اور آخری ملاقات

مَیں مرتے دم تک اس بات پر فخر کروں گا کہ زندگی میں ایک بار تو میرے ہاتھ اقبال کے ہاتھوں سے مَس ہوئے۔ زندگی میں ایک بار تو مَیں نے اُس جلیل القدر فلسفی کو جی بھر کر دیکھا زندگی میں ایک بار تو میں نے اس منبعِ حکمت سے کسب فیض کیا۔ ۲۸ جون ۱۹۳۷ء کا دن تھا مَیں شام کے چار بجے دفتر روزنامہ انقلاب میں قبلہ سالک صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا سالک صاحب قبلہ میری چند تازہ نظمیں "تعمیرِ نو" "توحید کا دھارا" وغیرہ ملاحظہ فرما رہے تھے۔ کہ مولانا حسرت کاشمیری بھی تشریف لے آئے ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر فیصلہ ہوا کہ آج دو ڈھائی گھنٹے ڈاکٹر صاحب (مرحوم) کے دولت کدے پہ گذارنے چاہئیں۔

تم بھی کبھی ڈاکٹر صاحب کے ہاں گئے ہو ندیم، سالک صاحب نے مجھ سے پُوچھا۔

جی نہیں! میں نے جواب دیا۔

تو چلو ـــــ آج اکٹھے چلیں گے ـــــ اندھے کو تو دو آنکھیں چاہئیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں تنہا جانے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ جس صاحبِ اعجاز کے قلم سے "جاوید نامہ" جیسی آسمانی چیز نکل گئی ہو۔ اُسے دیکھنا میرے بس میں نہ تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ میرے حواس سُن ہو جائیں گے۔ مجھے کوئی سہارا چاہیئے تھا، سو بخوشی تیار ہو گیا۔

سالک صاحب قبلہ اور مَیں حسرت صاحب کی جائے قیام پر گئے۔ حسرت صاحب کو

کچھ کام کرنا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے مولانا اختر شیرانی تانگہ پر جاتے ہُوئے نظر آئے۔ سالک صاحب کو اور مجھے دیکھ کر اُنھوں نے تانگہ روکا۔ وہ حکیم نیّر واسطی صاحب کے ہاں جا رہے تھے۔ ہم تینوں اُن کے ہمراہ تانگے پر سوار ہو گئے۔ کیونکہ اختر صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ ہمیں جاوید منزل، پہنچا دیں گے۔ راستے میں افکار و حوادث اور مطائبات کے متعلق دلچسپ بحث جاری رہی۔

آخر ہم "جاوید منزل" کے سامنے پہنچے۔ اختر صاحب نے دُور سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر کہا۔ "اُف! ڈاکٹر صاحب تو بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ وہ نیّر صاحب کے ہاں تشریف لے گئے اور ہم تینوں آگے بڑھے۔ پلاٹ کے سرے پر کوٹھی کے برآمدے کے سامنے مشرق کا عظیم المرتبت مفکّر ایک چھوٹے سے تکیئے پر اپنی دائیں کہنی دھرے سات آٹھ اصحاب سے محوِ گفتگو تھا۔ دُرّانی صاحب کے سوا میں اُن صاحبان میں سے کسی کو نہ جانتا تھا ہمارے جانے پر اُن سب نے ڈاکٹر صاحب سے اجازت چاہی اور رُخصت ہو گئے انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے میں مَیں نے ڈاکٹر صاحب کو بہت دُور سے ایک بار دیکھا تھا۔ اب اتنی بڑی ہستی کو اپنے اس قدر نزدیک دیکھ کر مَیں نے محسوس کیا کہ میرا دماغ مسرّت تعجب اور احترام کے لامتناہی جذبات کے سیلاب سے گھومنے لگا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہلکے سبز رنگ کے شیشوں کی ایک عینک لگا رکھی تھی۔ چارپائی پر آلتی پالتی بیٹھ کر آپ نے فرمایا، "آیئے! سالک صاحب، حسرت صاحب کا کیا حال ہے" اور ان ہر دو حضرات سے مصافحہ کر کے آپ نے میری طرف دیکھا۔ "احمد ندیم قاسمی" سالک صاحب نے فرمایا آپ مُسکرائے، مصافحہ فرمایا اور پُوچھا "خیریت ہے؟ ـــــ میں نے رُکتے رُکتے عرض کی آپ کی عنایت ہے حضور ـــــ اُس وقت میں نے سمجھا کہ مجھ جیسا خُوش قسمت انسان شاید ہی اس دُنیا میں ہو۔ شاید ہر عظیم الشان ہستی سے پہلی بار مِل کر ہر شخص کے احساسات اس قسم کے ہی ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب آہستہ آہستہ حقہ کے کش لگا رہے تھے۔ فرمانے لگے، "سُنایئے حسرت صاحب

مطائبات کا کیا حال ہے۔

حسرت صاحب: زوروں پر ہیں جناب۔ پچھلے دنوں میں نے آپ کے حقّے کی خودی پہ بھی دو کالم لکھے تھے۔ شاید آپ کی نظر سے نہیں گذرے۔

ڈاکٹر صاحب: (مسکراتے ہوئے) ڈاکٹر صاحب نے مطالعہ سے روک رکھا ہے۔ کبھی کبھی شفیع (کچھ ایسا ہی نام تھا) سے اخبار کا کوئی حصّہ پڑھوا لیتا ہوں، خود نہیں پڑھ سکتا۔

حسرت صاحب: آجکل "افکار" اور "مطائبات" تو آموں کے لئے وقف ہیں۔

ڈاکٹر صاحب: سالک صاحب آپ کو تو یاد ہوں گے وہ دن جب آموں کی دعوتیں ہوا کرتی تھیں۔ اور رات کے بارہ بارہ ایک ایک بجے تک محفل گرم رہتی تھی۔

سالک صاحب: خوب یاد ہے جناب، انہیں کی یاد تو زندگی کا سرمایہ ہے۔ یہاں سے خدا جانے کس طرح گفتگو کا رُخ مولانا ظفر علی خان صاحب "زطلہ" کی طرف پھر گیا۔

ڈاکٹر صاحب: مولانا کی خداداد قابلیت میں کسے شبہ ہو سکتا ہے لیکن کاش خیالی مہموں کی بجائے وہ ٹھوس کاموں کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ اس سے زیادہ کر سکتے تھے۔

سالک صاحب: پچھلے دنوں مولانا فرما رہے تھے کہ وہ "زمیندار" میں مختصر کہانیوں کا سلسلہ شروع کریں گے۔ اور چونکہ اوریجنل افسانوں کی ہندوستان میں کمی ہے اس لئے اول اول انگریزی۔ امریکن، فرانسیسی، روسی اور جرمن افسانہ نگاروں کے ترجمے شائع کریں گے۔ میں نے کہا، یورپین افسانوں میں مقامی رنگ اسقدر ہوتا ہے کہ ہندوستانی قارئین بو کھلا جاتے ہیں۔ نیز اُن افسانوں کی طوالت کی ہمارے روزناموں کی محدود گنجائش متحمّل نہیں ہو سکتی۔

ڈاکٹر صاحب: (اپنی مخصوص مسکراہٹ سے) کیا مولانا نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں ڈیوما کے کاؤنٹ آف مانٹی کرسٹو کا ترجمہ بھی شائع کروں گا وہ بھی تو مختصر افسانہ ہے۔

اس پر ایک طویل قہقہہ پڑا اور ڈاکٹر صاحب دھیرے دھیرے حقّے کے کش لگانے لگے۔

ڈاکٹر صاحب: افسانوں کے نفسیاتی پہلو کی لذّت کا تو میں بھی معترف ہوں لیکن اگر اُن کی جگہ کوئی ایسی چیز پیش کی جائے۔ جو افسانے کا افسانہ ہو، اور سبق کا سبق تو بہتر رہے گا۔ دیکھئے اسلام کے اولوالعزم فرزند ایسی ایسی مہمیں سر کر گئے ہیں، ایسے ایسے معرکے طے کر چکے ہیں کہ جن کا تذکرہ بہترین سے بہترین افسانوں سے دلچسپ رہے گا۔ میری تو مدّت سے یہ خواہش ہے کہ کسی باہمت ادیب یا مؤرخ سے کہوں کہ وہ مختلف تذکروں کا سلسلہ شروع کرے۔ تذکروں کا یہ سلسلہ مسلمانوں کے لئے بے حد مفید رہے گا اور پھر مواد بھی کافی ہے۔ مثلاً تذکرہ صوفیائے اسلام، تذکرہ غازیانِ اسلام، تذکرہ فلسفیانِ اسلام، تذکرہ شعرائے اسلام تذکرہ مجاہدین وغیرہ ایک ایک کتاب کے لیئے بس سَو سَو ڈیڑھ ڈیڑھ سو صفحے کافی ہونگے۔

سالک صاحب: تذکرہ بلادِ اسلامیہ، تذکرہ غزواتِ اسلام۔

ڈاکٹر صاحب: ہاں یہ موضوع بھی نہایت شاداب ہیں، بلادِ اسلامیہ پر تو میں نے بھی ایک نظم کہی تھی۔

حسرت صاحب: جی ہاں، بانگِ درا میں موجود ہے۔

ڈاکٹر صاحب: بھئی مصیبت تو یہ ہے کہ ہمارے ادیب اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ آجکل کے مسلمانوں کو دیکھ کر اگلے لوگوں کے متعلق بھی اُن کا خیال کچھ اچھا نہیں رہا۔

سالک صاحب: کتنا زوال ہے اتنی زبردست بلندی پھر اتنی ہولناک پستی —— کتنا بڑا زوال ہے!

ڈاکٹر صاحب: ہاں پچھلے دنوں کسی جذباتی ایڈیٹر نے اپنے اخبار میں لکھا تھا کہ اگر آج گاندھی جی اور نہرو مسلمان ہو جائیں تو ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ میں نے کہا۔ اس غلام آباد میں نو کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ دو غلام اور مسلمان ہو جائیں تو یہ کیا کر لیں گے۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ نمودار ہوئی، جس کو اچھے اچھے قیافہ شناس نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اس کے بعد کسی قادیانی بزرگ کے متعلق باتیں ہوتی رہیں جو مصر کے سفر میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ تھے۔ آپ نے فرمایا

کہ جب مصریوں کو معلوم ہوا کہ ایک قادیانی اقبال کے ہمراہ تھا۔ تو اُنہوں نے اخباروں اور خطوط سے اس عجیب بات کے متعلق مجھ سے استفسار کیا۔ مَیں نے انہیں تسلی بخش جواب دے دیا۔

ہم تین گھنٹے وہاں بیٹھے اور آخر ہم تینوں نے رُخصت چاہی۔

آہ کتنی زبردست شخصیت تھی علامہ اقبال کی ـــــ اور کتنی عظیم الشان قابلیت کا مالک تھا شاعرِ مشرق۔ نوار کا پلنگ، ایک سادہ سا تکیہ۔ تکیہ کا سہارا لئے علامہ اقبال، بھورے بال چوڑا ماتھا، گہری سوچتی ہوئی آنکھیں، سفید زردی مائل رنگت، ہنس مکھ چہرہ ـــــ مجھے یہ نقشہ تادمِ مرگ نہ بھولے گا! اور جب ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ آگے بڑھایا اور میرا ہاتھ کانپتا ہوا اُس سے مس ہوا، تو مَیں سمجھا کائنات کا مقدس ترین خزانہ میں نے اپنی ناتواں انگلیوں میں تھام رکھا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال

اقبال ایک باپ کی حیثیت سے

میں نے سُن رکھا ہے کہ میری پیدائش سے چند سال قبل اباجان شیخ احمد سرہندی رح مجدّد الف ثانی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایک بیٹا عطا کرے۔ آپ نے حضرت مجدد سے یہ عہد بھی کیا کہ اگر خداوند تعالیٰ نے انہیں بیٹا دیا تو اسے ساتھ لے کر مزار پر حاضر ہوں گے

آپ کی دعا پوری ہوئی اور کچھ عرصہ بعد جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے اپنے ہمراہ لے کر دوبارہ سرہند شریف پہنچے۔ اُس سفر کے دھندلے سے تصورات میری نگاہوں کے سامنے ابھرتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ ان کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہو رہا ہوں۔ گنبد کے تیرہ و تار مگر پُر وقار ماحول نے مجھ پر ایک ہیبت سی طاری کر رکھی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میں اپنے چاروں طرف گھور رہا ہوں۔ جیسے میں اس مقام کی خاموش ویرانی سے کچھ کچھ شناسا ہوں۔ اباجان نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا۔ پھر انہوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ منگوایا اور دیر تک پڑھتے رہے۔ اس وقت صرف ہم دو ہی تربت کے قریب بیٹھے تھے۔ گنبد کی تاریک اور خاموش فضا میں ان کی آواز کی گونج ایک ہولناک ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔ ایک روز وہاں ٹھہرنے کے بعد ہم گھر واپس آ گئے۔ لیکن مجھ پر اس راز کا انکشاف نہ ہوا کہ آخر اُس

مزار پر جانے کا مقصد کیا تھا اور وہ آنسو کس لیے تھے ؟ مجھے یاد ہے کہ میں بچپن میں اکثر یہی سوچا کرتا۔

اپنی زندگی میں ابّا جان نے مجھے شاذ ہی کوئی ایسا موقعہ دیا ہوگا جس سے میں ان کی شفقت یا اس الفت کا اندازہ لگا سکتا۔ جو انہیں میری ذات سے تھی۔ والدین بچوّں کو اکثر پیار سے بھینچا کرتے ہیں، انہیں گلے سے لگاتے ہیں، انہیں چومتے ہیں، مگر مجھے آپ کے خدوخال سے کبھی اس قسم کی شفقتِ پدری کا احساس نہ ہُوا۔ بظاہر وہ کم گو اور سرد مہر سے دکھائی دیتے تھے۔ مجھے کبھی گھر میں منہ اٹھائے اِدھر اُدھر بھاگتے دیکھ کر مسکراتے تو مربیّانہ انداز سے۔ گویا کوئی انہیں مجبوراً مسکرانے کو کہہ رہا ہو اور اکثر اوقات تو میں انہیں اپنی آرام کرسی یا چارپائی پر آنکھیں بند کئے اپنے خیالات میں مستغرق پاتا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا، کہ انہیں مجھ سے محبت نہ تھی، سراسر غلط ہے۔ ان کی محبت کے اظہار میں ایک اپنی طرز کی خاموشی تھی جس میں عنفوان شباب کے وقتی ہیجان کا فقدان تھا یا اس کی نوعیت فکری یا تخیلی تھی جس تک پہنچنے کی اہلیت میرا ذہن نارسا نہ رکھتا تھا۔ بہر حال جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں ان سے محبت تھوڑی کرتا تھا اور خوف زیادہ کھاتا تھا۔

ہر گھر کی باتیں چھوٹی چھوٹی ہوا کرتی ہیں مگر ان سے گھر کے افراد کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض اوقات والدین میں اپنے بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں تنازعہ بھی ہو جایا کرتا ہے۔ اسی طرح ابّا جان اور امّاں جان میں میری وجہ سے کئی بار تکرار ہو جاتی۔ مثلاً امّاں جان کو میرے متعلق ہر گھڑی یہی فکر دامنگیر رہتا کہ جب کبھی میں اکیلا کھانا کھاؤں پیٹ بھر کر نہیں کھاتا اس لئے وہ ہمیشہ مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا کرتیں۔ یہاں تک کہ میں آٹھ نو برس کا ہو گیا لیکن پھر بھی مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھانے کی عادت نہ پڑی۔ ابّا جان اس بات پر بارہا ناراض ہوئے کہ تم اسے بگاڑ رہی ہو، اگر یہ جوان ہو کر بھی خود کھانا نہ کھا سکا تو کیا ہوگا؟ ہم لوگ رات کو اکثر خشکہ کھایا کرتے تھے۔ لہذا اب یوں ہوتا کہ بطور احتیاط چمچہ

میری پلیٹ کے قریب رکھ دیا جاتا مگر کھانا اماں جان ہی کھلاتیں۔ اباجان کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ دبے پاؤں زنانے میں آیا کرتے۔ اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پاتی۔ بہر حال جب بھی اماں جان مجھے کھلا رہی ہوتیں۔ ان کا دھیان باہر ہی رہتا اور جونہی وُہ اباجان کے قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنتیں تو اپنا ہاتھ پھرتی سے علیحدہ کر کے چمچہ میرے آگے رکھ دیتیں اور میں خود کھانا کھانے میں مشغول ہو جاتا۔ مجھے یقین ہے کہ اباجان کئی مرتبہ اس کا سراغ لگا چکے تھے لیکن وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے بعد چلے جایا کرتے۔

میں بچپن میں بے حد شریر تھا۔ پڑھائی سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے اماں جان سے مار کھانا میرا معمول بن گیا تھا۔ اماں جان بچوں کی پرورش کے سلسلہ میں ایک ایسے اصول کی پابند تھیں جو نہایت سخت تھا وہ اکثر کہا کرتیں کہ اولاد کو کھلانے کو دو سونے کا نوالہ لیکن دیکھو قہر کی نظر سے۔ اسی اصول کے پیش نظر، گو میں ان کے ہاں بارہ برس کے شدید انتظار کے بعد پیدا ہُوا۔ مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے مجھ پر کبھی ایسی شفقت یا محبت کا اظہار کیا ہو جس کی توقع بچے اپنی ماؤں سے رکھتے ہیں۔ البتہ میں نے اتنا سُن رکھا ہے کہ وہ جب کبھی بھی مجھے پیار کرتیں سوتے کے عالم میں کرتیں تاکہ مجھے علم نہ ہو سکے۔ شاید اسی لئے بچپن میں میرے ذہن سے یہ خیال بھی گذرا کہ میری ماں دراصل حقیقی ماں نہیں بلکہ سوتیلی ماں ہے۔

بہر حال اباجان سے میں نے بہت کم مار کھائی ہے۔ میرے لئے ان کی جھڑک ہی کافی ہُوا کرتی، گرمیوں میں دوپہر کے وقت دھوپ میں ننگے پاؤں پھرنے پر مجھے کئی بار کوسا گیا۔ اباجان جب کبھی بہت برہم ہوتے تو ان کے منہ سے ہمیشہ یہی الفاظ نکلتے:

"احمق آدمی! بیوقوف!" مجھے یہاں اباجان سے مار کھانے کا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔

بچپن میں مجھے روزانہ ایک آنہ خرچ کرنے کو ملا کرتا اور اسے خرچ کر چکنے کے بعد خواہ میں اماں جان کی کتنی ہی منتیں کرتا۔ مجھے مزید کچھ نہ ملتا بلکہ ہر لحہ ان کے ناراض ہونے کا

احتمال رہتا۔ ایک دفعہ اتفاق یوں ہوا کہ کوئی مٹھائی بیچنے والا ہمارے گھر کے سامنے سے گزرا۔ مٹھائی دیکھ کر میں للچا گیا۔ لیکن جیب خالی تھی۔ اسے بٹھا لو لیا اور اماں جان کے پاس دوڑا آیا کہ شاید کچھ مل جائے۔ مگر انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ طبیعت ضدی تھی۔ خیال آیا کہ اس خوانچہ فروش سے پوچھوں کہ پیتل لے کر مٹھائی دے سکتا ہے یا نہیں۔ بدقسمتی سے اس نے ہاں کہہ دی۔ بس پھر کیا تھا۔ سائے کی طرح، ابا جان کے کمرے میں گھسا اور بڑے ٹیبل فین کے پیچھے لگے ہیتل کے پرزے کو اتار خوانچہ فروش کو دے آیا اور مٹھائی لے لی۔ لیکن شامتِ اعمال سے ہمارا شوفر ادھر سے گزر رہا تھا اس نے آکر ابا جان سے شکایت کردی۔ میں خوشی خوشی اچھلتے کودتے جو گھر کی حدود میں داخل ہوا تو مجھے اطلاع ملی کہ ابا جان بلا رہے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے ان کے کمرہ میں گیا وہ اپنی آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور تین چار تھپڑ میری گردن پر جما دیئے۔ ابا جان مجھے جب کبھی مارتے گُدّی پر مارتے وہ زور سے تو نہ مارتے مگر گدی جسم کا ایسا حصہ ہے جہاں چوٹ زیادہ لگتی ہے اس کے علاوہ اگر مجھے ان سے کبھی کبھار مار کھانے کا اتفاق ہوا۔ تو اس کی وجہ نوکروں کو بُرا بھلا کہنا یا جھوٹ بولنا تھی۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا۔ کہ اگر ابا جان نے میری کسی شرارت پر مجھے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو اماں جان درمیان میں آ کھڑی ہوئیں اور انہیں روک دیا۔ یا اگر اماں جان نے مجھے ضرورت سے زیادہ پیٹا تو ابا جان خفا ہوئے کہ بچے کو اس بے دردی سے نہیں مارنا چاہیئے ایک دفعہ میں آنکھوں پر پٹی باندھے اماں جان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ ٹھوکر لگی اور منہ کے بل گر پڑا۔ جس کی وجہ سے ہونٹ کٹ گیا اور منہ سے خون جاری ہوگیا اتفاق سے اسی لمحہ زنانے میں ابا جان داخل ہوئے اور اچانک میرے منہ سے یوں خون بہتا دیکھ کر بیہوش ہوگئے۔

ہم گھر میں شور نہ مچا سکتے تھے۔ اگر میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ باہر دالان میں کبھی

کرکٹ کھیل رہا ہوتا تو ہمیں حکم ملتا کہ یہاں مت کھیلو اور ہم منہ لٹکائے وہاں سے چل دیتے لیکن بعض اوقات وہ ہمارے کھیل میں خود بھی شریک ہو جایا کرتے۔ ہمارے ہاتھ ان کی طرف گیند پھینکتے پھینکتے تھک جاتے مگر وہ بلا تھامے ٹھپ ٹھپ کرتے رہتے۔ ایک دفعہ وہ اندر بیٹھے تھے۔ میں نے ہٹ لگائی تو گیند دروازے کے شیشہ کو توڑ کر ان کے کمرہ میں جا گری۔ اس دن سے ہمیں کرکٹ کھیلنے کی ممانعت کر دی گئی۔ کئی بار کھلی بہاریں جب میں کوٹھے پر پتنگ اڑا رہا ہوتا تو وہ دبے پاؤں اوپر آ جاتے اور میرے ہاتھ سے پتنگ لے کر خود اڑانے لگتے۔ مگر مجھے یاد ہے کہ انہوں نے جب کبھی بھی کسی اور پتنگ سے پیچ لڑایا تو ہمیشہ ہماری پتنگ ہی کٹی۔

ہمارے گھر میں کھانا اماں جان پکایا کرتی تھیں۔ ان کی مدد کے لئے ایک اور خاتون بھی تھیں جنہیں میں بڑی اماں کہا کرتا۔ ان کے علاوہ ہماری کوٹھی کے پیچھے ایک نو مسلموں کا محلہ تھا جس کی لڑکیاں اماں جان سے قرآن مجید کا سبق لینے آتیں۔ سینا پرونا سیکھتیں اور گھر کا کام کاج بھی کرتیں۔

مجھے خواب کی طرح یاد ہے کہ ہمارے یہاں ایک مرتبہ ایک مہمان آکر ٹھہرے تھے میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار انہیں ابا جان کو اقبال کہہ کر پکارتے سنا۔ یہ متناسب جسم، میانہ قد، باریش بزرگ نہایت خوش پوش اور خوش خور تھے۔ بمبئی سے آئے تھے اور مجھے چاکلیٹ کا ڈبہ تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ آپ کے قہقہے سارے گھر میں گونجتے رہے اور آپ کے لئے اماں جان روز طرح طرح کے کھانے پکاتیں۔ آپ کا نام مولانا محمد علی جوہر تھا۔ یہ وہی محمد علی تھے جن کے متعلق اس زمانے میں مجھے ایک شعر حفظ ہو گیا تھا ؎

بولی اماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پہ دیدو

دو ایک مرتبہ میں ابا جان اور اماں جان کے ساتھ سیالکوٹ بھی گیا۔ تب دادا جان

بقید حیات تھے، گو بہت ضعیف ہو چکے تھے اور اپنے کمرہ میں، ہمیشہ چارپائی پر بیٹھے رہتے میں ان کے پاس جاتا تو آنکھوں کو اپنے ہاتھ کا سایہ دے کر مجھے دیکھتے اور پوچھتے کہ کون ہے۔ جب میں اتنا بتاتا کہ میں جاوید ہوں تو ہنس پڑتے، طاق میں سے ایک ٹین کا ڈبہ اٹھاتے اور اس میں سے برفی نکال کر مجھے کھانے کو دیتے۔ سیالکوٹ کے مکان میں یا محلہ چوڑیگراں کی گلیوں میں جہاں میں بھاگتا پھرتا تھا وہیں اباجان کا بچپن بھی گذرا تھا۔

میرے بچپن میں رمضان کا مہینہ سردیوں میں آیا کرتا اور عید بھی سردیوں میں آتی تھی۔ رمضان کے دنوں میں اماں جان باقاعدہ روزے رکھتیں اور قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتیں۔ گھر کے ملازم بھی روزے رکھتے۔ مجھے سحری کھانے کا بے حد شوق تھا اور ایک آدھ بار اباجان کے ساتھ سحری کھانا بھی یاد پڑتا ہے وہ روزہ کبھی کبھار رکھتے تھے اور جب رکھتے تو ہر نصف گھنٹہ کے بعد علی بخش کو بلوا کر پوچھتے، کہ افطاری میں کتنا وقت باقی ہے۔

جب عید کا چاند دکھائی دیتا تو گھر میں بڑی چہل پہل ہو جاتی۔ میں اباجان کو عید کا چاند دکھایا کرتا تھا۔ گو مجھے نہانے سے سخت نفرت تھی، لیکن اس شب گرم پانی سے اماں جان مجھے نہلاتیں اور میں بڑے شوق سے نہاتا۔ نئے کپڑے یا جوتوں کا نیا جوڑا سرہانے رکھ کر سوتا۔ صبح اُٹھ کر نئے کپڑے پہنتا، عیدی ملتی، کمخواب کی ایک اچکن جس کے نقرئی بٹن تھے۔ مجھے ہر عید پر اماں جان پہنایا کرتیں۔ سر پر تلے کی گول ٹوپی پہنتا اور مجھے کلائی پر باندھنے کے لئے ایک سونے کی گھڑی بھی دی جاتی جو افغانستان کے بادشاہ نادرشاہ نے میرے لیے تحفہ کے طور پر بھیجی تھی۔ سج دھج کر میں اباجان کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے کے لیے جاتا۔ ان کی انگلی پکڑے شاہی مسجد میں داخل ہوتا اور ان کے ساتھ عید کی نماز ادا کرتا۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم گھر آتے۔ اباجان کی عادت تھی کہ وہ عید کے روز سیویوں پر دہی ڈال کر کھایا کرتے تھے۔ سارا دن انہیں ملنے والوں کا تانتا بندھا

رہتا اور دن کھاتے پیتے ہنستے کھیلتے گزر جاتا۔ رات آتی تو اماں جان سونے کی گھڑی اور اچکن اتروا لیتیں اور پھر اگلی عید تک مجھے ان کا انتظار کرنا پڑتا۔

کبھی بیمار ہوتا تو اماں جان اور اباجان بہت پریشان ہو جاتے۔ میرے سرہانے روپوں کے نوٹ رکھے جاتے اور کھیلنے کے لئے اماں جان مجھے نو اشرفیاں دیتیں جو میری پیدائش کے وقت مختلف احباب سے بطور تحفہ ملی تھیں۔ اماں جان کا خیال تھا کہ اگر بچہ بیمار ہو اور اسے کھیلنے کے لیے روپے یا اشرفیاں دی جائیں تو وہ جلد صحت یاب ہو جاتا ہے۔ اباجان مجھے بار بار پوچھتے کہ کہیں درد تو نہیں ہو رہا اور اگر میں انکار سے سر ہلاتا تو کہتے :" منہ سے بولو بیٹا! سر مت ہلاؤ!" میرا بچپن زیادہ تر تنہائی میں گزرا۔ ۱۹۳۰ء میں منیرہ پیدا ہوئی، لیکن وہ مجھ سے چھ سال چھوٹی تھی اس لیے ہم اکٹھے کھیل بھی نہ سکتے تھے۔

مجھے وہ دن بھی خوب یاد ہے جب میں پہلی بار اسکول گیا۔ میری عمر کوئی پانچ ساڑھے پانچ سال کی ہو گی۔ اماں جان بڑی فکرمند تھیں کہ میں سارا دن گھر سے دُور کیسے رہ سکوں گا۔ اباجان انہیں دلاسے دیتے رہے لیکن ساتھ خود بھی علی بخش سے پوچھتے کہ جاوید کو لینے کوئی نہیں گیا۔ چھٹی ہونے پر جب میں گھر آیا تو اماں جان برآمدے میں کھڑی میری راہ تک رہی تھیں۔ اباجان بھی اپنے کمرہ سے اُٹھ کر آ گئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کہیں اداس تو نہیں ہو گئے تھے۔ بعد میں اسکول جانا ایک معمول بن گیا۔

مجھے موسیقی سے بھی خاصا لگاؤ تھا لیکن ہمارے گھر میں نہ تو ریڈیو تھا اور نہ گراموفون بجانے کی اجازت تھی۔ کیونکہ اباجان ایسی چیزوں کو پسند نہ کرتے تھے البتہ گانا سننے کا انہیں شوق ضرور تھا اور اچھا گانے والوں کو جب کبھی گھر بلوا کر ان سے اپنا یا اوروں کا کلام سنتے تو مجھے بھی پاس بٹھا لیتے۔ فقیر نجم الدین مرحوم اباجان کو اکثر ستار بجا کر سنایا کرتے تھے، خود اباجان کو جوانی میں ستار بجانے کا شوق رہ چکا تھا لیکن جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ گئے تو اپنی ستار کسی دوست کو دے گئے۔ ۱۹۳۱ء میں جب گول میز کانفرنس میں

شمولیت کے لیے ابا جان انگلستان گئے تو اس وقت میری عمر سات سال کے لگ بھگ تھی میں نے انہیں ایک اوٹ پٹانگ سا خط لکھا اور خواہش ظاہر کی کہ جب وہ واپس تشریف لائیں تو میرے لئے ایک گراموفون لیتے آئیں۔ گراموفون تو وہ لے کر نہ آئے لیکن میرا انہیں انگلستان میں لکھا ہوا خط ان کی مندرجہ ذیل نظم کی شان نزول کا باعث ضرور بنا۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اماں جان کی بڑی آرزو تھی کہ ابا جان تمام دن گھر پر پڑے رہنے کی بجائے کہیں ملازمت کر لیں۔ یہ سن کر ابا جان عموماً مسکرا دیا کرتے اور یہ حقیقت ہے کہ بچپن میں میں نے بھی اس معمے کو سمجھانے کی بارہا کوشش کی کہ میرے ابا جان کیا کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی مجھ سے یہ سوال پوچھ بیٹھتا تو میں خاموش ہو جاتا۔ کیونکہ میں خود نہ جانتا تھا۔ اسی طرح اماں جان اس بات پر مصر رہتیں کہ کرایہ کا گھر چھوڑ کر اپنا گھر بنوائیے۔ ان ایام میں ہم میکلوڈ روڈ پر رہا کرتے تھے۔

چند سالوں بعد اماں جان کے گھر کے اخراجات سے بچائے ہوئے روپوں سے زمین

خریدی گئی اور جاوید منزل کی تعمیر شروع ہوئی۔ زمین اور مکان اماں جان کے نام تھے اور انہی کی ملکیت تھے۔ بہرحال جب تعمیر مکمل ہو گئی تو ہم میو روڈ پر اُٹھ آئے۔ لیکن اماں جان نئے گھر میں بیمار گاڑی پر ہی لائی گئیں۔ کیونکہ ان دنوں وہ سخت علیل تھیں۔ انہیں چارپائی پر لیٹے اندر لایا گیا۔ دوسرے دن ابا جان جب انہیں دیکھنے کے لئے زنانہ میں آئے تو اپنے ہاتھ میں انہوں نے کچھ کاغذات اٹھا رکھے تھے۔ آپ نے اماں جان سے کہا کہ اس مکان کو جاوید کے نام ہبہ کر دو۔ لیکن اماں جان نہ مانتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے کیا معلوم یہ لڑکا بڑا ہو کر کیسا نکلے۔ میں انشاء اللہ جلد صحت یاب ہو جاؤں گی۔ آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں۔ لیکن ابا جان نے انہیں آگاہ کیا کہ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے اس پر انہوں نے ہبہ نامہ پر دستخط کر دیئے۔ یوں جاوید منزل میرے نام منتقل ہو گئی ابا جان نے ایک کرایہ نامہ بھی تحریر کیا جس کی رو سے آپ میرے کرایہ دار کی حیثیت سے رہنے لگے۔ آپ سامنے کے تین کمروں میں رہائش کا کرایہ ہر ماہ کی ۱۲ر تاریخ کو ادا کرتے تھے۔

نئے گھر میں قدم رکھنے کے تیسرے یا چوتھے روز اماں جان پر اچانک غشی کا عالم طاری ہو گیا۔ کوئی پانچ بجے شام کے قریب جب مجھے ان کے پاس لے جایا گیا تو وہ بستر پر بیہوش پڑی تھیں۔ میں نے ان کے حلق میں شہد ٹپکایا اور روتے ہوئے کہا کہ اماں جان میری طرف دیکھیے۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ لحظہ بھر کے لیے میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی شام انہوں نے غشی کے عالم میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور رات کو دفن کر دی گئیں۔ ان کی وفات کے وقت میری عمر دس برس تھی اور منیرہ کی چار برس۔

اماں جان کے انتقال کے بعد ہم دونوں بچے ابا جان کے زیادہ قریب آ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس وقت اماں جان فوت ہوئیں تو ہم دونوں بہن بھائی ایک دوسرے

کا ہاتھ پکڑے روتے روتے ابا جان کے کمرے کی طرف گئے۔ وہ حسبِ معمول اپنی چارپائی پر نیم دراز تھے کیونکہ ان دنوں خود بھی بیمار رہتے تھے۔ گلا بیٹھ چکا تھا اور صاف نہ بول سکتے تھے۔ میں اور منیرہ ان کے دروازے تک پہنچ کر ٹھٹک سے گئے۔ یوں روتے کھڑا دیکھ کر انہوں نے انگلی کے اشارے سے قریب آنے کو کہا اور جب ہم ان کے قریب پہنچے تو ایک پہلو میں مجھے اور دوسرے میں منیرہ کو بٹھا لیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ پیار سے ہمارے کندھوں پر رکھ کر قدرے کرختگی سے مجھ سے گویا ہوئے: "تمہیں یوں نہ رونا چاہیے، یاد رکھو، تم مرد ہو اور مرد کبھی نہیں رویا کرتے۔" اس کے بعد اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے ہم دونوں بہن بھائیوں کی پیشانیوں کو باری باری چوما۔

اماں جان کی بے وقت موت نے ابا جان کو پژمردہ سا کر دیا۔ لیکن اب وہ ہم دونوں بچوں کا بے حد خیال رکھنے لگے۔ ہمیں حکم تھا کہ ان سے مل کر اسکول جایا کریں۔ جانے سے پہلے اور آنے کے بعد وہ ہم دونوں کی پیشانیوں پر بوسہ دیا کرتے۔ مگر مجھے اس بوسے میں شفقت کی بجائے ہمیشہ معمول کی جھلک دکھائی دیتی۔ گویا وہ ہمیں اس لئے چومتے ہیں کہ کہیں ہم دونوں یہ تصور نہ کر لیں کہ ہمیں ابا جان کی محبت میسر نہیں ہے۔ بہرحال منیرہ کو ان کا قرب حاصل تھا اور وہ رات کو عموماً انہی کے بستر میں سو جایا کرتی۔ اس کی ہر خواہش بغیر کسی حیل و حجت کے پوری کر دی جاتی۔ اور اگر میں کبھی اسے جھڑکتا یا مار بیٹھتا تو میری شامت آ جاتی۔ انہیں ہم دونوں بہن بھائیوں کے جھگڑے پر بہت رنج ہوتا تھا وہ اپنے احباب سے اکثر مایوسانہ انداز میں کہا کرتے کہ یہ دونوں آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ اور احباب کے یہ کہنے کے باوجود کہ جس گھر میں بچے ہوں، وہاں لڑائی جھگڑا ہوا ہی کرتا ہے۔ ان کی تسلی نہ ہوتی۔ مجھ سے بارہا جل کر کہا کرتے:

"تمہارا دل پتھر کا ہے۔ تم بڑے سنگ دل ہو۔ اتنا نہیں جانتے کہ اس بہن کے سوا تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

اماں جان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد وہ مجھے اس خیال سے اپنے ہمراہ بھوپال لے گئے کہ ان کی عدم موجودگی میں منیرہ سے لڑتا نہ رہوں۔ اس سفر کی دھندلی سی یاد اب تک میرے ذہن میں موجود ہے۔ بہت لمبا سفر تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کئی دن اور راتیں ریل گاڑی میں ہی گذریں۔ رات کو علی بخش مجھے اوپر کی برتھ پر سلا دیتا۔ اور ابّا جان نیچے کی برتھ پر سوتے۔ ناشتہ دوپہر اور رات کا کھانا بھی وہیں منگوا لیا جاتا۔ جب ہم بھوپال پہنچے تو اسٹیشن پر محمد شعیب استقبال کے لئے موجود تھے۔ ہم موٹر کار میں شیش محل پہنچے جہاں اباجان کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ شیش محل ایک پرانی وضع کی نہایت وسیع و عریض عمارت تھی۔ اتنے بڑے بڑے کمرے تھے کہ مجھے رات کو ان میں سے گذرتے ڈر آیا کرتا۔

ہم بھوپال میں کوئی دو ایک ماہ ٹھہرے۔ وہاں ڈاکٹر باسط اباجان کے معالج تھے اور ان کے گلے کا علاج برقی شعاعوں سے کرتے تھے۔ مجھے روز پڑھانے کے لئے ایک اُستاد بھی شیش محل آیا کرتے۔ شیش محل کے قریب ایک جھیل کے کنارے میں ڈاکٹر باسط کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا۔ ڈاکٹر باسط کا گھر شیش محل کے مقابل تھا اور اس کے سامنے غالباً ایک وسیع میدان تھا۔

تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز مَیں اباجان کے ساتھ سید راس مسعود کے ہاں "ریاض منزل" جایا کرتا۔ وہ میری زندگی میں دوسری ایسی شخصیت تھے جنہیں مَیں نے اباجان کو اقبال کہہ کر پکارتے سنا۔ سید راس مسعود قد میں اباجان سے بہت اونچے۔ قوی ہیکل اور گورے چٹے بزرگ تھے۔ مجھ سے ہر وقت مذاق کرتے رہتے۔ میں اور اباجان ہفتہ میں دو ایک بار رات کا کھانا سید راس مسعود اور بیگم امت المسعود کے ساتھ "ریاض منزل" میں کھایا کرتے۔ بسا اوقات ہم اور جگہوں پر بھی کھانے پر مدعو ہوتے۔ ایک مرتبہ ہم کسی کھانے سے واپس لوٹ رہے تھے اور گاڑی میں اباجان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی فربہ سی ہنس مکھ خاتون بیٹھی تھیں وہ مجھ سے نہایت شفقت سے پیش آئیں۔ بعد میں اباجان نے مجھے بتایا کہ وہ سروجنی نائیڈو

تھیں۔ اسی طرح ایک شام بیگم صاحبہ بھوپال کے ہاں چائے پر مجھے اپنے ساتھ لے گئے کیونکہ بیگم صاحبہ نے فرمائش کر رکھی تھی کہ جاوید کو ساتھ لائیے۔ سید راس مسعود بھی ہمارے ہمراہ تھے جب ان دونوں بزرگوں نے بیگم صاحبہ بھوپال کو جھک کر فرشی سلام کئے تو مجھے بڑی ہنسی آئی۔

بہرحال بھوپال میں میرا بیشتر وقت ابا جان کی نگاہوں کے سامنے ہی گذرتا تھا۔ رات کو کھانے کی میز پر مجھے سکھایا کرتے کہ چمچہ اس طرح پکڑنا چاہیئے اور کانٹا یوں۔ میں فطرتاً کچھ شرمیلا واقع ہوا تھا، اس لئے جب کبھی انہیں وہاں لوگ ملنے آتے یا وہ لوگوں کے ہاں جاتے تو مجھے، ہمیشہ کہا کرتے کہ لوگوں کے سامنے خاموش بیٹھے رہنے کی بجائے ان سے بات چیت کرنی چاہیئے۔

بھوپال سے واپسی پر ہم چند دنوں کے لئے دہلی ٹھہرے۔ وہاں ابا جان بذات خود مجھے تاریخی مقامات کی سیر کرانے کے لئے لے گئے۔ پہلے لال قلعہ دیکھا۔ پھر نظام الدین اولیاء گئے اور پھر نئی دہلی سے ہوتے ہوئے قطب پہنچے۔ میرا دل چاہا کہ قطب مینار کے اُوپر چڑھ جاؤں اور میں نے ابا جان کو بھی ساتھ آنے کو کہا۔ مگر وہ بولے: "تم جاؤ میں اتنی بلندی پر نہیں چڑھ سکتا اور جب اوپر پہنچو تو نیچے کی طرف مت دیکھنا۔ کہیں دہشت سے گر نہ پڑو"۔ بالآخر ہم واپس لاہور آ گئے۔

گرمیوں میں ابا جان باہر سوتے اور میری چارپائی ان کے قریب ہوا کرتی۔ رات گئے تک وہ جاگتے رہتے۔ کیونکہ انہیں عموماً رات کو تکلیف ہوتی تھی اور جب سحر کی آمد ہوتی تو ان کی طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہو جایا کرتی۔ چہرے پر تغیر رونما ہو جاتا۔ بستر پر کروٹیں بدلتے کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے اور کبھی گھٹنوں میں سر دے دیتے۔ اکثر اوقات وہ رات کے دو یا تین بجے علی بخش کو تالی بجا کر بلاتے اور اسے اپنی بیاض اور قلم دوات لانے کو کہتے۔ جب وہ لے آتا تو بیاض پر اشعار لکھ دیتے۔ اشعار لکھ چکنے کے بعد ان کے چہرے پر آہستہ آہستہ سکون کے آثار نمودار ہو جاتے اور وہ آرام سے لیٹ جایا کرتے۔ بعض اوقات تو وہ علی بخش کو اس

غرض کے لئے بھی بلواتے کہ میری پائینتی پر پڑی ہوئی چادر کو میرے اوپر ڈال دو۔

اباجان کی عادت سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر بستر پر ایک طرف سونے کی تھی۔ اس حالت میں ان کا ایک پاؤں اکثر ہلتا رہتا جس سے دیکھنے والا یہ اندازہ لگا سکتا کہ وہ ابھی سوئے نہیں بلکہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ لیکن جب وہ گہری نیند سو جاتے تو خراٹے لیا کرتے اور نہایت بھیانک قسم کی آوازیں نکلتیں۔ کئی بار میں ان کے خراٹوں سے ڈر جایا کرتا۔

اباجان کو میں نے بیسیوں مرتبہ خود بخود مسکراتے یا روتے دیکھا ہے جب کبھی تنہائی میں بیٹھے اپنا کوئی شعر گنگناتے تو ان کا بے جان سا ہاتھ عجیب تغافل کے عالم میں اٹھتا اور ہوا میں گھوم کر اپنی پہلی جگہ پر آگرتا۔ ساتھ ہی ان کے سر کو ہلکی سی جنبش ہو جاتی۔ صبح کی نماز بہت کم چھوڑتے تھے۔ گرمیوں میں باہر رکھے ہوئے تخت ہی پر نیت باندھ لیتے۔ دھوتی اور بنیان زیب تن ہوتی اور سر پر تولیہ رکھ لیتے۔ ان کے کمرے کی حالت پریشان سی رہتی تھی۔ دیواریں گرد و غبار سے اٹی ہوتیں۔ بستر ان کی اپنی دھوتی اور بنیان کی طرح میلا ہو جاتا مگر انہیں بدلوانے کا خیال نہ آتا۔ منہ دھونے اور نہانے سے گھبراتے اور کبھی مجبوراً باہر جانا پڑتا تو کپڑے بدلتے وقت سرد آہیں بھرا کرتے۔ وہ فطرتاً سست تھے۔ اس لئے اگر کہیں وقت کی پابندی ہوتی تو انہیں ہمیشہ دیر ہو جایا کرتی۔ ویسے چارپائی پر نیم دراز پڑے رہنے میں بڑے خوش تھے۔ کئی بار دوپہر کا کھانا کسی کتاب میں منہمک ہونے کی وجہ سے بھول جایا کرتے اور جب وہ کتاب ختم ہو جاتی تو علی بخش کو بلوا کر معصومانہ انداز میں پوچھتے: "کیوں بھئی، میں نے کھانا کھا لیا ہے؟" شام کو گھر کے دالان میں ہی دو ایک چکر لگایا لیا کرتے۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی میں بظاہر کامل جمود تھا۔

اماں جان کی وفات کے بعد اباجان صرف ایک بار زنانہ میں آئے اور وہ بھی جب مجھے بخار آتا تھا۔ آپ کو پہلی بار تب معلوم ہوا کہ زنانہ حصہ میں کمروں کی تعداد کتنی ہے۔ اسی طرح اماں جان کی وفات کے بعد اباجان نے خضاب لگانا بھی ترک کر دیا تھا۔ ایک دن میں نے انہیں

از سرِ نو خضاب شروع کرنے کو کہا تو مُسکرا کر بولے: "میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں"۔ میں نے پھر کہا: "لیکن ابّا جان! ہم تو آپ کو جوان دیکھنا چاہتے ہیں۔" چنانچہ شاید اس خیال سے، کہ بچے میرے سفید بالوں کو دیکھ کر مجھے ضعیف سمجھنے لگے ہیں، انہوں نے پھر سے خضاب لگانا شروع کر دیا۔ مگر چند ہی مہینوں بعد پھر چھوڑ دیا اور میری ہمت نہ پڑی کہ انہیں دوبارہ شروع کرنے کو کہوں۔

اماں جان کی وفات کے کوئی دو ایک سال بعد منیرہ کی دیکھ بھال کے لئے ابا جان نے ایک جرمن خاتون کو علیگڑھ سے بُلوایا اور وہ ہمارے یہاں رہنے لگیں۔ ہم انہیں 'آپا جان' کہا کرتے۔ ان دنوں ہماری گھریلو زندگی میں ایک ترتیب سی آ گئی۔ ہم سب ابا جان سمیت دوپہر اور رات کا کھانا کھانے والے کمرہ میں کھایا کرتے۔ منیرہ اور 'آپا جان' ہر شام ابا جان کے پاس بیٹھا کرتیں۔ اباجان جرمن زبان بخوبی جانتے تھے۔ اس لیے 'آپا جان' سے جرمن ہی میں گفتگو کیا کرتے اور منیرہ کو بھی کہتے کہ جرمن زبان سیکھو، جرمن عورتیں بڑی دلیر ہوتی ہیں۔ منیرہ ان دنوں جرمن زبان کے چند فقرے سیکھ گئی تھی۔ اس لیے وہ بھی ان سے جرمن میں بات چیت کرتی، اور خوب ہنسی مذاق ہوتا۔

مجھے مصوری سے بھی دلچسپی تھی۔ لیکن ابا جان کو میرے اس شوق کا علم نہ تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ایک تصویر بنائی جو اتفاق سے خاصی اچھی بن گئی۔ ان دنوں تایا جان سیالکوٹ سے لاہور آئے ہوئے تھے اور ہمارے ہاں مقیم تھے۔ تایا جان خود انجنیئر تھے۔ لیکن جب انہوں نے میری بنائی ہوئی تصویر دیکھی تو بے حد خوش ہوئے۔ فوراً تصویر ہاتھ میں لے کر ابا جان کو دکھانے چلے گئے۔ میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے گیا۔ اباجان کو پہلے تو یقین نہ آیا کہ تصویر میں نے بنائی ہے لیکن جب یقین آ گیا تو میری حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے فرانس، اطالیہ اور انگلستان سے خاص طور پر میرے لیے آرٹ کی کتب منگوائیں۔ انہیں خیال تھا کہ دنیا کے بہترین مصوروں کے شاہکاروں کو دیکھ کر میرا مصوری کے لئے شوق بڑھے گا۔

لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔ جب میری نظر سے مصوری کے شاہکار گزرے تو میں نے اس خیال سے ہمت ہار دی کہ اگر میں ساری عمر بھی کوشش کروں تو ایسی خوبصورت تصاویر نہیں بنا سکتا۔

اباجان کی تمنا تھی کہ میں تقریر کرنا سیکھوں۔ اس کے علاوہ وُہ یہ بھی چاہتے تھے، کہ میں کُشتی لڑا کروں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں میرے لیے گھر میں ایک اکھاڑہ بھی کھدوا دیا گیا تھا وہ اکثر کہا کرتے کہ اکھاڑے کی مٹی میں ڈنڈ پیلنا یا لنگوٹی باندھ کر لیٹ رہنا صحت کے لیے نہایت مفید ہوتا ہے۔ پھر بڑی عید کے روز مجھے ہمیشہ تلقین کیا کرتے کہ بکرے کے ذبح ہوتے وقت میں وہاں موجود رہوں۔ لیکن ان کا اپنا یہ حال تھا کہ کسی قسم کا خون بہتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ اباجان میں قوت برداشت کی انتہا تھی مگر جب ایک مرتبہ کسی سے ناراض ہو جاتے تو پھر ساری عمر اس کا چہرہ دیکھنے کے روادار نہ ہوتے۔ انہیں کبوتر بازی کا شوق بھی رہ چکا تھا۔ آخری عمر میں ان کی خواہش تھی کہ گھر کی چھت پر ایک وسیع پنجرہ بنوایا جائے جس میں لاتعداد کبوتر چھوڑ دیئے جائیں اور ان کی چارپائی ہر وقت کبوتروں کے درمیان رہا کرے انہیں یقین تھا کہ کبوتروں کے پروں کی ہوا صحت کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔

اباجان کے عقیدت مندوں میں ایک حجازی عرب بھی تھے جو کبھی کبھار انہیں قرآن مجید پڑھکر سنایا کرتے۔ میں نے بھی ان سے قرآن مجید پڑھا ہے۔ ان کی آواز بڑی پیاری تھی۔۔ اباجان جب بھی ان سے قرآن مجید سنتے، مجھے بلا بھیجتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ایک بار انہوں نے سورۃ مزمل پڑھی تو آپ اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ جب وہ ختم کر چکے، تو آپ نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور مرتعش لہجے میں بولے: "تمہیں یوں قرآن پڑھنا چاہیئے" اسی طرح مجھے ایک مرتبہ مُسدس حالیؔ پڑھنے کو کہا، اور خاص طور پر وہ بند ۔۔۔۔۔۔۔ جب قریب بیٹھے ہوئے میاں محمد شفیع نے دہرایا۔ ؎

"وُہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا"

تو آپ سنتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے اماں جان کی موت پر انہیں آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا مگر قرآن مجید سنتے وقت یا اپنا کوئی شعر پڑھتے وقت یا رسولؐ اللہ کا اسم مبارک کسی کی نوکِ زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں بھر آیا کرتیں۔

اباجان کو انگریزی لباس سے سخت نفرت تھی۔ مجھے ہمیشہ شلوار اور اچکن پہننے کی تلقین کیا کرتے۔ منیرہ بھی اگر اپنے بالوں کو دو حصوں میں گوندھتی تو نا پسند کرتے اور کہتے "اپنے بال اس طرح مت گوندھا کرو۔ یہ یہودیوں کا انداز ہے۔" اور اگر میں کبھی غلطی سے اپنی قمیصوں یا شلواروں کا کپڑا بڑھیا قسم کا خرید لاتا تو بہت خفا ہوتے اور کہتے۔ "تم اپنے آپ کو کسی رئیس کا بیٹا سمجھتے ہو؟ تمہاری طبیعت میں امارت کی بُو ہے۔ اور اگر تم نے یہ انداز نہ چھوڑے تو میں تمہیں کھدر کے کپڑے پہنوا دوں گا۔" میرے لیے بارہ آنے گز سے زیادہ قمیص کا کپڑا خریدنا جرم تھا جس کی سزا کافی کڑی تھی۔ لیکن اگر انہیں کبھی یہ معلوم ہو جاتا کہ میں آج پلنگ پر سونے کی بجائے زمین پر سویا ہوں تو بڑے خوش ہوا کرتے۔

اپنی زندگی میں صرف ایک بار انہوں نے مجھے سینما دیکھنے کی اجازت دی۔ وہ ایک انگریزی فلم تھی، جس میں نپولین کا عشق دکھایا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اباجان کو یہ نہ بتایا گیا بلکہ کہا گیا کہ اس فلم میں نپولین کے حالاتِ زندگی ہیں۔ اباجان دنیا بھر کے جرّی سپہ سالاروں سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ مجھے اکثر خالد بن ولیدؓ اور فاروق اعظمؓ کی باتیں سنایا کرتے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے بتایا کہ نپولین کے اجداد عرب سے آئے تھے اور واسکوڈی گاما کو عربوں نے ہی ہندوستان کا راستہ دکھایا۔

مجھے کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ باغ و بہار (قصہ چہار درویش) حاتم طائی، طلسم ہوشربا اور عبدالحلیم شررؔ کے سب ناول پڑھ ڈالے تھے۔ ساتویں جماعت کے امتحان کے قریب میرے ہاتھ الف لیلیٰ لگ گئی۔ اور اس کتاب سے میں اس قدر مسحور ہوا کہ رات گئے تک اسے پڑھتا رہتا۔ امتحان سر پہ آ گئے۔ لیکن میں نے الف لیلیٰ کو نہ چھوڑا

بلکہ رات کو امتحان کی تیاری کرنے کی بجائے الف لیلیٰ پڑھتا رہتا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ساتویں جماعت کے امتحان میں ناکامیاب ہو گیا۔ جب آبا جان کو علم ہوا کہ میں الف لیلیٰ میں منہمک ہونے کی وجہ سے امتحان میں ناکامیاب رہا ہوں تو برہم نہ ہوئے۔ کہنے لگے: "اگر تم امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد الف لیلیٰ پڑھتے تو تمہیں اور بھی لطف آتا۔"

ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں ابا جان نے کشمیر جانے کا ارادہ بھی کیا۔ کیونکہ ان کے احباب کا اصرار تھا کہ وہ تبدیلیٔ آب و ہوا کی خاطر لاہور سے تھوڑے عرصہ کے لئے کہیں باہر چلے جائیں۔ انہوں نے منیرہ اور مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم بڑے خوش تھے کہ ابا جان کے ہمراہ کشمیر جا رہے ہیں۔ لیکن کشمیر میں ابا جان کا داخلہ ممنوع تھا۔ لہٰذا انہوں نے حکومت سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ عرصہ تک خط و کتابت جاری رہی مگر جب اجازت ملی تو گرمیوں کا موسم نکل چکا تھا۔ یوں وہ اپنی زندگی میں آخری بار وادیٔ کشمیر میں کچھ دن گزارنے سے محروم رہ گئے۔ اسی طرح بیت اللہ کے حج پر جانے کا قصد بھی کیا۔ لیکن وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔

ابا جان کو معلوم تھا کہ مجھے بڑی بڑی شخصیتوں کے آٹوگراف لینے کا شوق ہے گو وُہ میری اس عادت کو نہ تو بُرا سمجھتے اور نہ سراہتے۔ لیکن ایک شام انہوں نے مجھے خاص طور پر بلوا کر کہا کہ ہمارے ہاں ایک مہمان آ رہے ہیں، جب وہ آ کر بیٹھ جائیں تو تھوڑی دیر بعد میں کمرہ میں داخل ہوں۔ اور ان سے آٹوگراف لینے کی استدعا کروں۔ چنانچہ جب مہمان تشریف لے آئے تو میں ان کے حکم کے مطابق کمرہ میں داخل ہوا۔ آبا جان کے پاس ایک دُبلے پتلے مگر نہایت خوش پوش شخص بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں عقاب ایسی پھرتی تھی اور ان کے ساتھ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک دبلی پتلی خاتون بھی تھیں۔ اباّجان نے ان سے میرا تعارف کرایا اور میں نے آٹوگراف کی کتاب آگے بڑھا دی۔ مہمان نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا "کیا تم بھی شعر کہتے ہو؟" میں نے کہا جی نہیں" اس پر انہوں نے سوال کیا۔ "پھر تم بڑے

ہو کر کیا کرو گے؟" میں خاموش رہا۔ وہ ہنستے ہوئے اباجان سے مخاطب ہوئے۔ "کوئی جواب نہیں دیتا۔" "وہ جواب نہیں دے گا۔" اباجان بولے۔ "کیونکہ وہ اس دن کا منتظر ہے۔ جب آپ اسے بتائیں گے کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ میری آٹو گراف کی کتاب پر دستخط کر دیئے گئے۔ یہ میری خالق پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اور محترمہ فاطمہ جناح سے پہلی ملاقات تھی۔ تب قائداعظم کو پنجاب میں زیادہ لوگ نہ جانتے تھے اور مسلم عوام پاکستان کے تصور سے ابھی روشناس نہ ہوئے تھے۔ بہرحال میں نے اس مختصر سے عرصہ میں یہ اندازہ لگا لیا کہ اباجان ان کی کس قدر عزت کرتے ہیں۔

آخری ایام میں اباجان کی نظر بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس لئے مجھے حکم تھا کہ انہیں ہر روز صبح اخبار پڑھ کر سنایا کروں۔ اگر کسی لفظ کا تلفظ غلط ادا کر جاتا تو بہت خفا ہوتے اسی طرح رات کو میں انہی کی کوئی غزل گا کر بھی سنایا کرتا۔ ان دنوں مجھے ان کی صرف ایک غزل یاد تھی۔ کہ

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

اباجان کے سامنے وہ غزل پڑھنا میرے لیے ایک عذاب ہوا کرتا۔ اگر کوئی شعر غلط پڑھ جاتا تو وہ ناراض ہوتے اور کہتے:

"شعر پڑھ رہے ہو یا نثر ہے ـــــــ!"

ان کی وفات سے کوئی دو ایک ماہ پیشتر ایک شام پنڈت نہرو نے انہیں ملنے کے لیے آنا تھا۔ اباجان نے مجھے بلا کر حکم دیا کہ پنڈت نہرو کے استقبال کے لیے ڈیوڑھی میں کھڑا رہوں۔ میں نے تعجب سے پوچھا کہ پنڈت نہرو کون ہیں؟ کہنے لگے: "جس طرح محمد علی جناح مسلمانوں کے قائد ہیں۔ اسی طرح پنڈت نہرو ہندوؤں کے سربراہ ہیں۔" میں باہر کھڑا پنڈت جی کا انتظار کرتا رہا، جب وہ تشریف لائے تو میں نے انہیں "سلام علیکم" کہا اور انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کا جواب دیا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر نہایت شفقت

سے میری کمر میں بازو ڈال کر میرے ساتھ ابا جان کے کمرہ میں داخل ہوئے۔ ابا جان بڑے تپاک سے ملے اور صوفہ پر بیٹھنے کو کہا۔ لیکن پنڈت جی نے نیچے فرش پر بیٹھنے پر اصرار کیا۔ بالآخر وہ فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئے۔ اور ابّا جان بستر پر لیٹے ان سے باتیں کرنے لگے۔

ابّا جان کو لوگ گھر پر ہی ملنے آتے۔ ہر شام احباب کی محفل جما کرتی۔ ان کی چارپائی کے گرد بہت سی کرسیاں رکھی ہوتیں اور لوگ ان پر آکر بیٹھ جایا کرتے۔ آپ چارپائی پر لیٹے ان سے باتیں کرتے رہتے اور ساتھ ساتھ حقہ بھی پیتے جاتے۔ رات کا کھانا نہ کھاتے تھے۔ صرف کشمیری چائے پینے پر اکتفا کرتے۔ رات گئے تک علی بخش ان کے پاؤں دباتا اور اگر میں کبھی دبانے بیٹھتا تو منع کر دیتے اور کہتے :

"تم ابھی چھوٹے ہو، تھک جاؤ گے۔"

مجھے خاص طور پر حکم تھا کہ جب بھی ان کے پاس لوگ بیٹھے ہوں اور کوئی بحث مباحثہ ہو رہا ہو تو میں وہاں ضرور موجود رہوں۔ لیکن مجھے ان کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ ہوا کرتی۔ کیونکہ وہ میری سمجھ سے بالاتر ہوتیں۔ سو میں عموماً موقع پا کر وہاں سے کھسک جایا کرتا، جس پر انہیں بہت رنج ہوتا۔ اور وہ اپنے احباب سے کہتے : "یہ لڑکا نہ جانے کیوں میرے پاس بیٹھنے سے گریز کرتا ہے۔" دراصل اب وہ تنہائی بھی محسوس کرنے لگے تھے۔ اور اکثر اوقات افسردگی سے کہا کرتے۔ "سارا دن یہاں مسافروں کی طرح پڑا رہتا ہوں۔ میرے پاس آکر کوئی نہیں بیٹھتا۔"

آخری رات ان کی چارپائی گول کمرہ میں بچھی تھی۔ عقیدت مندوں کا جمگھٹا تھا۔ میں کوئی نو بجے کے قریب اس کمرہ میں داخل ہوا۔ تو پہچان نہ سکے۔ پوچھا۔ "کون ہے ؟" میں نے جواب دیا : "میں جاوید ہوں۔" ہنس پڑے اور بولے۔ "جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں"۔ پھر اپنے قریب بیٹھے ہوئے چودھری محمد حسین سے مخاطب ہوئے۔ "چودھری صاحب، اسے جاوید نامہ کے آخر میں وہ دعا، 'خطاب بہ جاوید' ضرور پڑھوا دیجئے گا۔"

اس رات ہمارے ہاں بہت سے ڈاکٹر آئے ہوئے تھے۔ ہر کوئی ہراساں دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ آج کی رات مشکل سے کٹے گی۔ کوٹھی کے صحن میں کئی جگہوں پر دو دو تین تین کی ٹولیوں میں کھڑے لوگ باہم سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ابا جان سے ڈاکٹروں کی یہ رائے مخفی رکھی گئی۔ مگر وہ بڑے تیز فہم تھے۔ انہیں اپنے احباب کا بکھرا ہوا شیرازہ دیکھ کر یقین ہو گیا تھا کہ بساط عنقریب اُلٹنے والی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس رات ضرورت سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔

مجھے بھی حالات سے آگاہ نہ کیا گیا۔ اس لیے معمول کے مطابق اپنے کمرہ میں جا کر سو رہا۔ مگر صبح طلوع آفتاب سے پیشتر مجھے علی بخش نے آ کر جھنجھوڑا اور چیختے ہوئے کہا: "جاؤ دیکھو تمہارے ابا جان کو کیا ہو گیا ہے۔"

نیند اچانک میری آنکھوں سے کافور ہو گئی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ گھر کے مختلف حصوں سے کراہنے اور سسکیاں بھرنے کی بھنچی ہوئی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ میں اپنے بستر سے اس خیال سے نکلا کہ جا کر دیکھوں تو سہی کہ انہیں کیا ہو گیا ہے۔ جب میں اپنے کمرہ سے گذرتا ہوا ملحقہ کمرہ میں پہنچا تو منیرہ تخت پر اکیلی بیٹھی اپنے چہرہ کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے رو رہی تھی۔ مجھے ابا جان کے کمرہ کی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ میری طرف لپکی اور میرے بازو سے چمٹ گئی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ میرے ساتھ چل رہی تھی۔ ہم دونوں ان کے کمرہ کے دروازے تک پہنچ کر رک سے گئے۔ میں نے دہلیز پر کھڑے اندر جھانکا۔ ان کے کمرہ میں کوئی بھی نہ تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور وہ چارپائی پر سیدھے لیٹے تھے۔ انہیں گردن تک سفید چادر نے ڈھانپ رکھا تھا جو کبھی کبھار ہوا کے جھونکوں سے ہل جاتی۔ ابا جان کی آنکھیں بند تھیں، چہرہ قبلہ کی طرف تھا، مونچھوں کے بال سفید ہو چکے تھے اور سر کے بالوں کے کناروں پر میرے کہنے سے آخری بار لگائے ہوئے خضاب کی ہلکی سی

سیاہی موجود تھی۔

منیرہ کی ٹانگیں دہشت سے کانپ رہی تھیں۔ اس نے میرے بازو کو بڑے زور سے پکڑ رکھا تھا اور مجھے اس کی سسکیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ مگر میں کوشش کے باوجود بھی نہ رو سکتا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ اگر میں رو دیا تو وہ ابھی اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اپنی انگلی کے اشارے سے ہمیں قریب آنے کو کہیں گے اور جب ہم ان کے قریب پہنچ جائیں گے تو وہ اپنے ایک پہلو میں مجھے اور دوسرے میں منیرہ کو بٹھا لیں گے، پھر اپنے دونوں ہاتھ پیار سے ہمارے کندھوں پر رکھ کر قدرے کرختگی سے مجھ سے کہیں گے: "تمھیں یوں نہ رونا چاہیے۔ یاد رکھو تم مرد ہو اور مرد کبھی نہیں رویا کرتے۔"

میرزا ادیب

علامہ اقبال سے تین ادھوری ملاقاتیں

حکومتِ پاکستان اور پاکستانی دانشوروں کا متفقہ طور پر سالِ اقبال منانا واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اقبال کی اہمیت اور مقبولیت قومی سطح پر روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور اس کا شعری قد ستاروں سے آگے جہانِ دیگر کی فضاؤں کو بھی اپنی بلندی کے مقابلے میں پستی کا احساس دلا رہا ہے۔ اقبال اس مقام پر کھڑا ہے جہاں ماضی، حال، اور مستقبل کی حدیں اپنی اپنی وسعتیں کھو دیتی ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ادب سے اپنا سرِ عقیدت جھکا دیتی ہیں۔

ایک سال ہی نہیں یہ پوری صدی اقبال کی ہے۔ اقبال اس صدی کی گردشِ شام و سحر پر چھایا ہوا ہے۔ وقت کے قافلے اس کی شاعری کی گرم رفتاری کے مقابلے میں گردِ راہ ہو رہے ہیں۔ ماضی کا اقبال حال کا اقبال بھی ہے اور مستقبل کا اقبال بھی!

اقبال نے مرزا غالب کے متعلق جو کہا ہے۔

فکرِ انساں پہ تری ہستی سے یہ ظاہر ہوا　　　ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا

آج اس کے بارے میں بھی بجا طور پہ کہا جا سکتا ہے۔

اُردو ادب نے اپنی صدیوں کی زندگی میں صرف دو ایسے شاعر پیدا کئے ہیں جن کی عظمت کے سائے مشرقی ممالک سے نکل کر مغرب کے علمی و ادبی افق پر بھی چھا چکے ہیں

ان میں ایک تو دِلّی کے ایک گوشے میں طوطیٔ ہند امیر خسرد کی آخری آرام گاہ کے قریب آسودۂ خواب ہے اور جس کا نام مرزا اسد اللہ خاں غالب ہے اور دُوسرا سرزمین لاہور میں اورنگ زیب عالمگیر کی مسجد کے نیچے اپنی چار دیواری میں گوشہ گیر، آنے والے دور کی دُھندلی سی نہیں ایک تابناک اور روشن تصویر دیکھ رہا ہے اور یہ وہی شاعر ہے جسے مَیں نے اس صدی کا شاعر کہا ہے۔

اس وقت میرا مقصد اقبال کی عظمت سرائی نہیں ہے۔ یہ فرض مُدّت سے ادا ہو رہا ہے اور مستقلاً ادا ہوتا رہے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں مَیں نے اقبال کو جس جس انداز اور جس جس صُورت میں دیکھا ہے اس کے الگ الگ مناظر مختصراً الفاظ کے ذریعے پیش کر دوں۔ یہ مناظر ملاقاتی کیفیّت سے ایک حد تک نہیں بہت حد تک محروم ہیں۔ صرف ایک منظر مُلاقات کے خدوخال اختیار کر سکتا ہے مگر یہ خدوخال بھی بہت مدھم ہیں۔ دُوسری بات یہ بھی ہے کہ یہ تینوں مناظر ایک دُوسرے میں اس طرح مدغم ہو گئے ہیں کہ میں ان کے باب میں زمانی تقدم و تاخر کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ یعنی میں یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ سب سے پہلا منظر کونسا ہے اور سب سے آخری منظر کس کو سمجھنا چاہیئے۔

میں نے دُنیا میں اپنا پہلا سانس اس پُرانے مکان میں لیا تھا جو بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں کے قریب محلہ سنتھاں میں آج بھی موجود ہے۔ اقبال، سر عبد القادر اور سر شہاب الدین اسی بھاٹی دروازے کے اندر مختلف حصّوں میں اپنی زندگی کا کچھ نہ کچھ حصّہ بسر کر چکے ہیں تو اس زمانے میں جب لڑکپن کے دور سے میں گذر رہا تھا۔ بھاٹی دروازے میں اُونچی مسجد کے سامنے ایک جلسہ منعقد ہوا تھا۔

اقبال پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے لئے بطور ممبر کے اُمیدوار تھے۔ ان کا مقابلہ ایک بزرگ حاجی محمد دین سے تھا اور جس جلسے کا میں نے ذکر کیا ہے وہ اقبال کا انتخابی جلسہ تھا۔ میں شوق فراواں کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچا تھا اور میری مضطرب نگاہیں اقبال کو تلاش کر رہی تھیں، اقبال

ابھی تک تشریف نہیں لائے تھے۔ حاضرین میں کچھ بے چینی کے آثار نظر آرہے تھے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک مضبوط جسم کے آدمی جن کے چہرے پر چیچک کے داغ دکھائی دے رہے ہیں اسٹیج پر آگئے ہیں۔ میرا دل دھڑکا۔ مگر یہ اقبال تو نہیں تھے۔ میں نے جس اقبال کی تصویر دیکھی ہوئی تھی وہ ان سے بہت مختلف تھا۔

ایک صاحب سے میں نے پوچھا "یہ کون ہیں؟"

جواب ملا "خواجہ فیروز دین"

اس دن پاکستان پریس ٹرسٹ کے موجودہ چیئرمین خواجہ محمد آصف اور نامور میوزک ڈائریکٹر خورشید انور کے والد گرامی خواجہ فیروز دین کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ خواجہ صاحب نے زور سے میز پر ہاتھ مارا اور کہنے لگے "حضرات! میرے ایک دوست ہیں ان کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ سنیئے!

مجمع خاموش ہو گیا۔ خواجہ صاحب نے یہ واقعہ اپنے لفظوں میں سنایا اور میں اپنے لفظوں میں سنا رہا ہوں۔

"میرے یہ دوست ہر رات اور ہر دعوت میں شریک ہو جاتے ہیں۔ انہیں دعوت دی جائے یا نہ دی جائے۔ اس کی انہیں پروا نہیں ہوتی تھی، ہم ان سے تنگ آگئے سوچا انہیں ایک ایسا سبق دیا جائے کہ زندگی بھر نہ بھولیں۔ اور ہم نے ایک تدبیر سوچ لی۔

ایک دوست نے چند احباب کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ یہ صاحب بھی حسب معمول بن بلائے وہاں پہنچ گئے۔ کھانا سب کے آگے رکھ دیا گیا۔ مگر ان کی طرف کسی نے دیکھا تک نہیں۔ ان کے آگے کچھ بھی نہیں تھا۔ خالی پلیٹ تک نہیں تھی۔

یکایک پلیٹوں اور چمچوں کے شور میں اُن کی آواز بلند ہوئی۔

"سانپ، سانپ، سانپ"

ہم سب کے سب ڈر گئے۔ فوراً ان کی طرف بھاگے دیکھا کہ وہاں کوئی سانپ وانپ نہیں تھا۔

ایک صاحب نے کہا "بے کار چیخ رہے ہو۔ تمہارے آگے تو کچھ بھی نہیں" اس پر وہ بولے "اسی لئے تو میں چیخ رہا ہوں کہ میرے آگے کچھ بھی نہیں ہے"۔

یہ لطیفہ سُن کر لوگ ہنس پڑے۔ خواجہ صاحب نے کہا "میں نے یہ واقعہ آپ کو متوجہ کرنے کے لئے بیان کیا ہے۔ حضرات! انتظار کیجئے۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لا رہے ہیں"۔

اور تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر اقبال آ گئے۔ ان کے گلے میں اتنے ہار پڑے تھے کہ آدھا چہرہ چھُپ گیا تھا۔

ان کے آتے ہی حاضرین نے "ڈاکٹر اقبال زندہ باد" کا نعرہ لگایا اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے بازو اس طرح ان کے آگے پھیلا دیئے جیسے انہیں خاموش رہنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔

میں نے انہیں دیکھا۔ کئی لمحے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا اور ابھی انہیں دیکھنے میں محو تھا کہ لوگوں کا ایک ریلا آیا اور اس ریلے میں میں بے دست و پا ہو کر ایک دکان کے دروازے سے جا ٹکرایا عافیت اسی میں سمجھی کہ گھر چلا جاؤں اور میں اپنے گھر روانہ ہو گیا۔

یہ ڈاکٹر اقبال سے چند لمحوں کی ملاقاتِ خاموش تھی اور اس رات میں بستر پہ لیٹا تو ڈاکٹر صاحب کا چہرہ دیر تک میری آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا اور میں انہیں متواتر دیکھتا رہا۔

اقبال سے دوسری خاموش ملاقات موچی دروازے کے باغ میں ہوئی۔ موچی دروازہ کا باغ —— یہ لفظ سنتے ہی ذہن میں کئی یادیں جاگ اٹھتی ہیں۔

ایک صاحب نے کہا ہے۔ موچی دروازہ لاہور کا "سیاسی دل" ہے۔ میں سمجھتا ہوں انہوں نے موچی دروازے کے تاریخی باغ کو لاہور کا سیاسی دل کہہ کر اس باغ کے ساتھ کچھ قدر ناانصافی کا سلوک کیا ہے۔ میری دانست میں یہ باغ لاہور کا نہیں۔ پنجاب کا بھی نہیں، برِصغیر کا سیاسی دِل رہا ہے۔ اس باغ کی فضا میں جو آواز بھی گونجی ہے اس کی صدائے بازگشت سینکڑوں میل دُور تک سُنی گئی ہے۔ اس تاریخی باغ میں تاریخی فیصلے ہوتے ہیں اور ان تاریخی فیصلوں نے ہماری تاریخ کے دھارے کا رُخ پھیر دیا ہے۔

توموچی دروازے کے باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ تھا۔ اس جلسے میں میں نے مجلسِ احرار کے "مفکر" راہنما چودھری افضل حق کو دیکھا تھا۔ مولانا مظہر علی اظہر کو دیکھا تھا۔ غازی عبدالرحمٰن کو دیکھا تھا۔ سر میاں محمد شفیع کو دیکھا تھا اور ڈاکٹر اقبال کو بھی دیکھا تھا۔ حُسنِ اتفاق یہ ہے کہ جب میں جلسہ گاہ میں پہنچا اس سے تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب اسٹیج پر آ گئے۔

اُنہوں نے آتے ہی غالب کا یہ فارسی شعر پڑھا

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز

گُسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است

میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی آواز اتنی گمبھیر ہو گی۔ اتنی بلند اور باوقار ہو گی۔ یہ آواز باغ میں ایک سرے سے لے کر دُوسرے سرے تک جا پہنچی۔

لوگوں نے شور مچایا "اپنے شعر، اپنے شعر"۔

ڈاکٹر صاحب نے بازو اُٹھا کر فرمایا "میرے شعر پھر کبھی سہی۔ یہ دیکھو غالب نے مسلم قوم کی حالت کا کیسا صحیح نقشہ کھینچ دیا ہے"

اس کے بعد چند منٹ کی تقریر کی۔ انہوں نے اور کیا کچھ کہا۔ میں بھول گیا ہوں گا۔ میری یادوں میں ان کا تابناک چہرہ جھلک رہا ہے۔ گرجدار آواز گُونج رہی ہے۔ اور ان کے مُنہ سے نکلے ہوئے چند الفاظ ہیں۔

غالب کا یہ فارسی شعر اولیں مرتبہ میں نے انہی کی زبانی سُنا تھا اور اس وقت سے لے کر اب تک میرے حافظے میں محفوظ ہے۔

تیسرا منظر ایک چھوٹی سی ملاقات کا ہے۔

اُردو کی ممتاز ناول نگار زبیدہ سلطانہ کے شوہر اور فرزانہ نصیر کے والد گرامی خان نصیر حسین خان یُوسفی جو بعد میں نصیر وارثی کہلاتے میرے بہت عزیز دوست تھے۔ جب ہم اکٹھے ہوتے تھے تو ہمیں عجیب عجیب باتیں سوجھتی تھیں۔ مثلاً پنجاب پبلک لائبریری کی کسی تصویروں والی کتاب

میں سے کس طرح تصویریں اُڑائی جائیں۔ یا زبیدہ سُلطانہ کے والدِ محترم اور شبابِ اُردو کے مالک و مدیر خاں احمد حسین خاں سے کس انداز میں ملا جاتے۔ یا "اتفاق" کے ایڈیٹر حکیم مظفر حسین ظہرؔ کے دفتر میں جاکر کس کس طریقے سے انہیں پریشان کیا جاتے۔

اس زمانے میں حکیم صاحب موصُوف نے ابھی "شاعری سکھانے کا کالج" باقاعدہ طور پر نہیں کھولا تھا۔ وہ شاعری ضرور سکھاتے تھے لیکن کالج میں نہیں۔ اپنے اخبار "اتفاق" کے دفتر میں بیٹھ کر۔ اس وقت کلیم اظہرؔ دہلوی بھاٹی دروازے کے اندر اُونچی مسجد کی ایک دیوار کے ساتھ اُوپر کمرے میں رہتے تھے اور وہیں سے اپنا پرچہ "اتفاق" نکالتے تھے۔

جب انہوں نے چوک انار کلی میں مکتبہ جدید کے اُوپر ایک کمرہ کرائے پر لیا تو یوں سمجھئے ان کا شاعری سکھانے کا کالج باقاعدہ طور پر کھل گیا۔ اس کالج میں پرنسپل سے لے کر چپڑاسی تک سب کچھ وہی تھے۔ ڈاکٹر اقبالؔ کے ادبی مخالف تھے۔ کہتے تھے اقبالؔ کی شاعری سے "پنجابیت" کی بُو آتی ہے۔ اس دور میں ایک صاحب گوشہ نشین وزیر آبادی نے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں اقبالؔ کی شاعری کی تنقیص کی گئی تھی۔ الفاظ اور محاوروں کے حوالے سے ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ حکیم صاحب نے اس کتاب کے کئی حِصّے اپنے پرچے اتفاق میں نقل کئے تھے اور اسی وجہ سے ہمیں ان سے بَیر تھا۔

ہمیں یعنی مجھے اور نصیر حسین خاں کو ایک دن سُوجھی کہ حکیم صاحب کو ایک گرماگرم خط لکھا جائے جس میں ان سے کہا جائے کہ "حکیم صاحب! اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ ورنہ ہم تمہیں ٹھیک کردیں گے"۔

خط لکھا گیا۔ نہ جانے اس میں کیا اوٹ پٹانگ درج تھا۔ خط مکمل ہو گیا تو نصیر نے کہا اسے خُود جاکر حکیم صاحب کو دینا چاہیئے۔ میں نے مخالفت کی۔ میں کچھ زیادہ ہی وضع دار آدمی ہوں۔ اس لئے خُود جانا مناسب نہ سمجھا۔ ویسے تو حکیم صاحب منحنی سے آدمی تھے تاہم ان کا سامنا کرتے ہوئے ڈر سا لگتا تھا۔ مگر نصیر نے مجھے قائل کر لیا اور ایک دوپہر کو ہم "اتفاق" کے

دفتر میں جا پہنچے۔

حکیم صاحب قیلولہ فرمانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ہم جو جا دھمکے تو اُنہوں نے غور سے ہماری طرف دیکھا۔

"جناب! ایک خط دینے آئے ہیں" میں نے کہا اور خط ان کے آگے رکھ دیا۔ اُنہوں نے لفافہ کھولا۔ تحریر پر سرسری نظر ڈالی اور کہا۔ "جواب مل جائے گا۔"

ہم سیڑھیوں سے نیچے اُتر آئے اور اس دن کے بعد ان کے خط کا انتظار کرنے لگے۔

ایک روز میرے اور نصیر کے ایک مشترکہ دوست نے کہا۔

"حکیم مظفر حسین اظہر کے ہاں تم گئے تھے نا!"

"ہاں گئے تھے" میں نے جواباً کہا۔

"دیکھو تمہارے متعلق کیا لکھا ہے"۔ اس نے اطلاع دی۔

میں نے اور نصیر نے جلدی سے پرچہ خریدا۔ کئی صفحوں کے بعد ایک چھوٹی سی تحریر نظر آئی تحریر کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے۔

"پچھلے ہفتے اقبال کے دو نوجوان عقیدتمند اور ہمارے عزیزانِ بدتمیز دفتر میں آئے اور انہوں نے اقبال کی حمایت میں ایک خط دیا جو ہم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھیج رہے ہیں عطائے تو بہ لقائے تو"۔

میں نے نصیر کو دیکھا، اور نصیر نے مجھے۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور میں اندر ہی اندر سُلگ رہا تھا۔

"کیوں نہ ڈاکٹر اقبال سے ملیں"؟ نصیر نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔ قصّہ مختصر یہ کہ دو چار دن بعد ہم ڈاکٹر صاحب کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ یقیناً وہی ڈاکٹر صاحب کا پُرانا خادم علی بخش تھا۔ جس نے ہم سے پوچھا تھا" آپ انجنیئر کالج سے آئے ہیں"؟ اس زمانے میں انجنیئرنگ کالج (حال یونیورسٹی) کے طلبا کسی وجہ سے دو تین بار ڈاکٹر صاحب کے ہاں آ چکے

تھے اسی لئے علی بخش نے ہمیں بھی اسی کالج کے طالب علم سمجھا تھا۔ ہمارے انکار پر وہ اندر گیا اور دو تین منٹ بعد واپس آکر ہمیں اندر لے گیا۔

ڈاکٹر صاحب شلوار اور بنیان پہنے۔ پلنگ کے اوپر تہ کئے ہوئے بستر سے پُشت لگائے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وہ شعروں کی کتاب تھی اور میرا اندازہ ہے کہ عُرفی کا دیوانِ غزل تھا۔ میرے پاس اپنی بات صحیح ثابت کرنے کے لئے کوئی قابلِ اعتماد ذریعہ نہیں تاہم نہ جانے مجھے ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ اقبال ان لمحوں میں عُرفی کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اُنکی آنکھوں پر عینک تھی۔ ہم نے سلام علیکم کہا۔ اُنہوں نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دے کر مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ ہماری طرف بڑھا دیا۔

مجھے احساس ہوا کہ کافی بھاری ہاتھ ہے۔ مصافحے کے بعد ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب اپنے سینے پر رکھ لی۔ مَیں نے نصیر سے اشارتاً کہا۔ کچھ کہو، اس نے مجھے اشارہ کیا تم کچھ کہو۔ مجھے کچھ سُوجھ ہی نہیں رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "کہیئے"۔

میرے ذہن میں ایک بات آگئی۔ "جی وہ حکیم صاحب نے ہمارا خط آپکو بھیج دیا ہے"؟

ان الفاظ پر ڈاکٹر صاحب نے پُوچھا۔ "کونسا خط؟ اور یہ حکیم صاحب کون ہیں؟"

"جی وہ حکیم مظفر حسین اظہر۔ ہم نے انہیں خط لکھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بیہودہ گوئی مت کیجیئے" یہ الفاظ نصیر کے تھے۔ پھر ہم نے انہیں سارا واقعہ سُنایا۔ غور سے سُنتے رہے۔ جب سب کچھ سُن چکے تو بولے "مجھے کوئی خط نہیں ملا۔ اور ان باتوں کا خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ بعض لوگ اپنی اہمیت جتانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ انہیں کرنے دیں۔ اس سے ہمارا کیا بگڑتا ہے؟"

ہم نے جو معاملہ چھیڑا تھا اُنہوں نے چند لمحوں میں ختم کر دیا اور پھر ہم سے ہماری تعلیم کے بارے میں پوچھا۔ مستقبل کے ارادوں کے متعلق استفسار کیا۔ نام وغیرہ پوچھے۔ ہم نے ان کے

ہر سوال کا مختصر طور پر جواب دیا۔ وہ ہماری ہر بات میں دلچسپی لے رہے تھے اور اس سے ہمارا حوصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اتنے میں علی بخش اندر آ گیا اور اس نے ڈاکٹر صاحب کے پاس آ کر آہستہ سے کوئی نام لیا اور ہم نے رخصت ہونا مناسب سمجھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مصافحہ کیا اور ہم ان کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

بہت مختصر ملاقات تھی اور ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کے روز میں دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ اس روز ڈاکٹر اقبال دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ مگر مجھے دکھ اور افسوس اس بات کا تھا کہ ساری عمر لاہور میں رہا۔ بھاٹی دروازے کے اندر رہا جہاں ڈاکٹر صاحب بھی کسی زمانے میں رہتے تھے۔ انار کلی میں سے گذرتا رہا۔ یہاں بھی ایک مکان میں ڈاکٹر صاحب نے قیام کیا تھا۔ میکلوڈ روڈ پر آتا جاتا رہا۔ وہاں ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی سڑک پر ہی سے نظر آ جاتی تھی۔ لیکن یہ میری بدنصیبی ہے کہ ان سے ایک بھی۔ ساری زندگی میں ایک بھی بھرپور ملاقات نہ کر سکا۔ ہمیشہ اس سعادت سے محروم ہی رہا۔

لیکن سوچتا ہوں کہ ممکن ہے یہ میری محض جذباتیت ہو۔ آخر کونسا دن ہے جب میں نے ڈاکٹر اقبال سے ملاقات نہیں کی۔ صبح کے اجالے میں۔ دوپہر کی دھوپ میں اور رات کی تنہائیوں میں۔ ڈاکٹر صاحب مجھ سے گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ وہ میرے دل کی گہرائیوں میں ہیں، وہ میرے سامنے ہیں۔ ان کا معنوی وجود میرے تکیے کے نیچے محفوظ ہے۔ تنہائی کے ہر لمحے میں مجھ سے باتیں کرنے کے لئے۔ زندگی اور کائنات کے راز بتانے کے لئے۔ رموزِ خودی اور اسرارِ بے خودی سمجھانے کے لئے۔

اقبال مجھ سے کبھی جدا نہیں ہوئے، میں اقبال سے کبھی الگ نہیں ہوا۔

حیاتِ اقبال کا اشاریہ

۱۸۷۷ء	پیدائش۔
۱۸۸۷ء	پرائمری کا امتحان پاس کیا۔
۱۸۹۰ء	مڈل پاس کیا۔
۱۸۹۳ء	انٹرنس پاس کیا۔ شاعری کا آغاز کیا۔
۱۸۹۵ء	ایف اے پاس کیا۔
۱۸۹۷ء	گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔
۱۸۹۹ء	یونیورسٹی میں ایم اے فلسفہ میں اوّل رہے۔
	اورینٹل کالج لاہور میں ملازم ہوئے۔
	گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔
	گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے رہے۔
۱۹۰۱ء	
	یورپ کو روانگی۔
۱۹۰۵ء	بی اے کیمبرج سے کیا۔
تا	پی ایچ ڈی (میونخ) اور بار ایٹ لاء۔
۱۹۰۸ء	وطن واپس آئے۔
	وکالت شروع کی۔

۱۹۰۹ء	انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے ۔
۱۹۲۲ء	سر کا خطاب سرکارِ برطانیہ سے ملا ۔
۱۹۲۴ء	انجمن حمایت الاسلام کے صدر مقرر ہوئے ۔
۱۹۲۶ء	صوبائی مجلسِ قانون ساز کے ممبر چنے گئے ۔
۱۹۳۰ء	مسلم لیگ کے اجلاس میں تاریخی خطبہ دیا اور پاکستان کا تصور پیش کیا ۔
۱۹۳۱ء	دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی ۔
۱۹۳۵ء	مسلم لیگ پنجاب کے صدر بنے ۔
۱۹۳۸ء	انتقال فرمایا ۔

سالِ اقبال : ۱۹۷۷ء

مکتبۂ عالیہ کی خصوصی مطبوعات

اقبال اور ان کا فلسفہ ———— آلِ احمد سرور

پاکستانی قومیت اور اقبال ———— ڈاکٹر وحید قریشی

اقبالؒ اور پاکستانی ادب ———— عزیز احمد

اقبال کا انسانِ کامل ———— ڈاکٹر غلام عمر

اقبال اور نئی قومی ثقافت ———— ڈاکٹر تبسم کاشمیری

اقبالؒ، تصورِ قومیت اور پاکستان ————

اقبال، مجدّدِ عصر ———— ڈاکٹر سہیل بخاری

اقبال کا نفسیاتی مطالعہ ———— سلیم اختر

نیرنگِ اقبال ———— انور سدید

اقبال کا ادبی مقام ———— ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

دائرہ معارفِ اقبال ———— ملک حسن اختر

ارمغانِ حجاز (منظوم اردو ترجمہ) ———— گل بادشاہ

حیاتِ اقبال ———— طاہر تونسوی

اقبال اور سید سلیمان ندوی ————

اقبال منفرد ———— سید معراج نیّر

نذرِ اقبال ———— ناصر زیدی

نظریاتِ اقبال ———— کلیم نشتر

افکارِ اقبال ———— محمود عاصم

اقبال کا بچپن ———— فرزانہ یاسمین

اقبال شناسی ———— ممتاز رضا سیال

سالِ اقبالؒ : دو اہم کتابیں

نظریاتِ اقبالؒ

علامہ اقبالؒ کے فکری اجتہاد کا موضوع وار انتخاب —
تمام اہم موضوعات پر ان کے اپنے الفاظ میں ان کی رائے، یہ
اِنتخاب علامہ کے تمام سرمایہ نثر و شعر کو سامنے رکھ کر بڑی دِقتِ نظر
سے کیا گیا ہے۔ جو اقبال شناسوں اور اقبالیات کے طالب علموں
کے لئے یکساں مُفید ہے۔

مرتب : کلیم نشتر

افکارِ اقبالؒ

علامہ اقبالؒ کے نثری سرمایہ سے ان مقالات تقاریر اور مضامین
کا انتخاب، جو مستقل قومی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس مجموعے سے اقبالؒ
کے سیاسی فکر و ذہن کے خدوخال اُجاگر ہوتے ہیں اور وہ کاوش
اُبھر کر سامنے آتی ہے جو اقبالؒ نے فکر و عمل کے محاذ پر قوم کی رہنمائی
کے لئے انجام دی۔

مرتب : محمود عاصم

مکتبۂ عالیہ • ایبک روڈ (انارکلی)، لاہور

سال اقبالؒ : ۱۹۷۷ء

اقبالیات پر نئی اور معیاری کتابیں

اقبال اور ان کا فلسفہ	آل احمد سرور
پاکستانی قومیت اور اقبال	ڈاکٹر وحید قریشی
اقبال کا انسانِ کامل	ڈاکٹر غلام عمر
اقبال اور قومی ثقافت	ڈاکٹر تبسّم کاشمیری
اقبال اور کلاسیکی تصوّرات	عزیز احمد
اقبال، تصوّر قومیت اور پاکستان	ڈاکٹر تبسّم کاشمیری
اقبال مجدّد عصر	ڈاکٹر سہیل بخاری
اقبال کا نفسیاتی مطالعہ	سلیم اختر
اقبال نما	انور سدید
ارمغان حجاز (منظوم اُردو ترجمہ)	گُل بادشاہ
حیاتِ اقبال	طاہر تونسوی
اقبال منفرد	معراج نیر
نذر اقبال	ناصر زیدی
نظریاتِ اقبال	کلیم نشتر
افکارِ اقبال	محمود عاصم
اقبال کا بچپن	فرزانہ یاسمین
اقبال شناسی	ممتاز رضا سیّال

مکتبہ عالیہ — ایبک روڈ (انار کلی) — لاہور